قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اگست 2017 قیمت 15 ₹

ماہنامہ اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

یوم آزادی مبارک

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

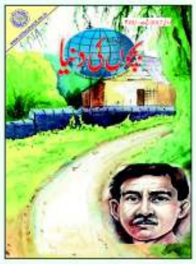
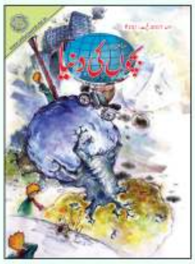

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ◆ اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

اداریہ
ہماری بات — 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 5

انٹرویو
آج کے مشاعرے تنزلی کا شکار ہیں: — اشتیاق سعید — 7

نقد و نگاہ
مولانا ابوالکلام آزاد اور عالم عرب — محمد اسلم اصلاحی — 10
محمد قلی قطب شاہ کے عہد کے قلمی آثار — محمد ذاکر حسین — 13
منشی ہرگوپال تفتہ — احمد حسن — 18
اردو ادب کے ارتقا میں ہندوستانی اکادمی الہ آباد کی خدمات — طاہرہ پروین — 21
شفاف اسلوب کا شاعر: شہریار — ساجد حسین انصاری — 24

جشن آزادی
چکبست کے کلام میں جذبہ حب الوطنی — خواجہ عبدالمنتقم — 26

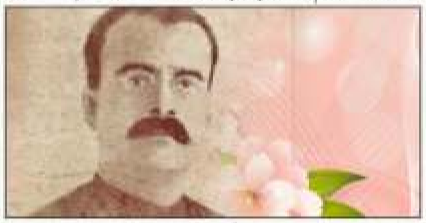

'جھنڈا گیت' کے خالق شیام لال گپت — کرشن بھاوک — 32
سرور کی قومی وطنی شاعری — عبدالرحمٰن — 34
1857 اور بہادر شاہ ظفر — سعدیہ پروین — 37

سلسلۂ صحافت
اردو زبان وادب کی ترویج میں سائبر سماج کا حصہ — خان محمد آصف — 39
قلم کا سپاہی شاہد رام نگری — ایم رحمت اللہ — 43

ہم نے جنھیں بھلا دیا
جدوراج بلی عیش سلطان پوری کے شعری محاسن — صالحہ رشید — 45

فلسفہ و نفسیات
فلسفۂ خیروشر — شرجیل احمد خان — 48

نیا آسمان نئے ستارے
تاریخ فرشتہ کا تنقیدی مطالعہ — روبینہ تبسم — 51
حفیظ جالندھری بحیثیت افسانہ نگار — محمود فیصل — 54

آزادی کے بعد اردو خودنوشت — شاہدہ نواز — 58

ثقافتی دریچے
بڑودہ کی ادبی سرگرمیاں — مقصود احمد — 61

رسالوں کے خاص نمبر
رسالہ 'شاہراہ' کا ناولٹ نمبر — نوشاد منظر — 68

سمت نما
'فکر و تحقیق' کا توضیحی اشاریہ — ارشاد قمر — 73

کمپیوٹر
پرسنل کمپیوٹر کیا ہے؟ — 75

کتابوں کی دنیا
تعارف وتبصرہ — ادارہ — 78

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ — 91

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 92

ماہنامہ اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:19، شمارہ:08، اگست 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000   شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in, ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1 پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

ہماری بات

یوم آزادی مبارک!

اردو اور آزادی کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ جب ہندوستان پر انگریزی استعماریت کا تسلط تھا تو ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ساتھ اردو نے بھی آزادی، اتحاد اور اخوت کا پرچم بلند کیا اور اس زبان کے اخبارات نے انگریزوں کے جبر وستم کے خلاف مضامین اور اداریے تحریر کیے جس کی پاداش میں اخبارات کے مدیران کو جیل کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں اور ان کے اخبارات ضبط بھی کیے گئے۔ ہندوستان کی تاریخ، آزادی کی تحریک میں اردو کے کردار کو کبھی نظرانداز نہیں کرسکتی کہ اس زبان کی صحافت اور شاعری نے عوامی جذبات کو مہمیز کیا اور ان کے قومی اور وطنی شعور کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ شاعروں نے جہاں آزادی کا نغمہ بلند کیا وہیں دانشوروں اور صحافیوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے آزادی کی جوت جگائی۔ اردو میں قومی اور وطنی شاعری کا پورا سرمایہ موجود ہے جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کے شاعروں نے حب الوطنی کے جذبے سے معمور ہوکر نہ صرف شاعری کی بلکہ عوامی شعور میں اس احساس کو نقش کیا کہ ملک کی آزادی کے بغیر ہم ترقی کی راہیں طے نہیں کرسکتے۔ انگریزوں نے جس طرح اقتصادی، سماجی اور معاشی طور پر ہندوستانی عوام کو مفلوج بنا دیا تھا ایسے میں شاعروں کے نغمہ آزادی نے ان کے اندر جوش و جذبہ پیدا کیا۔ اسی شاعری اور صحافت کا اثر تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان کو آزاد کرنے ہی میں عافیت سمجھی اور اس طرح ہمارا ملک نہ صرف آزاد ہوا بلکہ آزادی کے بعد اس ملک نے ترقی کی نئی تاریخ بھی رقم کی۔ تعلیم، ٹیکنالوجی، سائنس اور دیگر میدانوں میں ہمارا ملک ایک مضبوط طاقت کی حیثیت سے آج عالمی نقشے پر اپنی شناخت رکھتا ہے۔ یہ فیض ہے ان شہیدانِ وطن اور مجاہدینِ آزادی کا جنھیں اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی، جنھوں نے ملک کو آزاد کرانے کے لیے ساری تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کیں۔ اسی وجہ سے آج ہم ان شہیدانِ وطن اور مجاہدین آزادی کو یاد کرتے ہیں۔

آزادی کے زیادہ تر نغمے، گیت اور نظمیں چونکہ اردو زبان میں ہی ہیں اس لیے اردو کے زیادہ تر رسالوں میں جنگ آزادی میں اردو کے کردار کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی ہے۔ اردو دنیا کے اس شمارے میں بھی آزادی کے حوالے سے کچھ تحریریں شامل کی جارہی ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ اردو زبان نے آزادی اور جذبہ حب الوطنی کو زندہ رکھنے میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے اور یقینی طور پر اردو کا یہ ایسا انقلابی کردار ہے جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی آزادی سے متعلق نظم ونثر کا سرمایہ یقیناً ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے اس قیمتی سرمایے کو ایک دستاویز کی شکل میں محفوظ کیا جائے اور اردو کی وطنی اور قومی شاعری کا ہندوستان کی تمام زبانوں میں ترجمہ بھی کیا جائے تاکہ آج کی نسل کو پتہ چلے کہ آزادی کی تحریک میں تمام زبانوں اور تمام طبقات نے مل کر حصہ لیا تھا اور اس طرح اتحاد واخوت کا ایک مثالی نمونہ پیش کیا تھا اور اس میں اردو زبان کا کردار یقینی طور پر بہت اہم رہا ہے۔ اردو زبان آج بھی اسی اتحاد واخوت اور یکجہتی کے پیغام کو عام کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ یہ انتہائی میٹھی اور شیریں زبان ہے جس کا ایک ہی پیغام ہے محبت، اتحاد، اخوت۔ اس زبان کے خمیر میں سیکولرازم ہے۔ یہ کسی خاص طبقے کے جذبات واحساسات کی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ اس زبان کا رشتہ عوامی جذبات اور احساسات سے ہے اور اس کی تشکیل بھی عوامی میل جول سے ہی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زبان آج بھی نہ صرف اپنا دائرہ بڑھاتی جارہی ہے بلکہ اس زبان سے محبت کرنے والے اب ہر طبقے میں موجود ہیں۔ اس زبان کی عوامی بنیادیں بہت مضبوط ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اب دوسری زبانوں میں بھی اردو کے الفاظ، اصطلاحات اور تراکیب کا استعمال عام ہوگیا ہے۔ خاص طور پر آج کے الیکٹرانک میڈیا کی زبان میں اردو کے اچھے خاصے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کسی خاص قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ ایک ترسیلی قوت سے عبارت ہے جس کے جادوئی اثر کو لوگ محسوس کرتے ہیں اور اس زبان کی یہی قوت وتوانائی ہے کہ لاشعوری طور پر اس زبان نے عوامی ذہنوں میں اپنی جگہ بنائی ہے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

زیرِ نظر شمارے کے اداریے میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے ہماری بات کا آغاز کرتے ہوئے زبان اردو کی شناخت سیاست میں الجھا دینے والی بات کہی ہے جو برحق ہے اور یہ بھی موصوف نے سچ کہا ہے کہ اسے ایک تہذیبی تشخص کے شکنجے میں کس کے دیکھا جا رہا ہے جبکہ اس کی لسانی ساخت ہندوستانی زبانوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہمہ فن ہے۔ اس کی جڑیں مدارس، مکاتب، مشاعروں اور مظاہروں سے مبرا عوام کی علاقائی بول چال میں ہر طرح سے جڑی ہوئی ہیں۔ کشمیر سے ملیبار تک جہاں کہیں بھی مسلم علاقے ہیں اپنی اپنی علاقائی آب و ہوا کے ساتھ معاشرے میں گھل مل کر مختلف صورتوں میں زندہ ہیں اور ایک دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ علاقائی بولیوں کے ساتھ ساتھ ہے اور یہ حیرت انگیز طور پر (Social Media) سے بھی جڑ چکی ہے بھلے ہی قرطاس و قلم کا عہد مفقود و معدوم ہو جائے اس کے باوجود جکڑے ہوئے پارے اور مسدود پہاڑیوں سے اپنی راہ بناتی ندیوں کی طرح اردو ہندی کے ساتھ ساتھ جیسے جا رہی ہے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہم بہانگ دہل کہہ سکتے ہیں کہ اردو کا مستقبل وہی ہے جو ہندی اور ہندوستان کا مستقبل ہے اور اردو کی گردش لیل و نہار میں قومی اردو کونسل جو تاریخ ساز خدمات انجام دے رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

تازہ شمارہ اس بار آنکھوں کی بصیرت افروز ٹھنڈک اور دل کا سرور ثابت ہوا وہ اس لیے کہ آپ نے اس شمارے میں دنیائے اردو ادب کے رخشندہ ستاروں کو جو ان کی وفات کے بعد اپنی تابانی کو قائم و دائم رکھے ہوئے ہیں جیسے سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر کے ساتھ ساتھ مضمون نگاروں میں محمد اقبال لون، رؤف خیر، قیام نیر، فیروز عالم، تصنیف عزیز، ناصرہ سلطانہ اور غلام نبی خیال کی نگارشات جو اردو دنیا کے جواہر پارے ثابت ہوئے ہیں اور ایسے جواہر پاروں کے آپ جوہری ٹھہرے تو معاذ اللہ اردو دنیا کیوں نہ پھولے پھلے گی اور اس کی جڑیں ملکی سطح سے عالمی سطح تک کیوں نہ ثمر آور اور شاداب رہیں گی۔

علیم صبا نویدی: رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی، تمل ناڈو

اردو دنیا جون 2017 کا شمارہ موصول ہوا۔ 'ہماری بات' میں آپ نے درست فرمایا کہ اردو کے فروغ کے لیے ذہنوں میں تحریک پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ نور شاہ صاحب کا انٹرویو اچھا لگا۔ آج لوگوں کو پڑھنے کے لیے وقت مشکل سے نکلتا ہے۔ افسانہ پڑھنے میں قاری کی دلچسپی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ سعادت حسن منٹو، عابد سہیل اور شوکت تھانوی کی خاکہ نگاری پر لکھے گئے مضامین بہت پسند آئے۔ منٹو کے خاکے انسانوں کے خارجی اور باطنی مطالبے ہیں۔ شوکت تھانوی کے خاکوں میں روانی اور دلچسپی ہے، ان میں جذباتی انداز بھی ملتا ہے۔ عابد سہیل کا اسلوب دلکشی، روانی اور سادگی سے عبارت ہے۔

اردو ادب میں جدید ترین خاکے عصمت چغتائی نے لکھے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا' اردو کے افسانوی ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ محمد قمر سلیم کا مضمون 'بچوں کی نفسیات اور کھیلوں کے ذریعے تعلیم' بہت ہی اچھا لگا۔ کھیلوں کے ذریعے بچوں کی ذہنی، جسمانی اور جذباتی نشوونما کی جا سکتی ہے۔

ایم راگھو راؤ: ساؤتھ سول لائن، چھندواڑا، مدھیہ پردیش

جون ماہ کا شمارہ حسب سابق نہایت خوبصورت سرورق کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس میں جناب محمد اقبال لون نے نور شاہ کے ساتھ ایک معیاری مشافہ پیش کیا ہے۔ سرینگر کی جنتی زمین سے وابستہ متعدد فن پاروں، ڈراموں، ناولوں اور افسانوں کے خالق نور شاہ صاحب کے ساتھ مشافہ موصوف کے تشخص کو ہمارے رو برو لانے کے لیے کافی ہے۔ کشمیر کے دلربا مناظر و متعدد مشاہدات و تجربات سے آراستہ پیراستہ نور صاحب کے ادبی اصناف کے مطالعے سے کوئی بھی قاری رنگ اور نور کی برسات میں بھیگ بھیگ سکتا ہے۔ فقط صفحہ 8 اور 10 پر 'کی وجوہات' کی بجائے 'کے وجوہ' الفاظ درکار تھے۔ صفحہ 10 پر بھی اول کالم میں 'ذہین' لفظ کی اشاعت 'ذہن' یا پھر 'اذہان' ہونی چاہیے تھی۔ نور صاحب کا مختلف الجہات ادب نو مشق کے علاوہ کہنہ مشق ادبا و محققین کے لیے بھی اہم ثابت ہو سکتا ہے، اس میں دو رائے قطعی نہیں ہیں۔

کشمیر کے غلام نبی خیال صاحب نے سنسکرت زبان کے ادیب کشمیندر (یہی اصلی املا و لفظ درکار تھا) کے طنز و مزاح پر مبنی مقالہ پیش کیا ہے۔ کشمیندر کی مقبولیت ان کی کتاب 'اوچتیہ وچار چرچا' کے موجب زیادہ رہی ہے۔ جب کاویہ (شاعری) کی اصل آتما (روح) کیا ہے یا ہو سکتی ہے کا ناگزیر سوال سامنے آیا، تب النکار، ریتی، وکروکتی، دھونی اور رس نام کے پانچ سمپر دائے (عقیدے) قائم ہو گئے، لیکن کشمیندر نے سب سے الگ ایک نیا 'اوچتیہ' (معنی مناسب) سمپر دائے قائم کیا اور بتایا کہ مذکورہ بالا ہر ایک عقیدہ کاویہ (شاعری) کی روح مانا جا سکتا ہے۔ چونکہ ان کا خیال بادشاہ اکبر کے 'صلحِ کل' کی مانند ہر ایک مذہب (عقیدے) کی پذیرائی کرنا، اس لیے ناقدوں نے ان کے عقیدے کو یک سر ہی نامنظور کر دیا تھا۔ ویسے مقالہ نگار نے اپنا نظریہ پیش کرنے میں کوئی بھی کسر نہیں رکھی ہے۔

اگرچہ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم صاحب نے اردو ادب میں طنز و مزاح کے زاویے سے اس کی طویل تاریخ کے ساتھ بخوبی انصاف ہی کیا ہے، تاہم مستزاد مضمون میں مرزا غالب، داغ، ذوق جیسے لاتعداد شعرا کے ناموں کا حوالہ دینا سونے پر سہاگا ہو جاتا!۔

کرشن بھالوک: کوٹھی نمبر A-201، گلی نمبر A-18، گورو نانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

’اردو دنیا‘ کا تازہ شمارہ (جون 2017) ملا۔ دیکھ کر ازحد مسرت ہوئی۔ ’بچوں کی نفسیات‘ اور ’کھیلوں کے ذریعے تعلیم‘ معلوماتی ہیں۔ خاکہ نگاری، نقد و نگاہ اور طنز و مزاح پر مبنی تین تین مضامین شامل کر کے آپ نے قارئین کے لیے ایک بڑا کام کیا ہے۔ میرا مضمون ’فنی خاکہ نگاری اور سعادت حسن کا خاکہ ’منٹو‘ کی اشاعت کے لیے شکریہ! اس کی پسندیدگی کے سلسلے میں کئی جگہ سے فون آئے جس سے اندازہ ہوا کہ ’اردو دنیا‘ پوری اردو دنیا میں کس قدر مقبول ہے۔

❖ **قیام نیر**: پوسٹ بردہا، وایا کسول، ضلع مدھوبنی، بہار

’اردو دنیا‘ جون 2017 ہمدست ہوا۔ یہ اپنی پیش کش اور معیار کے لحاظ سے ہندوستان کی کسی بھی زبان کے کسی بھی ماہنامہ سے کسی طور کم قدر نہیں بلکہ بیش تر سے اعلیٰ وارفع ہے۔ اُردو والوں کی محنت شاقہ سے یہ زبان خاصی شاندار ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے مزاج میں مشاعرے، سیمنار، ادبی نشستیں اور تقاریب اس قدر رچ بس گئے ہیں کہ یہ سائنس اور ٹکنالوجی یعنی عصری تقاضوں کی جانب کم ہی مائل رہی ہے۔ اس کے لیے ہمیں چاہیے کہ ان سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ریاضی وسائنسی ورکشاپس، مناظرے و مذاکروں کے اہتمام کے ذریعے اس زبان کو ترقی کے اس بام تک پہنچائیں کہ سائنس و ٹکنالوجی کی ہر نئی کاوش اس زبان میں منعکس ہو یعنی ادبیات کے ساتھ ساتھ یہ آنے والے ہر دور میں درحقیقت نئی زبان کہلائے اس کی ہر صنف سخن اعلیٰ ترین ترقی کی غماز ہو جو قارئین کو کچھ کر دکھانے کی عملی تحریک دے۔ تاکہ یہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بشانہ قدم سے قدم ملا کر یکساں رفتار سے گامزن ہو۔ قومی اُردو کونسل کے جرائد سے تو انہی مقاصد کا اشارہ ملتا ہے۔ کیونکہ ’اُردو دنیا‘ میں اب سائنس اور ٹکنالوجی پر عمدہ مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔

عالمی اُردو کانفرنس کے تعلق سے مندوبین کے تاثرات اُردو زبان کا عالمی منظر نامہ پیش کرتے ہیں مضمون شوکت تھانوی کی خاکہ نگاری بہت پسند آیا، ہارڈویر اور سوفٹ ویر تکنیکی اعتبار سے بہت عمدہ شمولیت ہے۔ تبصرہ وتعارف کے ذیل میں قابل قدر مطبوعات پر تبصرے شامل ہیں۔ بقیہ مشمولات بھی قابل تعریف ہیں۔

❖ **مصطفی ندیم خاں غوری**: اورنگ آباد، مہاراشٹر

’اردو دنیا‘ جون 2017 کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر رؤف خیر کا مضمون ’آندھرا و تلنگانہ میں اردو صحافت‘ بہت محنت سے لکھا گیا مضمون ہے لیکن اس میں ماہنامہ ’شیراز‘ کا ذکر نہیں ہے جو شیراز بلڈنگ چادر گھاٹ حیدرآباد سے صمصام شیرازی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ رؤف خیر صاحب نے روزنامہ نظام گزٹ اور شیراز کو گڈمڈ کر دیا۔ نظام دکن کے فرمان اور تحلیقات نظام گزٹ میں نہیں بلکہ ماہنامہ شیراز میں شائع ہوتے تھے۔ فرمان نظام کے نذری باغ سے شائع ہوتے تھے۔ نظام گزٹ 1957 میں بند ہو گیا۔ جبکہ شیراز نظام دکن کے انتقال 1967 میں بند ہوا۔

رؤف خیر صاحب سے دوسرا سہو یہ ہوا کہ انھوں نے لکھا ماہنامہ ’پیکر‘ اعظم راہی کی ادارت میں مارچ 1958 میں جاری ہوا۔ ’پیکر‘ دراصل 1968 میں جاری ہوا۔ اس کا ٹائٹل نامور آرٹسٹ ایم۔ ایف۔ حسین نے بنایا تھا۔ اعظم راہی اسی ٹائٹل کو مستقل چھاپتے رہے۔

حیدرآباد کے روزناموں میں انھوں نے ’اعتماد‘ کا ذکر سرسری کیا۔ حالانکہ یہ ایک نہایت مشہور و مقبول اخبار ہے۔ رؤف خیر نے ’اعتماد‘ کے ادبی ایڈیشن ’اوراق ادب‘ اور اس کے مرتب ایڈیٹر ڈاکٹر محسن جلگانوی کا بھی ذکر نہیں کیا۔ حیدرآباد کا پانچویں نمبر کا اخبار ’صدائے حسینی‘ ہے۔ جس کے ایڈیٹر سید جعفر حسین ہیں۔ رؤف خیر صاحب نے یہ بھی نہیں لکھا اور بھی ماہنامے اور روزنامے تھے شاید طوالت کے باعث وہ نہ لکھ سکے۔

❖ **مسعود فاروقی**: H.No.22-7-553، چھتہ بازار، حیدرآباد، تلنگانہ

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ کا شمارہ موصول ہوا۔ اس کے ذریعے قومی کونسل کی جانب سے نیا رسالہ ’خواتین دنیا‘ کے شائع کیے جانے کا پتہ چلا۔ یہ قابل تحسین اقدام ہے۔ جناب شمس الاسلام فاروقی صاحب کا مضمون ’بنا دوا بلڈ پریشر قابو پایئے‘ مجھے کافی پسند آیا۔ صحت و تندرستی اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ویسے دیگر مضامین بھی قابل تعریف ہیں۔

ماہنامہ اردو دنیا جون کا شمارہ بھی موصول ہوا۔ جناب محمد قمر سلیم صاحب کی تحریر ’بچوں کی نفسیات اور کھیلوں کے ذریعے تعلیم‘ نہایت معلوماتی اور سبق آموز ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ تعلیم میں بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ میں ان کی اس فکر سے پورے طور پر متفق ہوں کہ بچے کے لیے اسکول کی گھڑی دنیا کی سب سے سست رفتار گھڑی ہے۔ جناب رؤف خیر صاحب کا مضمون ’آندھرا و تلنگانہ میں اردو صحافت‘ کافی تفصیلی اور معلوماتی ہے۔ انھوں نے نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ آندھرا و تلنگانہ سے شائع ہونے والے اخبارات اور مجلّات کا جائزہ پیش کیا ہے۔

❖ **محمد اعجاز**: رانجہ ٹولہ، ہرلاکھی، وایا امگاؤں کوٹھی، مدھوبنی، بہار

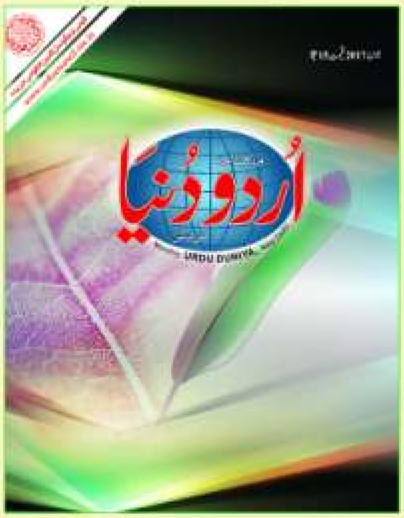

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ اپریل 2017 ہاتھ میں لے کر ورق پلٹا ہی تھا کہ پہلی نظر جس الفاظ پر پڑی وہ تھی ”اردو کی خدمت کرنے والا ہر شخص آج کے دور میں گویا عبادت کر رہا ہے۔ فاروق ارگلی“

سکون نصیب ہوا کہ کوئی تو ہے جو اجڑتی وادی اور تپتے صحرا میں سرگرداں درویشوں کو سلام پیش کر رہا ہے۔ یقیناً اس جملے نے بہت سی روحوں کو اطمینان تو بخشا ہی ہوگا۔ ساتھ میں نئی توانائی اور امنگوں سے شرابور بھی کیا ہوگا۔ یوں جنت کی زبان یقیناً اردو نہیں ہے لیکن یہ بھی سو فیصد درست ہے کہ کم از کم برصغیر کے لوگوں کو جنت تک پہنچانے میں اس زبان سے بڑھ کر مددگار کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔ مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ جو زبان علمی و ادبی خزانے سے مالا مال ہو، اخلاقی اقدار کی پاسبان ہو، دینِ فطرت کا ترجمان اور گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار ہو آج ہماری ہی بے حسی اور ہٹ دھرمی کے ہاتھوں راندہ درگاہ کیا جا رہا ہے۔ آئین اور حکومت کی فراخ دلی کے باوجود ہم خاطر خواہ اردو کا حق ادا نہیں کر رہے ہیں۔ خاص طور پر NCPUL اور دوسرے کئی اور ادارے اس کی منھ بولتی تصویر ہیں جو اس شمارے کے مشمولات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہندوستان ہی اس زبان کی بقا اور سالمیت کا ضامن ہے، جب تک اردو کا ’معبدِ خاص‘ ’فروغ اردو بھون‘ دہلی اور اس کے پاسبان زندہ ہیں۔

خدا اس گھر کو اور خدمت گاروں کو دائمی حیات بخشے!

❖ **محمد وسیم اختر**: فروغ اردو ادب و رسم الخط

آج کے مشاعرے تنزلی کا شکار ہیں

اشتیاق سعید

ممبئی کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس کی سر زمین پر ایسے تین جیّد خانوادے بستے ہیں جن کی تین نسلیں متواتر شعر و سُخن کی آبیاری کرتی رہی ہیں۔ ان میں پہلا نام مضطر خیرآبادی کا ہے جو جاں نثار اختر سے ہوتے ہوئے معروف مکالمہ نویس اور نغمہ نگار جاوید اختر تک پہنچتا ہے۔دوسرا نام علامہ سیماب اکبرآبادی کا ہے جو اعجاز صدیقی سے ہوتے ہوئے افتخار امام صدیقی اور حامد اقبال صدیقی تک آتا ہے۔ تیسرا اور اہم نام آرزو لکھنوی کا ہے جو منیر کاظمی سے ہوتا ہوا ضمیر کاظمی پر ٹھہر جاتا ہے۔ منیر کاظمی نبیرۂ آرزو ہیں۔ آرزو لکھنوی اپنے عہد کے قد آور شاعر تھے،ان کا شماراساتذہ میں ہوتا تھا۔ آپ نے شاعری کے علاوہ کئی ڈرامے لکھے جن کا اُس زمانے میں چلن تھا، جب بولتی فلموں کا دور آیا تو مکالمے اور گیت بھی لکھے۔کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی فلموں میں معیاری گیت نگاری کی بنیاد آپ ہی نے ڈالی۔ آپ کے خلفِ اکبر سیّد تنویر حسین اور خلفِ اصغر سیّد منیر عالم دونوں ہی شاعر ہوئے لیکن سیّد تنویر حسین محض مشاعروں تک محدود رہے جبکہ سیّدمنیر عالم المعروف منیر کاظمی نے نہ صرف مشاعرے بلکہ ادبی اور فلمی دنیا میں بھی اپنا سکّہ جمایا اور فلمی دنیا کو کئی بہترین نغمے دیے۔ نیز 'عکسِ آرزو' کے نام سے ادبی دنیا میں آپ کا مجموعہ کلام بھی مقبولِ عام ہوا ہے۔ سیّد آفتاب عالم المعروف ضمیر کاظمی آپ کے خلفِ اکبر ہیں۔

ضمیر کاظمی کی ولادت 12اپریل 1944 کو کلکتہ میں ہوئی۔ یہ عہد نیو تھیٹر کے عروج کا تھا، دادا آرزو لکھنوی تھیٹر سے وابستہ تھے ہی لہٰذا اُن کی سکونت کلکتے ہی میں تھی۔ والدِ محترم منیر کاظمی بھی فکرِمعاش میں مع اہلیہ کلکتے ہی میں تگ و دَو کر رہے تھے۔ آپ کو ڈراموں میں ڈائریکشن اور اداکاری کا شوق تھالہٰذا کافی مشقّت کے بعد بی۔سی۔ وارروا کے ساتھ بطور اسسٹنٹ کام کرنے کا موقع مِلا۔ ابھی ٹھیک سے قدم جمنے بھی نہ پایا تھا کہ 1947 کا سانحہ ظہور میں آگیا، مُلک کے کونے کونے میں فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی۔ ایسے میں کسی طرح منیر کاظمی مع اہل و عیال بچتے بچاتے ممبئی آئے۔ اوّلین پناہ گاہ دادر میں نصیب ہوئی، پھر بوری محلّہ کے سرائے میں سر چھپایا، سرائے سے نکلے تو باندرہ نوپاڑہ میں قیام کیا، نو پاڑہ سے بھی نو دو گیارہ ہونے کی نوبت آئی تو کُرلا نے پناہ دی۔ ضمیرکاظمی کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کُرلا ہی میں ہوئی۔ میٹرک کے بعد ڈی۔ایڈ کیاپھر 1971 میں سارٹر اسٹریٹ میونسپل اُردو پرائمری اسکول میں بحیثیت مدرس تقرر ہوا پھر 2002 میں اپنی تدریسی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے بڑی خوش اسلوبی سے سبکدوش ہوئے۔ دورانِ ملازمت مشاعروں میں انھوں نے نہ صرف اپنا لوہا منوا لیا تھا بلکہ مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت بھی سمجھے جانے لگے تھے۔ پیش ہے ضمیر کاظمی سے اشتیاق سعید کی گفتگو:

اشتیاق سعید: ضمیر صاحب، آپ کے دادا آرزو لکھنوی، والدِ محترم ،تایا اور چچا سبھی شاعر تھے کیا اسی سبب آپ نے بھی شاعری کو اپنایا؟

ضمیر کاظمی: جی... یہ حقیقت ہے کہ مجھے فنِ شاعری ورثے میں ملا ہے۔ لیکن اس میں میری محنت اور مطالعے کا بھی دخل ہے۔

ا۔س: آپ نے شاعری کی ابتدا کب کی؟

ضمیر کاظمی: غالباً 1956 میں جب میری عمر 12 سال تھی شعر کہنے لگا تھا۔

ا۔س: پہلا شعر کیا کہا تھا؟

ضمیر کاظمی:

دلِ زار کس کی خاطر تو تڑپ اُٹھا اچانک
ترا کون ہے جہاں میں تجھے کس کی یاد آئی

ا۔س: اس شعر پر والدِ محترم کا تاثر کیا تھا؟

ضمیر کاظمی: یہ شعر ابا کو نہیں دکھایا البتہ ایک غزل ضرور دکھائی تھی لیکن انھوں نے بجائے اُس پر کسی طرح کی ترمیم یا اصلاح دینے کے مجھے لوٹاتے ہوئے مشورہ دیا کہ اسی طرح روزانہ ایک غزل کہو اور پھاڑ کر پھینک دو، یہ عمل کم از کم سال بھر کرتے رہو،اس کے بعد مجھے دکھاؤ۔ اسی کے ساتھ مجھے زیادہ سے زیادہ مطالعے کی تلقین کی۔

ا۔س: پھر آپ نے والدِ محترم کے مشورے پر عمل کیا؟

ضمیر کاظمی: ہاں! پہلے مشورے پر نہیں بلکہ دوسرے والے مشورے پر عمل کیا اور آج تک اُس پر قائم ہوں۔

ا۔س: پہلے والے مشورے کو آپ نے نظر انداز کیوں کیا؟

ضمیر کاظمی: نظر انداز نہیں کیا بلکہ مجھ میں روزانہ ایک غزل کہنے کا یارا نہیں تھا۔ البتہ جب کبھی غزل ہو جاتی تو میں اُسے ابا کے مشورے کے مطابق پھاڑ دیا کرتا تھا۔

ا۔س: کہتے ہیں کہ آپ نے انتہائی کم عمری ہی میں مشاعرے بھی پڑھنے شروع کر دیے تھے؟

ضمیر کاظمی: ہاں! میرا ترنم اچھا تھا، اس سبب

مقامی مشاعروں میں مجھے خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا تھا، پھر رفتہ رفتہ میری شہرت کل ہند مشاعروں تک لے گئی اور مجھے ہندوستان بھر میں بلایا جانے لگا۔

ا.س: ضمیر صاحب میں نے اپنے بچپن میں آپ کے تعلق سے اکثر سنا ہے کہ آپ اُس زمانے میں مشاعروں کے ہیرو سمجھے جاتے تھے۔

ضمیر کاظمی: یہ تو محض عوامی محبتیں تھیں جس سے لوگ مجھے نوازتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس دور میں سامعین بھی باذوق اور شعر فہم ہوا کرتے تھے۔ آج کے سامعین تو داد تک دینا نہیں جانتے، بے تُکے، بھونڈے اور غیر معیاری اوزان سے گری ہوئی شاعری پر تالیاں پیٹتے ہیں۔

ا.س: بات جب مشاعروں کی چل نکلی ہے تو لگے ہاتھ یہ بتادیں کہ پہلے کے مشاعروں کی بہ نسبت آج کے مشاعروں کا کیا حال ہے؟

ضمیر کاظمی: آج کے مشاعرے تنزلی کا شکار ہیں۔ کیونکہ شعرا بجائے شاعری کے لطائف، ڈرامہ بازی اور سیاسی حربوں سے سامعین کو محظوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اوراس پر منتظمین سے پچیس ہزار سے پچاس ہزار روپیوں تک حقمت وصولتے ہیں پھر بھی مطمئن نہیں

> ”
> **مشاعرے جو پہلے گنگا جمنی تہذیب کے ضامن ہوا کرتے تھے اب وہ محض پرفامنگ آرٹ بن کر رہ گئے ہیں۔ یہاں شاعر اپنے کلام کی وجہ سے نہیں بلکہ اداکاری اور گلوکاری کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ ان مشاعروں کو متشاعروں سے بے حد نقصان پہنچا ہے جو دوسروں سے غزلیں ہندی میں لکھواکر لاتے ہیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر پڑھتے ہیں۔**
> “

ہیں۔ ہمارے دور میں محض دو سو روپئے زادِ راہ کے نام پر ملا کرتے تھے اور ہم اس پر صابر و شاکر تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج مشاعرے ادب کے ترجمان نہیں رہے بلکہ کمرشیلائزڈ ہوگئے ہیں۔

ا.س: ضمیر صاحب! اُردو پرنٹ میڈیا یعنی اُردو اخبارات اور رسائل کے تعلق سے آپ کا کیا خیال ہے؟

ضمیر کاظمی: اُردو پرنٹ میڈیا کی حالت تو بہت زیادہ خستہ ہے۔ ہندوستان بھر کے معیاری ادبی رسالے رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ اُردو اخبارات پر

کوائف

تصانیف

1. مافی الضمیر (اولین شعری مجموعہ 1989)
2. آشوبیدہ (شعری مجموعہ 2002)
3. چاند کا بیٹا (بچوں کے لیے، 2003)
4. سیپیاں (بچوں کے لیے، 2011)
5. دھوپ کا لہجہ (تحقیقی اور تنقیدی مضامین، 2015)
6. آرزو لکھنوی مونوگراف (ساہتیہ اکادمی کے لیے، 2015)
7. شب گزیدہ سحر (سوانح، زیرِ ترتیب)

فسطائی طاقتیں قابض ہوتی جارہی ہیں، روزناموں سے ادبی صفحات کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں، کچھ نے تو ادب کا سلسلہ ہی بند کردیا ہے جو شائع کر بھی رہے ہیں، وہ اتنا خشک اور بے کیف ہوتا ہے کہ قاری اسے پڑھتے ہی نہیں۔ قارئین تو اسی ادب کی پذیرائی کریں گے جو اُن کے ادبی ذوق کی پرورش کرسکے۔ آج کے رسائل کا معاملہ تو بالکل ایسا ہوگیا ہے جیسے آبِ شیریں کا دریا کھارے پانی کے سمندر میں تبدیل ہوگیا ہو، جس میں غرقاب تو ہوا جاسکتا ہے، تشنگی نہیں بجھائی جاسکتی۔

ا.س: تشنگی سے یاد آیا کہ آپ کے دور نے آپ کو سیراب کیا؟ یعنی کہ آپ کی جس قدر پذیرائی ہونی چاہیے تھی یا جو شہرت ملنی چاہیے تھی، ملی؟

ضمیر کاظمی: حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے کبھی شہرت کی تمنا نہیں کی، زیادہ سے زیادہ توجہ کام پر ہی دی۔ رہی پذیرائی کی بات تو مجھے کہنے دیجیے کہ یہ پورا دور کرپٹ ہے۔ اس دور نے مجھے بُری طرح نظر انداز کیا ہے جبکہ میرے ساتھ امتیازات تھے۔

ا.س: ایسا کیوں ہوا؟

ضمیر کاظمی: گروپ بندیوں کی وجہ سے.... عہدوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے اپنے قریبی لوگوں کو ترجیح دی، خواہ وہ قابل ہوں یا نہ ہوں انھیں نوازتے رہے ہیں۔

ا.س: آنے والے دنوں میں بھی نظر انداز کرنے یا اپنوں کو نوازنے کا سلسلہ یوں ہی جاری وساری رہے گا؟

ضمیر کاظمی: وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا، ممکن ہے آنے والی نسل اس روایت کو توڑ دے اور کرپٹ لوگوں کو ان کی اوقات پر لے آئے۔

ا.س: ضمیر صاحب! آپ نے ازم کی بات کی تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ نے جس دور میں شاعری شروع کی تھی مبئی میں مارکسزم کا بڑا شہرہ تھا۔ شعرا اور اُدبا اس کا بڑا اثر قبول کررہے تھے اور ترقی پسند تحریک سے جُڑ رہے تھے۔ اُس وقت آپ کا رجحان کیا تھا؟

ضمیر کاظمی: ہاں! مارکسزم اور ترقی پسند تحریک سے متاثر تو میں بھی بہت تھا لیکن میں نے خود کو اُس میں ضم نہیں کیا۔ حالانکہ ترقی پسندی کا دور ادب کا انتہائی حسین موڑ تھا۔ اُس دور نے ادب کو نہ صرف گراں قدر قلم کار عطا کیا بلکہ کھیپ در کھیپ باذوق قارئین بھی دیے۔

ا.س: ایسا تھا تو پھر یہ تحریک کیوں معدوم ہوگئی؟

ضمیر کاظمی: گذرتے وقت کے ساتھ ہر نظریہ بوڑھا ہوجاتا ہے اور آہستہ آہستہ عصری تقاضے کھونے لگتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں آج پھر ایسی ہی ایک تحریک کی ضرورت ہے، جس سے ممکن ہے عوام پھر ادب سے جُڑ جائیں۔

ا.س: اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ ضمیر صاحب! فی زمانہ شاعری کا معیار تیزی سے گرتا جارہا ہے۔ اس کا سبب کیا ہوسکتا ہے؟

ضمیر کاظمی: پہلی بات تو یہ کہ آج کے زیادہ تر شعراء اُردو سے نابلد ہیں چنانچہ لفظیات کو برتنے کے گُر اور اُن کے در و بست سے کلی طور پر ناواقف ہیں۔ اس پر ریاضت کی کون کہے مطالعے تک سے جی چراتے ہیں۔ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ راتوں رات بڑا شاعر بن جانا چاہتے ہیں۔

ا.س: جس طرح شاعری کا معیار گرا ہے اسی طرح مشاعروں کے معیار پر بھی حرف آیا ہے، اس تعلق سے آپ کیا سوچتے ہیں؟

ضمیر کاظمی: مشاعروں کے معیار پر محض حرف نہیں آیا بلکہ مشاعروں کا یکسر نقشہ ہی بدل گیا ہے، ان مشاعروں کو مشاعرہ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کیونکہ یہ مشاعرے جو پہلے گنگا جمنی تہذیب کے ضامن ہوا کرتے تھے اب وہ محض پرفامنگ آرٹ بن کر رہ گئے ہیں۔ یہاں شاعر اپنے کلام کی وجہ سے نہیں بلکہ اداکاری اور گلوکاری کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان مشاعروں کو متشاعروں سے بے حد نقصان پہنچا ہے جو دوسروں سے غزلیں ہندی میں لکھوا کر لاتے ہیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر پڑھتے ہیں۔

ا.س: اس قبیل کے مشاعروں سے بچنے کے لیے کیا کیا جانا چاہیے؟

ضمیر کاظمی: متشاعروں سے پاک مخصوص ادبی نشستیں ہونی چاہئیں، جہاں شعرا کے کلام پر گفتگو ہو، خامیوں کی نشاندہی اور خوبیوں پر داد سے نواز کر حوصلہ افزائی ہونی چاہیے کیونکہ ادب میں تخلیقی عناصر ختم ہوچکے ہیں۔ جب تک اچھا ادب پیش نہیں ہوگا مشاعروں سے اچھی اُمید

رکھنا فضول ہے۔

ا۔س: مشاعروں ہی کی طرح فلموں کی شاعری بھی رو بہ زوال ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ضمیر کاظمی: رو بہ زوال نہیں جناب، فلموں سے شاعری کا جنازہ اُٹھ چکا ہے۔ محض شاعری ہی نہیں موسیقی کا بھی یہی حال ہے۔ وگرنہ پہلے فلموں میں نغموں کی ایک تہذیب تھی، نغموں ہی کے توسط سے کہانی بیان ہوتی تھی۔

ا۔س: ضمیر صاحب! آپ نے بھی تو فلموں میں نغمہ نگاری کی ہے؟

ضمیر کاظمی: جی... نا صرف نغمہ نگاری بلکہ اسکرین پلے اور مکالمے بھی لکھے ہیں۔

ا۔س: اچھا! میں تو اس سے لاعلم تھا کہ آپ نے اسکرین پلے اور مکالمے بھی لکھے ہیں۔ بتائیں کن کن فلموں میں آپ نے اسکرین پلے اور مکالمے لکھے ہیں؟

ضمیر کاظمی: گذشتہ صدی کی غالباً ستر کی دہائی میں ایک فلم آئی تھی 'چیمپین' جس میں میرے مکالمے تھے۔ دوسری فلم تھی 'تین چہرے' جس کی مکمل اسکرپٹ یعنی اسٹوری، اسکرین پلے اور مکالمے میرے تحریر کردہ تھے۔ کئی ٹی وی سیریلس لکھے علاوہ ازیں پنکج اُدھاس کے زیادہ تر پروگرام کی اسکرپٹس میں نے ہی لکھی ہیں۔ پھر اسی کی دہائی میں گلشن کمار (ٹی سیریز کے مالک) کے ساتھ وابستہ ہوگیا اُن کے کئی البم کے لیے گیت اور غزلیں لکھیں، جب انھوں نے اپنا پروڈکشن ہاؤس شروع کیا تو اُن کی فلم 'جانم' اور 'شبنم' میں گانے لکھے۔ گلشن کمار ہی نے مجھے انو ملک کے یہاں بھیجا۔ انو ملک اُن دنوں کے۔ سی بوکاڈیہ کی فلم 'تحقیقات' کے لیے موسیقی ترتیب دے رہے تھے۔ انھوں نے اس میں میرا ایک گیت ''پیار جھوٹا سہی دنیا کو دکھانے آجا'' شامل کرلیا۔

ا۔س: ضمیر صاحب! آپ کے کون کون سے گیت عوامی سطح پر مشہور ہوئے؟

ضمیر کاظمی: فلم 'وجے پتھ' کا ایک گیت بہت مقبول ہوا تھا جس کے بول تھے۔

راہ میں اُن سے ملاقات ہوگئی
جس کا ڈر تھا وہی بات ہوگئی

اس کے بعد'' میں کھلاڑی تو اناڑی کا ایک گیت 'مجھ کو پینا ہے پینے دو' پھر سبھاش گھئی کی فلم 'جاگرس پارک' میں 'دھڑک آہستہ اے دل محبت کا سفر ہے' جگجیت سنگھ نے گایا تھا۔ اسی فلم میں دوسری غزل 'عشق ہوتا نہیں سبھی کے لیے' جسے عدنان سمیع نے آواز دی تھی۔

ا۔س: ضمیر صاحب! فلموں میں ایسا بارہا ہوا ہے کہ گیت

ہم اپنے بچوں کو مادری زبان کی بجائے کانوینٹ اسکولوں میں انگریزی تعلیم دلوا رہے ہیں۔ جبکہ ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کانوینٹ اسکول یوروپین تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ لہٰذا وہ ہمارے بچوں کے کورے ذہنوں میں اپنا کلچر سمو رہے ہیں۔ ہم بھی بجائے کسی قسم کے ردّ عمل یا احتجاج کرنے کے اپنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پر یوروپی الکحل زدہ تیز کیمیائی خوشبو میں گم ہوتے جارہے ہیں۔

ریکارڈ تو ہوا لیکن فلم میں استعمال نہیں ہوا، کیا ایسا سانحہ آپ کے ساتھ بھی ہوا ہے؟

ضمیر کاظمی: ہاں! بالکل ہوا ہے۔ شاہ رُخ خان کی فلم 'بازی گر' کے لیے موسیقار انو ملک نے میری ایک غزل ریکارڈ کی تھی جس کے بول تھے۔

سمجھ کر چاند جس کو آسماں نے دل میں رکھا ہے
وہ میرے محبوب کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ٹکڑا ہے

فلم کی لینتھ بڑھ جانے کے سبب پکچرائز نہیں کیا گیا۔

ا۔س: آپ نے ان فلموں کے علاوہ اور کن کن فلموں میں گیت لکھے ہیں؟

ضمیر کاظمی: گیت تو میں نے پچیسیوں فلموں میں لکھے ہیں لیکن فی الوقت جس قدر یاد ہیں وہ بتائے دے رہا ہوں۔ (1) آ گلے لگ جا (2) ناراض (3) ناجائز (4) خوددار (5) چھپا (6) غنڈہ موالی (7) ڈھال (8) غنڈہ راج (ہیرو ہندوستانی (9) چہرے (10) پھول اور انگارے وغیرہ وغیرہ

ا۔س: فلموں کے علاوہ کن کن غزل سنگروں نے آپ کی غزلیں گائی ہیں؟

ضمیر کاظمی: پنکج اُدھاس، نرمل اُدھاس، منہر اُدھاس، چندن داس، انوپ جلوٹا، بھوپیندر سنگھ اور متالی سنگھ نے میری غزلیں گائی ہیں۔

ا۔س: ادھر پندرہ برس میں فلموں کی کہانی، مکالمے، نغمے اور رقص میں جو تبدیلیاں آئی ہیں، اس کا سبب کیا ہوسکتا ہے؟

ضمیر کاظمی: اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ آج ہمارا پورا معاشرہ اپنا کلچر چھوڑ کر یوروپ کی نقالی کر رہا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو مادری زبان کی بجائے کانوینٹ اسکولوں میں انگریزی تعلیم دلوا رہے ہیں۔ جبکہ ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کانوینٹ اسکول یوروپین تہذیب کے دلدادہ ہیں، لہٰذا وہ ہمارے بچوں کے کورے ذہنوں میں اپنا کلچر سمو رہے ہیں۔ ہم بھی بجائے کسی قسم کے ردّ عمل یا احتجاج کرنے کے اپنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پر یوروپی الکحل زدہ تیز کیمیائی خوشبو میں گم ہوتے جارہے ہیں۔ انگریزی کا غلبہ محض ہندوستان ہی پر نہیں بلکہ فرانس اور چین پر بھی ہے لیکن انھوں نے اپنی زبان کو محفوظ رکھا، اس لیے اُن کا کلچر بھی محفوظ ہے۔ یاد رہے انگریزی صارفیت کی زبان ہے کلچر کی نہیں۔

ا۔س: ضمیر صاحب ہمارے یہاں کی سیاست ہمیشہ کہتی ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں سگی بہنیں ہیں۔ پھر ایک بہن کو راج سنگھاسن دوسری بہن کو ملک بدر!! یہ سوتیلا سلوک کیوں؟

ضمیر کاظمی: یہ لسانی تعصب سیاست ہی کی دین ہے۔ تقسیم وطن کے بعد ہماری سیاست نے اسے پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ جموں وکشمیر میں اُردو ریاستی زبان ہے، یوپی، بہار، بنگال اور مہاراشٹر میں بھی ثانوی درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ علاوہ ازیں حیدرآباد، دہلی اور علی گڑھ میں اُردو کا بول بالا ہے۔ رہی بات اُردو اور ہندی کے بہناپے کی تو یہ سچ ہے۔ ہمارے ملک میں دونوں بہنیں ہاتھ ملا کے چل رہی ہیں۔ آپ اُردو کے بغیر ہندی کا کوئی اچھا جملہ نہیں بنا سکتے، اسی طرح اُردو کے بارے میں بھی ہے۔

ا۔س: آپ نئی نسل کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

ض۔ک: نئی نسل سے گذارش ہے کہ وہ اپنی مادری زبان ضرور پڑھیں، نہ صرف پڑھیں بلکہ اُس کے ادب سے بھی وابستہ ہوں۔ اپنی تہذیب اپنی زبان کی حفاظت بالکل اُسی طرح کریں جیسے اپنے مذہب کی حفاظت کرتے ہیں۔

ا۔س: ضمیر صاحب شکریہ آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا اور بہت سی معلوماتی باتیں بتائیں، اب چلتے چلتے 'اُردو دنیا' کے قارئین کو چند اپنے پسندیدہ اشعار سے نوازیں، نوازش ہوگی۔

ضمیر کاظمی:

اُسے یہ فخر کہ غیروں کی بولی بولتا ہے
مجھے یہ شرم کہ اپنی زبان بھول گیا
آرزو ہے کہ کسی آنکھ میں آنسو نہ رہے
میرے ہاتھ میں کوئی ایسا کھلونا دے دے
اس شخص کی شہرت کو نہ پیمانہ بناؤ
وہ سکہ تھا ایسا جو مقدر سے چلا تھا
زندگی سے گذر گئے ہوتے
تم نہ ملتے تو مر گئے ہوتے

■

Ishtiyaque Saeed
B-01, Meera Pairadise,
Geeta Nagar, Phase 2
Meera Road, Mumbai - 401107 (MS)

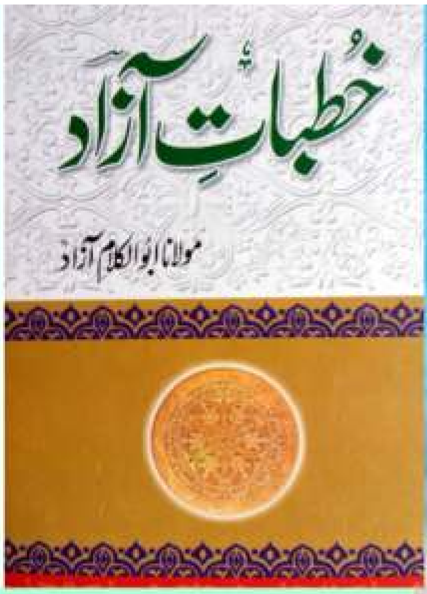

محمد اسلم اصلاحی

مولانا ابوالکلام آزاد اور عالم عرب

ہم میں سے شاید و باید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اس حقیقت سے ناواقف ہو کہ ہمارے عظیم سیاسی و قومی رہنما اور ہمارے اولین وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش 1888 میں سرزمین حجاز کے مقدس شہر مکہ مکرمہ میں ہوئی تھی۔ اس سلسلے کی سب سے اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ مولانا کو سرزمین عرب سے اپنے اس پیدائشی تعلق کا احساس زندگی بھر رہا اسی لیے جب کبھی بھی انھیں کسی افتاد کا سامنا کرنا پڑا تو انھوں نے عرب دانشوروں، مفکروں اور رہنماؤں سے کسب فیض میں کسی طرح کے تامل سے کام نہیں لیا۔ ان کی مادری زبان چونکہ عربی تھی اسی لیے اوائل عمر سے ہی عربی رسائل ومجلات ان کے زیر مطالعہ رہے اور انھیں عرب ممالک کی علمی وادبی نیز اجتماعی و سیاسی نیز مذہبی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل ہوتی رہی۔ عربی کے یہ میگزین اور رسالے ابتدا میں انھیں اپنے والد اور ان کے دوستوں اور مریدوں کے توسط سے مل جاتے تھے۔ بعد کے ایام میں جب وہ خود اخبارات ورسائل کی دنیا سے وابستہ ہوگئے تو ان کے پاس ان کے اپنے اخبارات ورسائل کے تبادلے میں بعض اہم عربی مجلات اور اخبارات آنے لگے۔

جن عربی رسالوں اور میگزینوں سے وہ اول اول متاثر ہوئے ان میں مصر سے شائع ہونے والے رسائل المؤید، الہلال، المنار، مصباح الشرق، اور سرزمین طرابلس، لبنان سے شائع ہونے والا جریدہ 'الجوائب' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ رسائل کے مطالعے سے جہاں انھیں اپنی عربی زبان کو بہتر سے بہتر بنانے کا موقع مل رہا تھا وہیں انھیں ان کے ذریعے عرب ممالک کے موجودہ سیاسی، علمی، ادبی اور مذہبی احوال وکوائف سے بھی آگاہی حاصل ہورہی تھی۔ اس آگاہی کا اثر ان کے افکار ونظریات پر بہت گہرا پڑا۔

یہ غالباً اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ 1908 میں انھوں نے جب بعض عرب ممالک کی سیاحت کی تو وہاں کے علما وفضلا نیز دانشوروں سے موجودہ اسلامی دنیا کے مسائل ومشکلات کے بارے میں بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ اس سیاحت کی بابت ان کے حوالے سے علامہ عبدالرزاق ملیح آبادی نے جو کچھ تحریر کیا ہے، اس پر طائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرب دنیا کا دینی، ادبی اور سیاسی حلقہ پہلے سے ہی مولانا کی شخصیت اور ان کے مقام ومرتبے سے واقف ہوچکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عراق ومصر وشام اور ترکی میں جہاں جہاں گئے ان کے واقف کاروں نے نہ صرف ان کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا بلکہ بعض سیاسی امور میں ان کو کچھ ایسے مشورے بھی دیے جو آنے والے دنوں میں ان کے لیے منارۂ نور ثابت ہوئے۔ مولانا نے خود اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے عرب ممالک میں اپنے سفر کے دوران وہاں کے علما وادبا نیز سیاسی رہنماؤں سے بہت کچھ سیکھا۔ مصر کے مشہور اور ہردلعزیز سیاسی رہنما مصطفیٰ کامل کے ہمنواؤں سے انھوں نے ان سیاسی حربوں کی بابت جانکاری حاصل کی جن کا استعمال وہ لوگ وادی نیل پر براجمان برطانوی سامراج کے خلاف کررہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاہرہ کی سیاسی سرگرمیوں کے مشاہدہ کے بعد مولانا آزاد کے دل میں برطانوی استعمار پسندوں کے خلاف نفرت کی آگ مزید بھڑک اٹھی اور انھوں نے اس بات کا عزم بالجزم کرلیا کہ آنے والے دنوں میں ان کی بیشتر تگ وتاز کا محور

انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی ہوگی۔ ہندوستان اور مصر کے احوال ان کی نگاہ میں یکساں نوعیت کے حامل تھے۔ یہ دونوں ہی ملک برطانوی حکمرانوں کی چیرہ دستیوں کے شکار تھے۔ دونوں ہی ملکوں میں اپنے غیرملکی آقاؤں کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ دونوں ہی ملکوں کے باشندے غلامی اور ذلت کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کردیے گئے تھے۔ اس ظلم و جبر کے خلاف مصر کے سیاسی رہنما متواتر اپنی صدائے احتجاج بلند کررہے تھے اور اس بات کا پرزور مطالبہ کررہے تھے کہ ان کے ملک میں خود ان کے اپنے لوگوں کی حکومت ہونی چاہیے۔

اس طرح کے انقلابی افکار و خیالات نے مولانا آزاد کے انداز فکر اور زاویہ نظر میں زبردست تبدیلی پیدا کردی اور انھوں نے تہیہ کرلیا کہ وہ عربوں بالخصوص مصریوں کی طرح برطانوی سامراج کے خلاف لڑائی میں اپنی عظمت وشوکت نیز علم و دولت الغرض سب کچھ داؤ پر لگادیں گے۔ اور ہندوستان واپس آنے کے بعد انھوں نے فی الواقع کیا بھی ایسے ہی۔ اس حقیقت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جب 13 جولائی 1913 میں اپنے شہرہ آفاق رسالہ الہلال کا پہلا شمارہ شائع کیا تو ٹائٹل کور پر جمال الدین افغانی (1839-1897) کی تصویر اور اندرون صفحات پر شیخ محمد عبدہ (1845-1905)) اور علامہ رشید رضا (1935-1965) کی تصویریں شائع کیں۔ مذکورہ تصویروں کی نمایاں اشاعت خود اس حقیقت کی غماز ہے کہ مولانا آزاد کو عرب بالخصوص مصری علما و فضلا نیز وہاں کے دانشوروں اور خردمندوں کے مقام و مرتبے کا بخوبی اندازہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمانان ہند جمال الدین افغانی کے نظریہ 'اخوت اسلامی' کو اچھی طرح سمجھ کر مغربی استعمار پسندوں کے خلاف صف آرا ہوجائیں۔ الہلال کے بیشتر شمارے اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ مولانا اپنے مذکورہ رسالے کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف اہل یورپ کی ریشہ دوانیوں اور چیرہ دستیوں کو طشت از بام کرنا چاہتے تھے اور اہل اسلام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ مغرب کی سامراجی طاقتیں ان کے عقیدہ و ایمان نیز ان کے تہذیب وتمدن کی بیخ کنی پر آمادہ ہیں۔ مولانا آزاد کے بیشتر عرب مداحین ومعتقدین کا خیال ہے کہ اس طرح کے انقلابی افکار ونظریات مولانا کے ذہن و دماغ میں صرف اس وقت موجزن ہوئے جب انھوں نے مصری رہنماؤں اور دانشوروں مثلاً مصطفیٰ کامل، محمد فرید اور سعد زغلول نیز جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ اور علامہ رشید رضا وغیرہ کی سیاسی تحریروں اور ان کی دینی و علمی نگارشات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور محسوس کیا کہ سارا عالم اسلام مغربی قمار بازوں اور دراندازوں کے خلاف لام بند ہے۔ ایسی صورت میں اگر مسلمانان ہند اپنے فریضہ دینی کے تعلق سے بیدار مغزی کا ثبوت نہیں دیں گے تو اقوام عالم کے درمیان ابدی ذلت و رسوائی ان کا مقدر ہوگی اور ان کے لیے غلامی کی زنجیروں سے رہائی پانا انتہائی دشوار ہوجائے گا۔

مولانا کے عرب معتقدین کے اس خیال کو اگرمنی بر صداقت تسلیم کرلیا جائے تو اس حقیقت کے اعتراف میں ہمیں کسی طرح کا تامل نہیں ہونا چاہیے کہ مولانا کی ذہنی و فکری ساخت میں عرب دانشوروں اور مفکروں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مشہور عرب ادیب علامہ انور الجندی نے خاص طور سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا آزاد کے دل ودماغ میں آزادی وحریت کی تڑپ، مغربی استعمار پسندوں سے نفرت وکراہیت نیز قوم و وطن سے محبت جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کی تحریروں سے تاثر پذیری کا نتیجہ تھی۔ مولانا کی نگاہ سے افغانی اور عبدہ کے زیر ادارت شائع ہونے والے العروۃ الوثقی کے بعض شمارے گزر چکے تھے اور انھیں بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ مغربی طاقتوں کے خلاف مقابلہ آرائی کا وقت آن پہنچا ہے اور اس مقابلہ آرائی کے لیے اہل اسلام کے درمیان اتحاد واتفاق کا ہونا لازمی ہے۔ الہلال والبلاغ کے بیشتر مشمولات اسی مرکزی فکر کے آئینہ دار ہیں۔ اسی فکر وخیال کو مزید تقویت دینے نیز اس کی مزید تشہیر کی غرض سے مولانا نے 1923 میں 'الجامعۃ' کے نام سے عربی زبان میں ایک پندرہ روزہ رسالہ جاری کیا۔ اس پندرہ روزہ رسالے کی ادارت کی ذمے داری ہرچند کہ علامہ عبد الرزاق ملیح آبادی کے ہاتھوں میں تھی لیکن اس کے حقیقی روح رواں مولانا ابوالکلام آزاد تھے اور یہ انھیں کے بنیادی افکار وخیالات کا ترجمان تھا۔ اس رسالے کے اجراء کے وقت ہی مولانا نے اس بات کی وضاحت کردی تھی کہ اس کا مقصد دنیائے اسلام کو مغربی طاقتوں کے خلاف صف آراء کرنا ہے نیز ملت بیضاء کی بقا اور استحکام کے لیے خلافت عثمانیہ کے ہاتھوں کو مضبوط کرنا ہے۔ عام مسلمانوں بالخصوص عربوں کو اہل یورپ کی ان چالوں اور سازشوں سے آگاہ کرنا ہے جنھیں وہ اسلامی دنیا کے اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اختیار کررہے ہیں۔

مولانا کو اپنے اس مقصد کے حصول میں اس وقت زبردست کامیابی ملی جب عربوں کے ایک بہت بڑے طبقے نے والی مکہ شریف حسین کے اس اقدام کی شدید مخالفت کی جس کی رو سے وہ خلافت عثمانیہ سے علیحدہ ہوکر ایک عرب سلطنت کی داغ بیل ڈالنے والا تھا۔ بہ الفاظ دیگر رسالہ 'الجامعۃ' کی آواز صدا بصحرا نہیں ثابت ہوئی۔ بیشتر برادران عرب نے اس آواز پر لبیک کہا۔ رسالے کی اس غیر معمولی مقبولیت سے گھبرا کر شریف مکہ نے اپنے زیر اقتدار علاقوں میں اس کے داخلے پر پابندی لگادی۔ یہی نہیں بلکہ اپنے یہاں سے شائع ہوئے رسالہ 'القبلہ' میں ان مضامین ومقالات کی تردید شائع کروائی جو رسالہ الجامعہ میں اس کے خلاف لکھے گئے تھے۔ ان تردیدی تحریروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسئلہ خلافت کے تعلق سے شریف مکہ کو نہ صرف مولانا کے افکار وخیالات پر سخت اعتراض تھا بلکہ اسے رسالہ الجامعہ کے مشمولات ومضامین کی بنا پر مولانا سے ذاتی عناد اور پرخاش ہوگئی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے اس نے اپنی جوابی تحریروں میں مولانا کے لیے ابوالکلام کے بجائے ابوالکلاب یعنی پدر سگاں یعنی کتوں کا باپ لکھوایا۔

رسالہ الجامعہ میں شائع نگارشات ومقالات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہم بہت جلد اس نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں کہ مولانا مسئلہ خلافت کے تئیں انتہائی حساس واقع ہوئے تھے اور اس تعلق سے ان کا اپنے بعض عرب دوستوں سے بھی سخت اختلاف تھا یہی وجہ تھی کہ جب انھیں پتہ چلا کہ ان کے دوست علامہ رشید رضا مسئلہ خلافت کے باب میں عرب قوم پرستوں کے ہمنوا بن چکے ہیں تو انھوں نے متعدد خطوط ان کے نام لکھے اور ان سے اس بات کی وضاحت چاہی کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے خلافت عثمانیہ کے خلاف صف آرائی کیونکر جائز ہے۔ مصر کے سابق وزیر اوقاف شیخ عبدالمنعم النمر نے اپنے تحقیقی مقالہ ابوالکلام آزاد۔ المصلح الدینی والزعیم السیاسی فی الہند، میں ان خطوط کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ علامہ رشید رضا اور مولانا آزاد کے مابین خلافت عثمانیہ کے تعلق سے اختلاف رائے تھا۔ مولانا اس مسئلے کو خالص دینی نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے جبکہ علامہ رشید رضا اور ان کے معاصر مصری علماء عرب قوم پرستوں کے خیالات سے متاثر ہوکر عثمانی خلافت کو محض ایک سیاسی تنازعہ تصور کررہے تھے۔ اسی لیے وہ عثمانی خلافت کی بیخ کنی پر آمادہ عرب مفاد پرستوں کی ترکوں کے خلاف سرگرمیوں کی در پردہ تائید کررہے تھے۔ اس تناظر میں اگر ہم مسئلہ خلافت پر غور کریں تو یہ بات کس قدر عجیب لگتی ہے کہ ایک طرف

جہاں ہندوستانی قائدین بشمول مولانا آزاد خلافت عثمانیہ کی بقا کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے وہیں دوسری طرف بیشتر عرب علماء وفقہاء مغربی طاقتوں کی ایما پر عرب علاقوں میں ترکوں کی پشت میں چھرے گھونپ رہے تھے اور دانستہ اور نادانستہ طور پر فلسطینی علاقوں میں موجودہ اسرائیلی حکومت کی بنیادیں ہموار کر رہے تھے۔

مولانا آزاد کو اس افسوس ناک صورتِ حال نے بے قرار کر دیا تھا اور انھوں نے اپنی جانب سے بھرپور کوشش کی کہ برادران عرب اپنی ترک مخالف کارروائیوں سے باز آجائیں اور مغربی قمار بازوں کے ذریعے ترکوں اور عربوں کے درمیان پھیلائی گئی نسلی منافرت ومخاصمت کو بالائے طاق رکھ دیں لیکن یہ انتہائی دکھ کی بات ہے کہ اس سلسلے میں مولانا آزاد کی ہر کوشش بے سود ثابت ہوئی اور وہ تاریخ کے مقدرات کو ٹال نہیں سکے حالانکہ اس سلسلے میں انھیں عرب علماء ومفکرین سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں وہ اس لیے کہ اسلامی تعلیمات میں نسلی اور قومی تفاخر وتناحر کی سرے سے کوئی گنجائش ہے ہی نہیں۔ اس پس منظر میں انھیں یقین تھا کہ دینی تعلیمات سے آشنا عرب اپنے ان ہم وطن قوم پرستوں پر غلبہ حاصل کر لیں گے جو مغربی استعمار پسندوں کے شاطرانہ منصوبوں کا شکار ہو کر خلافت عثمانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تلے ہوئے تھے۔

اپنے اس یقین وایمان کے زیر اثر مولانا نے اردو میں مسئلہ خلافت اور جزیرہ عرب نامی کتاب لکھی جس کا ترجمہ بالاقساط علامہ رشید رضا کے زیر ادارت شائع ہونے والے المنار میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے لکھنے کی بنیادی غرض وغایت خلافت کے تعلق سے عربوں میں پائی جانے والی بدگمانیوں کا قلع قمع کرنا تھا اور ان پر یہ حقیقت واضح کرنی تھی کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جمیعا یعنی جملہ اہل ایمان اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں، پر موجودہ حالات میں عمل صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ہم خلافت عثمانیہ کی حفاظت و بقا کے لیے سرگرم ہو جائیں نیز اس پر منڈلا رہے خطرات کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں۔

بہر حال اس اہم اور نازک مسئلے پر مولانا کی جملہ کد وکاوش ناکامی کا شکار ہو گئی اور عرب قوم پرستوں کے بالمقابل ان کے قرآنی دلائل و براہین کو خود عرب علماء و فقہاء نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ بہ الفاظ دیگر دینی رنگ میں ڈوبے ہوئے ان کے سیاسی بوباس کے حامل افکار و

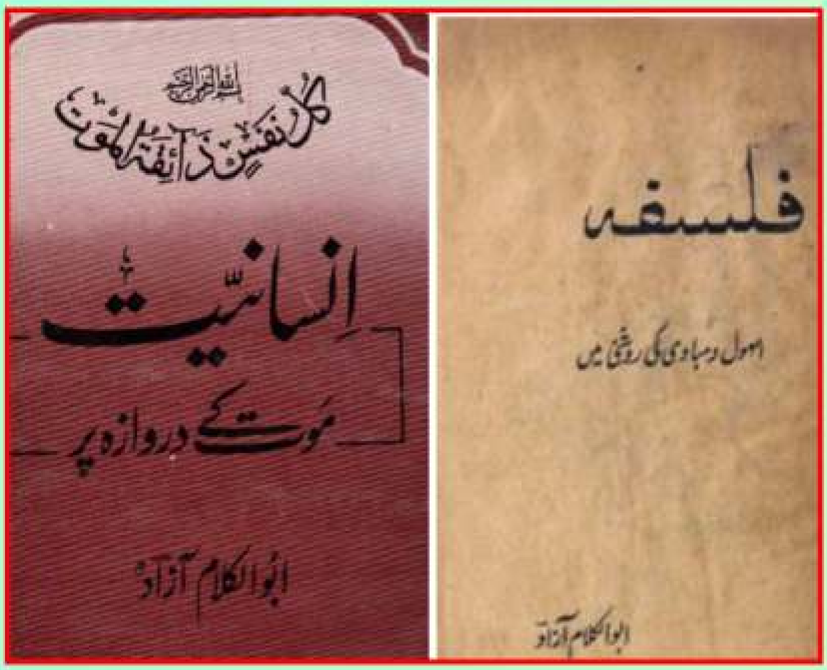

نظریات کو عرب دنیا میں کوئی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی اور خلافت عثمانیہ سے ان کے قلبی، ایمانی نیز جذباتی تعلق پر کسی نے کوئی توجہ نہیں دی۔

اس مایوس کن صورتِ حال کے باوجود ہمیں فی زمانہ یہ دیکھ کر یقیناً بڑی خوشی ہوتی ہے کہ معاصر عرب دنیا میں مولانا کی شناخت آج بھی ان کے بعض دینی، علمی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ان کے ایسے علمی اور تحقیقی کارناموں میں ان کے اس انکشاف کو گرانقدر اہمیت حاصل ہے جس کا تعلق قرآن کریم میں مذکور ذوالقرنین کی شخصیت کی تحدید وتعیین سے ہے قرآن کے بیشتر مفسرین مولانا آزاد کے بقول مذکورہ تاریخی شخصیت کے تعلق سے غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ بنابریں انھوں نے ذوالقرنین کی شخصیت کو چیستاں بنا دیا ہے۔ مولانا آزاد نے اس موضوع پر تحقیق کی اور کافی غور وخوض نیز بحث وتمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ذوالقرنین نہ تو سکندر مقدونی ہیں اور نہ ہی عرب قبیلہ حمیر کے بادشاہوں میں سے کوئی بادشاہ بلکہ وہ در حقیقت قدیم بلاد فارس کے حکمراں کورش ہیں جنھیں یہودی حضرات قورش یا کیخسرو کے نام سے جانتے ہے۔ اور ان کا زمانہ سکندر مقدونی سے پہلے کا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے اس انکشاف کی تائید میں جو ثبوت ودلائل پیش کیے ہیں ان کو پڑھنے کے بعد شاید ہی کوئی ایسا کور مغز شخص ہو جو ان کی تحقیق کی داد دیے بغیر رہ جائے۔ عرب علماء وفضلاء اور محققین اس اعتراف حقیقت کے تعلق سے بھلا پیچھے کیوں رہتے۔ مصری عالم علامہ احمد حسن باقوری نے وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ یعنی لوگ ذوالقرنین کے بارے میں تم سے سوال کرتے ہیں" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی اور اس میں ذوالقرنین کے بارے میں مولانا آزاد کی تحقیق کو بڑی شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا اور اس سلسلے میں مولانا کے انکشاف کو حرف آخر قرار دیتے ہوئے ان کی ژرف نگاہی، دقیقہ رسی اور نکتہ سنجی کی جم کر مدح سرائی کی اور معاصر علماء نیز مفسرین کے درمیان انھیں تحقیق و تدقیق کے میدان میں یکتائے روزگار قرار دیا۔

مولانا آزاد کے شکوہ علم وفضل کا اعتراف عرب دنیا کے ہر اس عالم دین نے کیا ہے جس کی برصغیر ہندو پاک کے تاریخی اور ثقافتی ورثے سے ذرہ برابر بھی دلچسپی رہی ہے۔ عربوں کے اندر اس دلچسپی کو پیدا کرنے میں سہ ماہی رسالہ ثقافۃ الہند جسے ہندوستانی وزارت خارجہ کے ایک ذیلی ادارہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز گزشتہ 65 سال سے شائع کر رہا ہے، کی عظیم الشان خدمات کو کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس رسالے کی داغ بیل مولانا آزاد نے ہی ڈالی تھی اور اس کا مقصد عرب دنیا کو ہندوستانی تہذیب وثقافت سے واقف کرانا تھا۔ اس رسالہ کا اجرا خود اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ مولانا آزاد کے یہاں عربوں سے تعلقات کو ترجیحی حیثیت حاصل تھی اور انھیں بلاشبہ اپنے اس مقصد میں مذکورہ رسالے کی بدولت قابل قدر کامیابی حاصل ہوئی۔ عربوں کے اندر اس رسالے کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان شناسی کو فروغ حاصل ہوا ہے بلکہ اس کے ذریعے عرب علماء ومفکرین نے مولانا آزاد کے افکار و خیالات سے گہری شناسائی بھی حاصل کی ہے۔

■

Prof. Mohd Aslam Islahi
Ex. Head Dean School of Language
Literature & Culture Studies, JNU
New Delhi - 110067

محمد قلی قطب شاہ کے عہد کے قلمی آثار خدا بخش لائبریری میں

محمد ذاکر حسین

تاریخ نویسوں نے عام طور پر کسی عہد کا تجزیہ اس وقت کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، تمدنی اور اقتصادی حالات کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے۔ علمی اور ادبی حالات کی جانب ان کی توجہ کم ہی رہی ہے۔ کسی نے اس کو قابل اعتنا سمجھا بھی تو وہ اس قدر دھندلے ہیں کہ اس سے اس دور کے علمی و ادبی حالات کی سچی تصویر پیش نہیں کی جا سکتی۔ ہر دور کی تاریخی کتابوں کی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ حالانکہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ علم ہی کی بدولت حکومتیں ارتقا کے منازل طے کرتی ہیں اور یہی ان کے عروج کی راہیں بھی ہموار کرتی ہیں اور اسی کی روشن شعاعوں سے تمام دریچے از خود وا بھی ہوتے ہیں۔ جس عہد اور سماج پر علم کی خاص مہربانیاں رہی ہیں، وہی عہد اور سماج آج ہماری تاریخ کا زریں باب ہے اور وہی دور ہمارے لیے مشعل راہ ہے، جس نے اپنے علمی اکتشافات واختراعات سے زمانے کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔

قطب شاہی دور کے مؤرخوں نے بھی اپنا سارا زور قلم فتوحات، کشور کشائی اور عشق و معاشقے کی داستان سرائی میں صرف کیا ہے۔ جبکہ مغل حکمرانوں کی طرح اس خاندان کے حکمراں بھی رزم و بزم دونوں کے مرد میداں تھے۔ اس خاندان کے بانی سلطان قلی قطب شاہ (924ھ/ 1518۔ 949ھ/ 1543) کو ان کی علمی لیاقت اور جنگی مہارت کی وجہ سے محمود شاہ بہمنی کے دربار سے صاحب سیف وقلم کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت جنگ وجدال اور استحکام حکومت میں گزرا۔ اس کے باوجود اس نے علم و ادب کی سرپرستی کی طرف خاص دھیان دیا اور علمی و ادبی ماحول کو سازگار بنانے کی غرض سے آش خانہ کے نام سے ایک محل تعمیر کروایا، جہاں باقاعدہ ادبی مجلسیں آراستہ کی جاتی تھیں اور کبھی کبھی خود بھی اس میں شریک ہوتا تھا۔ جمشید قلی (949ھ/ 1543۔ 957ھ/ 1550) بھی علم وادب کا بڑا قدر دان تھا اور خود بھی فارسی میں طبع آزمائی کیا کرتا تھا۔ احمد شریف وقوعی اس کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ (957ھ/ 1550۔ 988ھ/ 1580) گرچہ خود شاعر نہیں تھا لیکن علم وادب سے متصف تھا۔ اردو، فارسی اور عربی شعرا کے ساتھ ساتھ اس نے تلگو فنکاروں کی بھی ہمت افزائی کی۔ اس اعتبار سے وہ تلگو زبان کا پہلا مربی ہے۔ وہ علم وادب کا اتنا شوقین تھا کہ سفر وحضر میں علما وفضلا کے علاوہ کتابوں سے بھرے ہوئے صندوق بھی اس کے ساتھ ہوتے تھے۔

محمد قلی قطب شاہ (988ھ/ 1580۔ 1020ھ/ 1611) کے دور حکومت سے قبل ہی گولکنڈا علم وادب اور تہذیب وتمدن کی شناخت بن چکا تھا۔ علم نوازی، ادب پروری اور اہل کمال کی قدر دانی کی جو شاندار روایت اسے ورثے میں ملی، وہ نہ صرف برقرار رہی بلکہ اور مستحکم ہو گئی۔ مؤرخوں نے ایک رنگین مزاج عاشق کے طور پر اس کا تعارف کرایا ہے۔ اس کی شخصیت کے اس پہلو کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے کہ اس کی دوسری خوبیاں دھندلی پڑ گئی ہیں، لیکن خوبیاں سات پردے سے نکل کر باہر آجاتی ہیں۔ اگر مؤرخوں کی یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے تو اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ ایک مدبر اور ماہر سیاست داں تھا اور علم کے بغیر تدبر اور مہارت کا تصور ذرا محال ہے۔ قرائن بتلاتے ہیں کہ علم کی آبیاری، فن کی قدر دانی اور ادب کی سرپرستی اس کی زندگی کا خاص مشن تھا۔ چونکہ خود اردو، فارسی، تلگو اور سنسکرت زبانوں سے نہ صرف واقف تھا بلکہ سنسکرت کے علاوہ بقیہ تینوں زبانوں میں طبع آزمائی بھی کیا کرتا تھا۔ اس لیے اس کا دربار مختلف زبانوں کے عالموں، فاضلوں، شاعروں اور ادیبوں کا مرکز بن چکا تھا۔ خاص طور پر بیرونی ممالک کے دانشوروں کے لیے یہ عہد کشش کا سبب بن گیا تھا۔

کتابوں سے محبت اور کتب خانوں سے دلچسپی محمد قلی قطب شاہ کو اپنے اجداد سے وراثت میں ملی تھی۔ اس وراثت کی حفاظت اور اس میں خاطر خواہ اضافہ کرنے کے مقصد سے اس نے خط نسخ، ثلث اور نستعلیق کے ماہر خوش

نویسوں کو ایران و عراق سے اپنے دربار میں مدعو کیا تھا۔ ان فنکاروں کی موجودگی سے اس فن کو جنوبی ہند میں کافی فروغ ملا۔ ان خطاطوں میں صرف بابا خان اور اسمٰعیل بن عرب شیرازی کے نام تذکروں میں ملتے ہیں۔ فن مصوری (Painting) کو بھی دکنی دبستان کی حیثیت سے اسی دور میں پہچان ملی۔ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ دیوان محمد قلی قطب شاہ دکنی مصوری کا بہترین نمونہ ہے۔

علم طب پر بھی اس دور میں خصوصی توجہ دی گئی۔ مریضوں کے علاج اور طب یونانی کے طالب علموں کو تعلیمی سہولتیں مہیا کرانے کے لیے 1004ھ/ 1595 میں ایک دو منزلہ عمارت کی بنیاد ڈالی گئی، جس میں بیک وقت چار سو مریضوں کے قیام اور طب یونانی کے طالب علموں کی تعلیم کا انتظام تھا۔ مختلف امراض کے ماہر طبیبوں اور حکیموں کو علاج اور تعلیم کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ ان طبیبوں اور حکیموں نے صرف علاج اور تعلیم تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ انھوں نے اپنے تجربات اور تشخیصات کو کتابی شکل میں بھی پیش کیا۔ حکیم محمد علی حسینی کی 'اختیارات قطب شاہی' اور حکیم صفی الدین جیلانی کی 'تذکرۃ الشہوۃ' اس سلسلے کی بہترین مثالیں ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے قصائد میں فلکیات کی اصطلاحوں کی موجودگی اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ اسے اس فن سے بھی لگاؤ تھا۔ اس کی روشنی میں یہ بات حتمی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ فلکیات کے ماہرین بھی اس کے دربار میں موجود تھے۔ لیکن تاریخ و تذکرے اس باب میں بالکل خاموش ہیں۔ ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں ہزاروں اہل علم وفن اپنی قابلیت کے جوہر دکھا رہے تھے اور اس طرح وہاں بھی علم وادب کا ایک انمول خزانہ جمع ہو گیا تھا۔ اس دور میں علم اور تہذیب، مصوری و نقاشی اور دیگر علوم وفنون خوب ترقی کر گئے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں جب دکن فتح ہوا تو قطب شاہی کتب خانوں کی بیشتر کتابیں مغلوں کے شاہی کتب خانے میں جمع ہوگئیں۔

1857 کے ہنگامے میں جب مغلوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تو اس افراتفری کے ماحول میں جب کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا اور چاروں طرف لوٹ مچی ہوئی تھی، عمارتیں زمیں بوس ہورہی تھیں۔ اس کے نتیجے میں شاہی کتب خانوں کی قیمتی کتابیں بھی تتر بتر ہونے لگیں۔ ہندوستان کے پانچ چھ سو برسوں کا علمی خزانہ، ہمارے عالموں اور پنڈتوں کی کمائی شاہی کتب خانوں میں جمع تھیں۔ لیکن جب 1857 کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان تصادم ہوا تو یہ انمول خزانہ ہاتھوں ہاتھ لٹ گیا۔ کچھ عرصے بعد جب لوگوں کے اوسان بحال ہوئے اور خوف وہراس کا ماحول بدلا تو ہندوستان کے تین نامور سپوتوں نے اس انمول خزانے کو پھر سے اکٹھا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان میں سے دو یعنی نواب سالار جنگ اور نواب رام پور اپنی ریاست کے سپید وسیاہ کے مالک تھے اور تیسرا صوبہ بہار کا ایک وکیل خدا بخش خاں، جن کے پاس نہ ریاست تھی اور نہ مال ودولت صرف علم کی چاہ اور اپنی ہمت کے بل پر اس میدان کارزار میں معرکہ آرائی کے لیے کود پڑے۔ آخر کار وہ ان سے سبقت لے گئے۔ یہ خدا بخش کے خلوص اور نیک نیتی کا ہی ثمرہ ہے کہ ان کی لائبریری میں ہندوستان کے اکثر شاہی کتب خانوں کی بیشتر کتابیں موجود ہیں۔ مغلوں کے شاہی کتب خانے میں لگ بھگ 4300 کتابیں تھیں، تقریباً وہ ساری کتابیں مختلف ذرائع سے خدا بخش خاں کو حاصل ہوگئیں۔ اس کے علاوہ عادل شاہی، قطب شاہی، نظام شاہی اور اودھ کے شاہی کتب خانے کی کتابیں بھی اس لائبریری کی زینت ہیں۔

حیدرآباد اور خدا بخش لائبریری کا تعلق اسی زمانے سے قائم ہے جب کتابیں جمع کرنے کے شوق میں خدا بخش خاں ہندوستان بھر کی سیاحت کر رہے تھے۔ اسی تعلق سے انھوں نے حیدرآباد کا بھی سفر کیا تھا اور یہ تعلق 1895 میں مزید خوشگوار ہوا جب وہ چیف جسٹس کی حیثیت سے حیدرآباد تشریف لائے اور حمایت نگر کلب کو اپنا مسکن بنایا۔ 1898 تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔ اس وقت کا ایک واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ خدا بخش خاں حیدرآباد کے قیام کے دوران ایک دن جب عدالت سے واپس ہورہے تھے تو ایک کباڑی کے پاس پرانی کتابوں کا ایک بنڈل دیکھا۔ انھوں نے اس سے بنڈل کی قیمت پوچھی۔ کباڑی نے انھیں غور سے دیکھا اور ان کی وضع قطع اور بولنے کے انداز سے سمجھ گیا کہ وہ بڑے آدمی ہیں۔ چنانچہ وہ بولا ویسے تو ہم اسے دو تین روپے میں بیچتے لیکن جب آپ لے رہے ہیں تو یقیناً یہ کوئی قیمتی کتاب ہے۔ اس لیے میں 20 روپے لوں گا۔ خدا بخش نے اس کو 20 روپے میں خرید لیا۔ دراصل اس بنڈل میں عربی تاریخ کی نادر کتابیں تھیں، جنھیں بعد میں نظام حیدرآباد نے 400 روپے میں اسے خریدنا چاہا لیکن انھوں نے فروخت نہیں کیا۔ برٹش میوزیم نے بھی اس نادر و نایاب ذخیرے کو خریدنا چاہا لیکن انھوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کردیا کہ "میں ایک غریب آدمی ہوں اور برٹش میوزیم میرے ذخیرے کے لیے جو رقم دے رہی ہے وہ شاہی قیمت ہے۔ لیکن میں صرف پیسے کے لیے اپنا ذخیرہ انھیں کیسے دے دوں۔ یہ میرے اور میرے والد کی زندگی بھر کی کمائی ہے۔ یہ ذخیرہ پٹنہ کے لیے ہے اور میں یہ تحفہ اپنے باشندگان پٹنہ کو ہی پیش کروں گا۔ ان دونوں واقعات سے بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ کتابوں سے خدا بخش کو کتنا پیار اور کتنا لگاؤ تھا۔

محمد قلی قطب شاہ اور خدا بخش خاں کے مابین دو باتوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ محمد قلی قطب شاہ کی طرح خدا بخش خاں کو بھی کتابوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ دوسری یہ کہ جس طرح محمد قلی قطب شاہ کو کتابیں اپنے والد ابراہیم قطب شاہ سے وراثت میں ملی تھیں، جس کا ثبوت یہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ سفر و حضر میں کتابوں سے بھرا ایک صندوق اپنے ساتھ رکھتا تھا یقینی طور پر وہ کتابیں اس کو ملی ہوں گی اور اس سلسلے میں نصیحت بھری باتیں بھی ہوئی ہوں گی۔ خدا بخش کو بھی اپنے والد محمد بخش سے کتابوں کے ساتھ نصیحت بھی ملی تھی کہ اس

ذخیرے کو آگے بڑھانا ہے۔ دونوں اپنے مقصد میں کامیاب وکامران بھی ہوئے۔ اسی مماثلت کا نتیجہ ہے کہ اس دور کے علماء، ادبا، شعرا کی تخلیقات میں سے چند اس لائبریری کی زینت ہیں۔ ویسے تو محمد قلی قطب شاہ کے دور حیات میں جو 973ھ/ 1565 سے 1020ھ/ 1611 تک محیط ہے، پوری دنیا میں جو کتابیں تصنیف کی گئیں یا جن کی کتابت ہوئی، ان میں سے تقریباً 400 عربی و فارسی کے مخطوطات خدابخش لائبریری میں محفوظ ہیں اور یہ مخطوطات کتب سماوی، تجوید و قرات، تفسیر، اصول حدیث، حدیث، اصول فقہ، فقہ، عقائد، مواعظ، ادعیہ، صرف، بلاغت، لغت، ادب، حکمت، منطق، ریاضیات، نجوم، طب، بیطرہ، تاریخ، سیرت، تذکرہ، جغرافیہ، فرائض، تصوف، شاعری، اخلاقیات، ہیئت، قصص، معمیات اور مناظرہ جیسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان 400 مخطوطات کو محمد قلی قطب شاہ کے دور سے منسلک کرنا علمی دیانت داری کے خلاف ہوگا کیونکہ ان میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے، جس سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ یہ مخطوطے اسی دور میں لکھے گئے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوجاتا ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں علم وادب اور فکروفن کی کتنی زرخیز آبیاری ہورہی تھی اور کس اعلی پیمانے پر علم کی نہریں اپنی پوری روانی کے ساتھ جاری تھیں۔ البتہ چند مخطوطات میں ایسے قرینے موجود ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ محمد قلی قطب شاہ اور دوسرے قطب شاہی حکمراں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا ایک مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

(1) انوار العقول من اشعار وصی الرسول (HL.1749):

یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ (وفات 40ھ/ 660) کا شعری مجموعہ ہے۔ اس کو ایک شیعہ عالم قطب الدین ابوالحسن سعید بن ھبۃ اللہ الراوندی (وفات 375ھ/ 1177) نے متعدد کتابوں کے مطالعے کے بعد ان اشعار کو جمع کیا اور حروف تہجی کے اعتبار سے اسے مرتب کیا۔ مرتب نے اپنے مقدمے میں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ یقینی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ حضرت علیؓ کے سارے اشعار اس دیوان میں شامل ہوگئے ہیں۔ اس کے نسخے متعدد کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ 1745 میں پہلی بار یہ کتاب لیڈن سے شائع ہوئی۔ اس وقت سے اب تک اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ خدابخش لائبریری کا یہ نسخہ 858ھ/ 1454 کا مکتوبہ ہے جسے زین العابدین بن محمد الکاتب نے لکھا ہے۔ ترقیمہ کی عبارت ہے:

کتبہ زین العابدین بن محمد الکاتب عفا اللہ عنہما فی حجۃ ثمان و خمسین و ثمان مأۃ الھجریۃ۔

یہ مخطوطہ قطب شاہی حکومت کے زوال اور عالمگیری سلطنت کے عروج کا عینی شاہد بھی ہے۔ ابتدائی صفحے پر محمد قلی

قطب شاہ اور اورنگ زیب کی مہریں اس زوال وعروج کی داستان بیان کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ چند مہریں اور بھی ہیں جو اس مخطوطے کے سفر کی روداد پیش کرتی ہیں۔ سید مسعود احمد رضوی نے اپنے مضمون ''قطب شاہوں کی مہریں اور دستخط'' میں سالار جنگ میوزیم میں موجود دیوان علیؓ کے ایک نسخے کی نشاندہی کی ہے۔ یہ نسخہ 918ھ کا مکتوبہ ہے جس پر ابراہیم قلی قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کی مہریں ثبت ہیں۔ لیکن انھوں نے خدابخش کے اس نسخے کا ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ خدابخش کا نسخہ سالار جنگ میوزیم کے نسخے سے 60 سال پرانا ہے۔ یہ دونوں نسخے اس وقت کے ہیں جب قطب شاہی سلطنت وجود میں نہیں آئی تھی۔ یہ اس بات کے ثبوت ہیں کہ قطب شاہی حکمراں نہ صرف کتابیں لکھواتے تھے بلکہ پہلے سے لکھی ہوئی کتابوں کو مختلف ذرائع سے حاصل بھی کرتے تھے۔ اس مخطوطے پر 17 مہریں ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہیں:

سرورق (1): (1) سید جعفر حسین ولد سید مہدی حسین ؟؟12، (2) ضیا حسین خان 1245ھ، (3) علی تقی 1138ھ (4) عالمگیر شاہی (5) خدا رازق واحمد شفیع است 1114ھ

سرورق (2): (6) محمد خلیل اللہ بن نعمت اللہ المستعین بالغنی... (7) ناخوانده (8) ضیا حسین خان 1245ھ (9) سید جعفر حسین ولد سید مہدی حسین ؟؟12، (10) شیر داد خان (11) ناخوانده (12) شہی کہ نقش نگین مہر حب آل مقیم بود پسر کرم قطب شاہ ابراہیم (13) ملک جہاں مرا کہ بزیر نگیں شدہ از حکم بادشاہ جہاں آفرین شدہ العبد محمد قلی قطب شاہ (14) مہر سلیماں زحق گشتہ میسر مرا نقش نگیں دل است حیدر صفدر مرا، العبد محمد قطب شاہ

آخری ورق: (15) خدا رازق واحمد شفیع است 1114ھ (16) سید جعفر حسین ولد سید مہدی حسین ؟؟12، (17) ضیا حسین خان 1245ھ،

خدابخش کے توضیحی فہرست نگار نے ان مہروں کی تفصیل نہیں پیش کی ہے اور صرف یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان میں متعدد مہریں ہیں، جن میں محمد قلی قطب شاہ اور اورنگ زیب کی بھی ہیں۔

(2) غنیۃ الحسب فی علم الحساب (HL 2023)

عربی زبان میں علم حساب پر یہ خدابخش لائبریری کا ایک اہم اور نادر نسخہ ہے۔ چھٹی صدی ہجری کے ایک ماہر ریاضی داں ابوالعباس احمد بن ثابت قاضی الھمامیہ کے تالیف کردہ اس نسخے کی کتابت تاج بن حسن بن محمد الکرمانی نے 786ھ میں کی۔ 85 اوراق پر مشتمل یہ مخطوطہ حساب کی مختلف شاخوں کا احاطہ کرتا ہے، جیسے باب الضرب (Multiplication)، باب القسمۃ (Division)، باب النسبۃ (Percentage)، باب استخراج الجذور (Fraction)، کتاب المعاملات (Commercial Mathematics)، کتاب المساحۃ (Measurments) اور باب الجذور

اس مخطوطے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کی دوسری کاپی دنیا کے کسی بھی ذخیرے میں دستیاب نہیں ہے اور دوسری بڑی خصوصیت ہے کہ یہ قطب شاہی حکمرانوں کے دربار کا سیر بھی کرچکا ہے۔ سرورق پر ابراہیم قلی قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کی مہریں اس کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ ان مہروں کی عبارت وہی ہے جو انوار العقول فی اشعار وصی الرسول میں ہے۔ اس کے علاوہ محمد عاقبت اللہ مورخہ 1107ھ کی بھی مہر ہے لیکن واضح نہیں ہے۔ خدابخش کے توضیحی فہرست نگار نے صرف محمد قطب شاہ کی مہر کی نشاندہی کی ہے۔ ایک تحریر از عبدالقادر صحاف' بھی سرورق پر مرقوم ہے۔ صحاف کاغذ ساز کو کہتے ہیں۔ گویا اس مخطوطے کا کاغذ عبدالقادر کے ہاتھوں کا بنا ہوا ہے۔

(3) **فلک البروج** (HL 658):

میر محمد امین شہرستانی روح الامین فارسی کا مشہور شاعر ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے دربار کی شہرت سن کر 1010ھ یا 1013ھ میں وہ گولکنڈا آیا اور بادشاہ کے دربار سے منسلک ہوگیا۔ اس کی قابلیت کی وجہ سے بادشاہ اسے بہت عزیز رکھتا تھا اور میر جملہ کے خطاب سے سرفراز بھی کیا تھا۔ بادشاہ کی عنایتوں سے متاثر ہوکر اس نے اپنی مثنوی لیلی مجنوں کو بادشاہ کے نام سے معنون کیا۔ فلک البروج اس کی دوسری مثنوی ہے، جو نظامی گنجوی کے تتبع میں لکھی گئی۔ یہ مخطوطہ 191 اوراق پر محتوی ہے۔ سنہ کتابت مذکور نہیں ہے البتہ غالب گمان ہے کہ یہ 17ویں صدی عیسوی میں لکھی گئی۔ شاعر نے مقدمہ میں حمد و ثنا کے بعد اپنے مربی محمد قلی قطب شاہ کی عنایتوں کا دل کھول کر اظہار کیا ہے۔ وہ اس مثنوی کو اس کے نام سے منسوب کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ابھی یہ تکمیل کے مرحلے میں تھی کہ بادشاہ کی وفات ہوگئی۔ اس سے شاعر کو بڑا صدمہ پہنچا اور اپنی بے چارگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

بہ اوج شرف فتاد بہ چاہ

رفت سوی بہشت بادشاہ

جب یہ مثنوی 1021ھ/ 1612 میں پایہ تکمیل کو پہنچی تو اس نے اس کو محمد قطب شاہ کے نام معنون کیا:

گشت یک بیست چون فزود بہ ہزار

شد مکمل چو چرخ این گلزار

لیکن محمد قطب شاہ کے دربار میں اسے وہ اہمیت نہ ملی جو محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں حاصل تھی۔ آخرکار قطب شاہی سلطنت کو خیرباد کہہ دیا۔ اس مثنوی کو فلک البروج کے علاوہ آسمان ہشتم اور گلستان ناز کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے:

این کتاب مستطاب بفلک البروج موسوم گشت (4ب)

شد چون این کاخ سربلند تمام

گردش آسمان ہشتم نام (182ب)

(4) **شرح الشمسیۃ الحساب** (HL2018):

ابواسحٰق بن عبداللہ نے 963ھ میں گولکنڈا میں اس کتاب کو مرتب کیا اور اسے وہاں کے ایک امیر عبدالکریم کے نام معنون کیا۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی وہ ابراہیم قلی قطب شاہ کا دور تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر عبدالکریم اس کے دربار سے منسلک تھا۔ چونکہ اس کتاب میں کوئی مقدمہ نہیں ہے، اس لیے بہت ساری باتوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اگر سرورق پر مصنف کی یہ تحریر نہیں ملتی" شرح الشمسیة الفه اضعف عباد

الله ابو اسحق بن عبد الله عفی عنهما" تو مصنف کے نام سے بھی واقف ہونا مشکل تھا۔ یہ تحریر اس حقیقت سے بھی آشنا کراتی ہے کہ زیر بحث مخطوطہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ترقیمہ سے واضح ہوتا ہے کہ بہت کم وقت میں یہ کتاب لکھی گئی:

قد تمت هذه النسخة و اكملتها على سبيل الاستعجال ... من شهر شوال فی(سنة ثلاث و ستين و تسع مأة)٩٦٣ فی بلدة گولكندا من اعمال تلنك...

سرورق کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ کسی زمانے میں گجرات کی نظامیہ محمودیہ لائبریری کی ملکیت میں تھا۔ 168 اوراق پر مشتمل یہ مخطوطہ عربی زبان میں علم حساب کے موضوع پر ہے۔ چونکہ اس کی تصنیف گولکنڈا میں ابراہیم قلی قطب شاہ کے دور میں ہوئی، اس لیے غالب گمان ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کی نظروں سے بھی یہ مخطوطہ گزر چکا ہوگا۔

یہ چاروں وہ مخطوطات ہیں جو کسی نہ کسی طور پر محمد قلی قطب شاہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ چند مخطوطات ایسے بھی ہیں، جو محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے دور کے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

(5) **دیوان حافظ** (HL 320):

دیوان حافظ کے متعدد نسخے خدابخش لائبریری میں موجود ہیں۔ لیکن یہ نسخہ اس لائبریری کے نادر ترین نسخوں میں شامل ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ محمد قطب شاہ کی فرمائش پر محمد حسن کاتب نے 1020ھ/ 1611 میں اس کی کتابت کی۔ ابتدا میں کاتب کی یہ تحریر ملتی ہے:

''دیوان خواجہ حافظ تمام شد در کتاب خانہ عامرہ بخط محمد حسن کاتب بتاریخ اوائل ماہ جمادی سنہ ۱۰۲۰ در دار السلطنت حیدرآباد... الخالص لمولاہ سلطان محمد قطب شاہ"

کاتب کی اس عبارت کے نیچے محمد قطب شاہ کی مہر ہے۔ یہ مخطوطہ 262 اوراق پر مشتمل ہے۔

(6) **تاریخ سلطان محمد قطب شاہی** (HL 165):

سلطان محمد قطب شاہ (1020 / 1611 ۔ 1053 / 1625) سے قبل'' تاریخ قطب شاہی و سایر سلاطین دکن و محاربات او'' کے نام سے قطب شاہی دربار سے منسلک (یکی از چاکران این دربار) کسی مؤرخ نے اس تاریخ کو مرتب کیا تھا۔ چونکہ یہ ضخیم تھی اس لیے محمد قطب شاہ نے اپنے دربار کے مؤرخ کو حکم دیا کہ اس سے قطب شاہی سلطنت کی ایک مختصر تاریخ مرتب کی جائے۔ خاتمہ میں ایک عبارت ہے:

این مختصر کہ اواخر شعبان سنہ ست و عشرین والف و اوائل بیست و ہفتم از عمر شریف حضرت ظل الٰہی قریب شش سال است...

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا 1026ھ کے آخری شعبان میں ہوئی اور اختتام 1027ھ/ 1617 کے اوائل میں ہوا۔ اس کتاب کو ایک مقدمہ، چار مقالے، اور ایک خاتمہ میں منقسم کیا گیا ہے۔ مقدمہ میں امیر قرا یوسف ترکمان اور اس کی اولاد کا ذکر ہے۔ مقالہ اول میں قلی قطب الملک، مقالہ دوم میں جمشید قطب الملک اور سبحان قلی، مقالہ سوم میں ابراہیم قطب شاہ، مقالہ چہارم میں محمد قلی قطب شاہ اور خاتمہ میں 1025 / 1616 تک محمد قطب شاہ کی تاریخ ہے۔ اسی خاتمے میں مصنف نے لکھا ہے کہ اگر قسمت نے یاوری کی تو اس دور کی بقیہ تاریخ بھی مرتب کروں گا۔ قسمت نے یاوری کی یا نہیں اس کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہے۔ اس مخطوطے میں محمد قلی قطب شاہ کی چار فارسی غزلیں موجود ہیں۔ 313 اوراق پر مشتمل اس مخطوطے کی کتابت 1171ھ میں ہوئی۔

(7) **دیوان اثیر اومانی** (HL305):

اثیر الدین عبداللہ اومانی (وفات 665ھ/ 1266) نصیر الدین طوسی (672ھ/ 1273) کے شاگردوں میں عربی و فارسی کے ایک مشاق موزوں طبع تھے۔ کمال اصفہانی اور مجد ہمگر جیسے ممتاز شعرا اس کے ہم عصر تھے۔ شاعر کردستان کے حکمراں سلطان سلیمان سے بہت متاثر نظر آتا ہے کیونکہ اس نے اپنے دیوان میں شاہ کردستان کی خوب مدح سرائی کی ہے۔ خدابخش کا یہ

نسخہ 1015ھ کا مکتوبہ ہے۔ ترقیمہ کی عبارت ہے:

تمام شد دیوان اثیر الدین اومانی رحمۃ اللہ علیہ در تاریخ شہر شوال ۱۰۱۵ھ (سنہ خمس عشرۃ والف)

آخری صفحے پر ایک اور تحریر ملتی ہے:

بابت تحفہ آوردہ میر شاہ محمود شہور سنہ ثلاث (و) عشر(ین) (و) الف بتاریخ بیست و چہارم شہر صفر 1023ھ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 1023ھ میں میر شاہ محمود نے اس وقت کے قطب شاہی حکمراں کو تحفے میں پیش کیا تھا۔ اس مخطوطے کی خصوصیت یہ ہے کہ سرورق پر تین مہریں موجود ہیں۔ پہلی میر نجات قلی خاں مؤرخہ 1150ھ، دوسری محمد قطب شاہ اور تیسری عبد اللہ قطب شاہ کی ہیں۔ محمد قطب شاہ کی مہر کی وہی عبارت ہے، جو انوار العقول فی اشعار وصی الرسول اور غنیۃ الحساب میں ہے۔ البتہ عبد اللہ قطب شاہ کی مہر میں جو عبارت درج ہے، وہ ان مہروں سے الگ ہے جو سید مسعود احمد رضوی نے اپنے مضمون میں تحریر کیا ہے۔ مہر کی مکمل عبارت ہے:

انی عبد اللہ آتانی الکتاب بندہ شاہ ولایت قطب شاہ۔

خدا بخش کے کیٹلاگر نے صرف عبد اللہ قطب شاہ کی مہر کا ذکر کیا ہے۔ بقیہ دونوں مہروں کی جانب اشارہ تک نہیں کیا ہے۔ یہ مخطوطہ 103 اوراق پر مشتمل ہے۔

(8) **جہانگیر نامہ** (HL113):

یہ بادشاہ جہانگیر کی خود نوشت تاریخ ہے، جسے اس نے اپنی حکومت کے تیسرے سال یعنی 1017ھ/ 1608 میں ایک ڈرافٹ کی شکل میں مرتب کیا تھا۔ اس میں 1017 / 1608 تک کے واقعات مندرج ہیں۔ جس وقت یہ کتاب لکھی گئی اس وقت جہانگیر کی عمر 40 سال تھی۔ اس کے تین سال کے بعد 1020ھ/ 1611 میں محمد مومن عرب شیرازی نے حیدرآباد کے قطب شاہی کتب خانے کے لیے کتابت کی۔ ترقیمہ میں مذکور ہے:

بتاریخ یوم الاربعاء سلخ ذوالحجۃ سنۃ(عشرین و الف) ۱۰۲۰ در دار السلطنت حیدرآباد مصئونۃ عن کل شر و فساد برسم خزانۃ کتب اعلی حضرت السلطان العادل الکامل افتخار السلاطین فی الزمان و اشرف الخواقین فی الدوران السلطان ابن السلطان السلطان الخاقان ابن الخاقان ... لازال رایات دولتہ منصورۃ منصورۃ و اعداء حضرتہ مقھورۃ بیدہ الفقیر محمد مومن مشہور بہ عرب شیرازی سمت تحریر یافت۔

اس ترقیمہ میں الخاقان ابن الخاقان کے بعد محمد قلی قطب شاہ کی مہر کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی لیکن کسی وجہ سے وہ ثبت نہ ہو سکی البتہ سرورق پر ان کی مہر مؤرخہ 1020ھ موجود ہے اس کے بعد عبد اللہ قطب شاہ کی مہر ہے۔ اس کا عکسی ایڈیشن خدا بخش لائبریری سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مخطوطہ قطب شاہی سلطنت کے زوال اور عالمگیری سلطنت کے عروج کا راز داں بھی ہے۔ سرورق پر اورنگ زیب کے لڑکے محمد سلطان کی ایک تحریر ملتی ہے:

''این کتاب جہانگیر نامہ را کہ حضرت جنت مکانی خود تصنیف نمودہ اند در دار الفتح حیدرآباد از کتابخانہ قطب الملک گرفتہ۔ حررہ محمد سلطان

یعنی جب اورنگ زیب کے زمانے میں حیدرآباد فتح ہوا تو قطب الملک کے کتب خانے سے اس نسخے کو قبضے میں لے لیا گیا۔ 119 اوراق پر محیط خدا بخش لائبریری کا یہ نادر ترین مخطوطہ ہے۔

(9) **برہان قاطع** (HL770):

محمد حسین برہان نے 1061ھ میں اس کتاب کو مرتب کیا اور اسے عبد اللہ قطب شاہ کے نام سے منسوب کیا۔ مصنف اس وقت اپنی علمی لیاقت اور ادبی مہارت کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ بعد میں غالب نے اس کتاب کی خامیوں کو اجاگر کیا۔ مخطوطے کی ابتدا میں ایک تحریر ملتی ہے:

شروع درین نسخہ در دور سہ شنبہ بیست و ششم شہر شعبان المعظم سنہ ہزار و یک صد و پنجاہ و یک از ہجرت النبوی ﷺ

اور ترقیمہ میں ہے: تمام (شد) کتاب مستطاب

محمد قلی قطب شاہ کے شب و روز صرف معشوقوں کے جھرمٹ میں ہی بسر نہیں ہوتے تھے بلکہ امور سلطنت کے علاوہ علم و ادب کے برہم گیسو کو سنوارنے اور فکر وفن کی الجھی لٹوں کو سلجھانے میں بھی ان کا وقت گزرتا تھا۔ ویسے تو بہت سارے حکمراں دنیا پر حکومت کر چکے ہیں لیکن آج وہی حکمراں زندہ اور جاوید ہے جس کا دربار علم و ادب کا مخزن تھا۔ اس کے علاوہ جن بادشاہوں نے صرف حکومت کی یا عیش و عشرت میں مگن رہے، وہ تاریخ کے صفحات میں کہیں گم ہو گئے۔ زندہ رہنے کے لیے عشق ایک ضروری شے ہے۔

بعنایت ملک... بتاریخ ۱۱ شہر ربیع الثانی ۱۱۵۲ھ۔۔۔ روز چہار شنبہ

ان دونوں تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابت کی ابتدا 1151ھ میں ہوئی اور اختتام 1152ھ میں ہوا۔

مذکورہ بالا علمی و ادبی کارنامے یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ کے شب و روز صرف معشوقوں کے جھرمٹ میں ہی بسر نہیں ہوتے تھے بلکہ امور سلطنت کے علاوہ علم و ادب کے برہم گیسو کو سنوارنے اور فکر وفن کی الجھی لٹوں کو سلجھانے میں بھی ان کا وقت گزرتا تھا۔ ویسے تو بہت سارے حکمراں دنیا پر حکومت کر چکے ہیں لیکن آج وہی حکمراں زندہ اور جاوید ہے جس کا دربار علم و ادب کا مخزن تھا۔ اس کے علاوہ جن بادشاہوں نے صرف حکومت کی یا عیش و عشرت میں مگن رہے، وہ تاریخ کے صفحات میں کہیں گم ہو گئے۔ زندہ رہنے کے لیے عشق ایک ضروری شے ہے:

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

عشق ہر حال میں مطلوب ہے خواہ وہ معشوق کے ساتھ ہو یا علم و ادب کے ساتھ۔ عشق و طلب کے بغیر دائمیت نا ممکن ہے۔

■

Dr. Mohd Zakir
Khuda Bakhsh Library
Beside PMCH, Ashok Rajpath Road,
Patna - 800004 (Bihar)

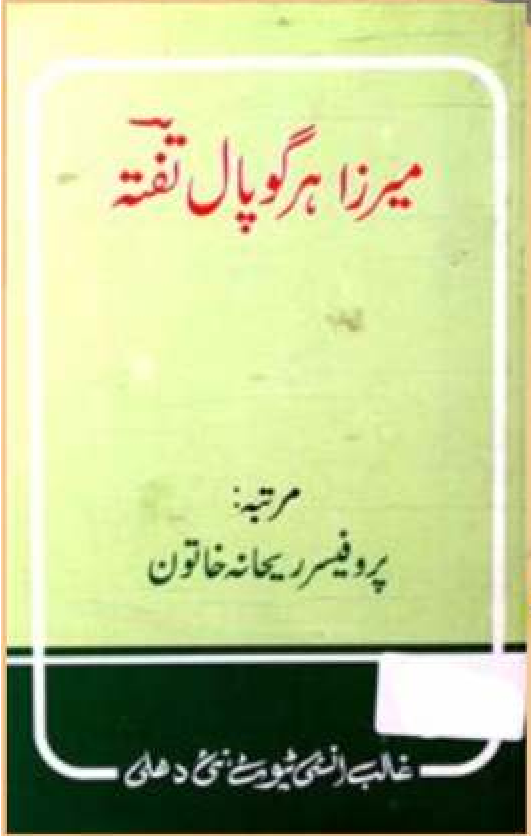

احمد حسن

منشی ہرگوپال تفتہ

غالب کے ایک عزیز شاگرد

منشی ہرگوپال تفتہ قصبہ سکندرآباد ضلع بلند شہر اتر پردیش کے ایک بھٹناگر کاستھ خاندان میں 1799 کو پیدا ہوئے اور اسی قصبے میں 2 ستمبر 1879 کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ سکندر لودھی کے زمانے میں ایک بھٹناگر کاستھ خواجہ دیپ چند فیروزآباد سے آکر یہاں بس گئے تھے۔ ان کی اولاد میں ایک صاحب موتی لال ہوئے ہیں جن کے آٹھ بیٹے تھے جو بعد میں آٹھ گھرے کہلائے، منشی ہرگوپال تفتہ ان ہی موتی لال کے بیٹے تھے۔

تفتہ کی تعلیم کے سلسلے میں مالک رام نے صرف ایک جملہ لکھا ہے کہ "ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی"۔

(تلامذۂ غالب، ص 62)

لیکن کہاں پڑھا، کس کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، کیا کیا پڑھا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ تفتہ کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم خصوصاً فارسی زبان و ادب کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے دواوین اور مثنوی میں پھیلے ہوئے اشعار کے مطالعے سے بھی مجموعی طور پر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم کچھ زیادہ حاصل نہیں کی۔ تفتہ اپنے ایک شعر میں کہتے ہے۔

گر پرسم کہ خواندہ ای آیا چہ از علم و ادب
گوید از شوخی ترا ای تفتہ رسوا خواندہ ام

(اگر پوچھتا ہوں تفتہ تو نے کیا کیا علم و ادب سیکھے، تو شوخی سے کہتا ہے تفتہ تجھے میں نے رسوا کیا ہے۔)

مگر مطالعہ کتب اور علم دوست حضرات کی صحبت کا عادی اور شوقین تھا، کہتا ہے۔

تونگر دل کند سیر کتب بی شبہ مفلس را
اگر گوہر طلب داری بجو در معدن کاغذ

(مطالعہ کتب مفلس کو تونگر بنا دیتا ہے، اگر گوہر اور موتی کی طلب مقصود ہے تو کاغذ کی کان میں تلاش کرو۔)

ایرانی شاعروں کے دواوین ہمیشہ زیر مطالعہ رہتے اور ہر لمحہ ان سے لطف اندوز ہوتا، کہتا ہے۔

دواوین ایرانیان در نظر
ازان ہر زمان انبساط دیگر

(ایرانی شاعروں کے دواوین ہمیشہ پیش نظر رہتے اور ہر لمحہ ان سے لطف لیتا رہتا ہوں۔)

تفتہ بنیادی طور پر ایک شاعرانہ مزاج لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس کے نزدیک زندگی کی اولین ترجیحات میں شعر و شاعری خصوصاً غزل گوئی اور دیوان پر دیوان تیار کرنا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے۔

صبح فکر غزل و شام تمنای چمن
صرف اوقات وی اکنون بہ ہمین عنوانست

(صبح غزل کی فکر میں گذرتی ہے اور شام چمن کے سیر سپاٹے میں، میری زندگی کے اوقات اب اسی انداز سے گذرتے ہیں۔)

تفتہ نے کب شاعری شروع کی صحیح طور پر نہیں کہہ سکتے مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ 14-13 سال کی عمر سے ابتدا کی ہوگی۔ سنبلستان کے ایک شعر سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے جس میں بچپن کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے "میں 44 سال سے شاعری کر رہا ہوں"۔

کنم شاعری از چل و چار سال
درین کار ہستم ز بسیار سال

(سنبلستان)

(چوالیس سال سے شاعری کر رہا ہوں اور اسی میں بہت عرصہ سے مشغول ہوں۔)

سنبلستان کا سال تصنیف 1860 سے 44 سال گھٹائیے تو 1816 نکلتا ہے کچھ وقت طباعت میں بھی لگا ہوگا پھر ان کی پُرگوئی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سن شعور کو پہونچنے کے ساتھ ساتھ ہی تفتہ نے شاعری شروع کر دی ہوگی۔ ابتدا میں تفتہ، رامی تخلص کرتا تھا۔ مالک رام نے نشترِ عشق کے حوالے سے لکھا ہے:

''ابتداء میں تفتہ رامی تخلص کرتا تھا اور نور العین واقف بٹالوی کے دیوان کے مطالعے نے اس کے دل میں شعر گوئی کا شوق پیدا کیا۔ چونکہ ذکاوت اور استعداد سے بہرۂ وافی ملا تھا اس لیے تھوڑی سی توجہ اور مشق سے بہت جلد ترقی کر گیا۔'' (تلامذہ غالب، ص64)

تفتہ نے ابتدا میں قتیل کی شاگردی اختیار کی جس کا سلسلہ قتیل کی وفات 1818 تک جاری رہا۔ قتیل کی استادی کا تذکرہ اس نے دیوان دوم کے ایک شعر میں کیا ہے۔

با قتل خود نہ چون بہ دعا آرزو کنم
استاد ما ستمزدگان خود قتیل بود

(دیوان دوم، ص302)

(اپنے قتل کی آرزو کی دعا کیوں نہ کروں، ہم ستمزدگان کا استاد خود قتیل تھا۔)

نصر اللہ خویشگی نے بھی لکھا ہے ''تلمیذ مرزا قتیل است''۔ (تفتہ اور غالب، ص18)

قتیل کی وفات کے بعد تفتہ نے غالب سے اصلاح لینی شروع کی مگر کب شروع کی اس کی تعیین مشکل ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری لکھتے ہیں:

''تفتہ مرزا غالب کی شاگردی کے رشتہ میں کب منسلک ہوئے اس کا تعین مشکل ہے تذکرہ نگاروں نے اس کی طرف کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے۔'' (تفتہ و غالب، 18)

مگر تفتہ کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ تفتہ کا تعلق غالب سے 1837 کے آس پاس ہوا۔ اس وقت تفتہ کی عمر 37 سال کے لگ بھگ تھی مگر قتیل کے انتقال کے بعد تقریباً انیس سال تفتہ کے اشعار کی اصلاح کس نے کی یہ کہنا مشکل ہے اس لیے کہ اس بارے میں کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا۔ دیوان دوم مطبوعہ 1857 میں تفتہ کہتا ہے۔

بود مرشدِ تفتہ از بیست سال
نرفت از دل و دیدہ در ہیچ حال

(دیوان دوم، ص5 آخر سے)

(بیس سال سے غالب تفتہ کا مرشد ہے اور اس اثنا میں وہ کبھی بھی میرے دل و دیدہ سے اوجھل نہیں ہوا۔)

یہاں تفتہ 1857 میں غالب کی رہنمائی کو بیس سال بتلاتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دور 1837 کے آس پاس سے شروع ہو کر غالب کی وفات 1869 پر ختم ہوتا ہے یعنی تقریباً 32 سال غالب سے تفتہ کا تعلق رہا۔ غالب کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد سب سے پہلے غالب نے اس کا تخلص تفتہ رکھا اور لقب مرزا کا دیا، کہتا ہے۔

مرا مرزا تفتہ خود خواند غالب
چہ نازی کہ بر میرزائی ندارم

(دیوان سوم، ص461)

(خود غالب نے مجھے 'مرزا تفتہ' کہہ کر پکارا، اپنے مرزائی ہونے پر جس قدر ناز کروں کم ہے۔)

تفتہ کی زندگی کا یہ باب بڑا طویل، دلچسپ، ہنگامہ خیز اور بار آور رہا ہے۔ یہاں استاد و شاگرد کا تعلق سماجی بھی ہے، دوستانہ بھی، ادبی بھی ہے اور اصلاحی بھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ غالب کے خطوط کا بڑا حصہ یعنی 123 خطوط صرف تفتہ کے نام ہیں۔ کاش تفتہ کے خطوط بھی مل جاتے تو دونوں کے تعلقات پر مزید روشنی پڑتی اور حالات و واقعات کو ترتیب کے ساتھ بیان کرنے میں بڑی مدد ملتی۔

تفتہ کے نام غالب کے خطوط کے آئینہ میں دونوں کے ہشت پہلو روابط کا علم ہوتا ہے۔ ان خطوط سے مجموعی طور پر جو تاثر قاری کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ غالب کے تمام شاگردوں میں تفتہ کو ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے، یہ تعلق استاد شاگردی سے بڑھ کر باپ بیٹے جیسا اور کہیں انتہائی گہرے دوست جیسا ہے مثال کے طور پر خطوط غالب کے کچھ اقتباسات پیش خدمت ہیں:

''شفیق بالتحقیق منشی ہرگوپال تفتہ''
''کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ''
''خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں''
''نور نظر لخت جگر مرزا تفتہ''
''مشفق میرے کرم فرما میرے''
''کہو مرزا تفتہ تم بے وفا یا میں گنہگار''
''میری جان! سب مخلوقات تفتہ و غالب کیونکر ہو جائیں۔ ہر یکی راہبر کاری ساختند''
''مرزا تفتہ! اس غمزدگی میں مجھ کو ہنسانا تمہارا ہی کام ہے''
''آؤ مرزا تفتہ گلے لگ جاؤ، بیٹھو اور میری حقیقت سنو''
''میرے مہربان، میری جان، مرزا تفتہ سخن دان''

(غالب کے خطوط، ص 239، 245، 350، 291، 301، 270، 319، 320، 348، 354)

یہ اور ان کے علاوہ غالب کے خطوط کے بہت سے اقتباسات، تفتہ سے غالب کے جس تعلق، وابستگی اور گرویدگی و شیفتگی کو ظاہر کرتے ہیں دوسروں کے نام خطوط میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا ہے۔ اس کے کئی وجوہ ہو سکتے ہیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دونوں میں مزاجی ہم آہنگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں اور لیاقتوں کے قدر دان تھے۔ تفتہ کی تحریر جو غالباً اردو میں لکھتے تھے نہایت سلیس، شگفتہ اور مزاحیہ قسم کی ہوتی تھی کیونکہ جب غالب یہ لکھتے ہیں: ''اس غمزدگی میں مجھ کو ہنسانا تمہارا ہی کام ہے، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو مکالمہ ہے، تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہو اب ضرور آ پڑا ہے کہ جواب اسی انداز سے لکھیں، زیادہ خوشی کا سبب یہ ہے کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پرداز دیدیا تھا''

(غالب کے خطوط، ص 245، 320، 224، 278)

یہ اقتباسات سند ہیں تفتہ کی تحریری شگفتگی کے۔ تفتہ کے بھی دو خطوط کا پتہ چلا ہے جن سے دونوں کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''اعلیٰ حضرت! تفتہ کا سلام قبول فرمایئے۔ بعد مزاج پرسی کے عرض خدمت والا ہے، بندہ دو یوم کول قیام کے بعد بہ خیریت سکندر آباد واپس آ گیا۔ حضور انطباع کتب کا نتیجہ کیا رہا؟ منشی جی کی خدمت میں عریضہ گذار چکا ہوں، صد حیف ابھی تک جواب سے محروم ہوں۔ ہاں صاحب منشی بالمکند بے صبر نے کیا خطا کی وہ نامۂ اقدس سے محروم رہنے کے شاکی ہیں۔ نیز حضور کے سکوت کو اپنی بدبختی اور فلک ستمگار کے جور پر محمول کرتے ہیں''۔ یکشنبہ 27 نومبر 1858

تفتہ و غالب کے تعلقات کی ایک اہم وجہ تفتہ کی روز بروز بڑھتی ہوئی شاعرانہ صلاحیت و لیاقت اور اس کی آئے دن بڑھتی ہوئی نیازمندی اور عقیدت نے دونوں کو اس حد تک ایک دوسرے سے قریب بلکہ ایک جان دو قالب کر دیا کہ ایک کو دوسرے کے بغیر چین نہیں ملتا تھا۔ اگر خط آنے میں دیر ہو رہی ہے تو غالب لکھتے ہیں:

''کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ لکھو میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں''۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

اپنے اوپر لازم کر لو ہر مہینہ میں ایک خط مجھ کو لکھنا ہے''

ایک جگہ لکھتے ہیں:

تمہارے خط کے نہ آنے سے مجھے تشویش رہتی ہے میری تشویش تم کو کیوں پسند ہے''۔

لکھتے ہیں:

''اگر اقامت یہاں کی ٹھہری تو بے تمہارے نہ رہوں گا، زنہار نہ رہوں گا، فوراً تم کو بلالوں گا جو دن زندگی کے باقی ہیں وہ باہم بسر ہوئیں۔''

بارے جہاں رہو جس طرح رہو ہر ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرو"۔

(غالب کے خطوط،ص 360، 277، 312)

میں نے غالب کے بہت سے خطوط کا مطالعہ کیا لیکن کوئی ایک مکتوب الیہ نہ ملا جس کے لیے غالب نے ایسے الفاظ اور جملے استعمال کیے ہوں۔ اسی طرح مرزا تفتہ نے بھی مختلف اشعار میں غالب سے اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے۔ دیوان دوم کے آخر میں لکھتے ہیں:

ازین جملہ برتر یکی اہل دل
خوش آزاد مردی بحق مشتغل

(ان سب سے بڑھ کر ایک اہل دل ہے جو آزاد منش ہونے کے ساتھ ساتھ حق سے وابستہ بھی ہے۔)

اسد نام غالب تخلص ہمی
ز آگہ دلیہا نہ غافل دمی

(اسد نام ہے اور غالب تخلص ہے، لمحہ بھر کے لیے بھی وہ قلبی آگہی سے غافل نہیں ہے۔)

لقب مرزا نوشہ او را دگر
و زین نام در دہر مشہورتر

(اس کا لقب مرزا نوشہ ہے اور اسی نام سے وہ دنیا میں مشہور ہے۔)

رقم ہرچہ زد اول او را نمود
ازان پس باہل جہان وانمود

(جو کچھ کہا پہلے اس کو دکھلایا اس کے بعد اہل جہاں کے سامنے پیش کیا۔)

صفاتش برون از بیان است و بس
نہ من صد چو من بی زبان است و بس

(اس کی خوبیاں بیان سے باہر ہیں، نہ صرف میں بلکہ سیکڑوں لوگ اس کا گن گاتے ہیں۔)

اگر صد دفتر از مدحش نگارم
یکی باشد یکی از صد ہزارم

(تضمین گلستان، بحوالہ تفتہ و غالب،ص 16-17)

(اس کی تعریف میں اگر سیکڑوں دفتر بھی لکھ دوں تو بھی وہ لاکھوں میں ایک ہوگا۔)

ان کے علاوہ بہت سے اشعار تفتہ نے غالب کی مدح میں لکھے ہیں مگر طوالت کی وجہ سے ان سے صرف نظر کرتا ہوں۔

جہاں تک تفتہ کی شاعری کا تعلق ہے تو تفتہ نے صرف فارسی میں شاعری کی ہے۔ اردو میں تفتہ کا صرف ایک قطعہ ملتا ہے جو انھوں نے غالب کی وفات پر کہا تھا۔ فارسی میں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور قطعہ وغیرہ تمام

> چار ضخیم دیوان کے علاوہ تضمین گلستان، سنبلستان، مخمس کریما، قصائد مدحیہ نظام جس میں نواب مردان علی خان وزیر جودھپور کی مدح میں تفتہ کے تقریباً 53 قصائد شامل ہیں جو حروف تہجی کی قید کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ نثر میں بھی تفتہ نے خلاصۃ السوانح کے نام سے ایک کتاب چھوڑی ہے جو ندوۃ العلماء لائبریری کے مخطوطات سیکشن میں محفوظ ہے، حالت بوسیدہ ہے۔

اصناف سخن میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ چار ضخیم دیوان کے علاوہ تضمین گلستان، سنبلستان، مخمس کریما، قصائد مدحیہ نظام جس میں نواب مردان علی خان وزیر جودھپور کی مدح میں تفتہ کے تقریباً 53 قصائد شامل ہیں جو حروف تہجی کی قید کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ نثر میں بھی تفتہ نے خلاصۃ السوانح کے نام سے ایک کتاب چھوڑی ہے جو ندوۃ العلماء لائبریری کے مخطوطات سیکشن میں محفوظ ہے، حالت بوسیدہ ہے۔

تفتہ کے دواوین اور مثنویوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تقریباً ہر صنف سخن میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے مگر ان میں خصوصیت سے غزل گوئی کی طرف ان کا رجحان زیادہ تھا اور وہ خود کو غزل گو کی حیثیت سے متعارف کرانے پر اصرار بھی کرتا ہے، کہتا ہے:

یار من جز سفینہ ہا نبود
کار من جز غزل سرای نیست

(میرا دوست سفینہ ہائے غزل کے سوا کوئی نہیں ہے، میرا کام غزل سرائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔)

کو ذکر خد و خال کجا تفتہ مدح و ذم
سازم فدای یک غزلت صد قصیدہ را

(کہاں محبوب کے خد و خال کا تذکرہ اور کہاں رؤسا کی مدح و ذم کا سلسلہ۔ تفتہ! تیری ایک غزل پر سیکڑوں قصیدے نچھاور ہیں۔)

تفتہ نے حافظ، سعدی، ظہوری، عرفی، طالب آملی، جلال اسیر، حزین، وحشی بافقی، محتشم کاشانی اور غالب وغیرہ تمام اہم اور مسلم اساتذہ خصوصاً ایرانی اساتذہ کی خصوصیات کی اثر پذیری کا اعتراف اپنی مثنوی سنبلستان میں کیا ہے۔ حافظ کا اسلوب، ظہوری کی شان ظہوری، عرفی کی بے نظیر سخن سنجی، طالب کی نکتہ آفرینی، جلال اسیر کے کلام کی شوکت و شوخی، حزین کی عالی دماغی، وحشی اور محتشم وغیرہ کی خوش گوئی اور آخر میں غالب کی آزاد منشی قلبی آگہی اور بیدار مغزی نے اسے بے حد متاثر کیا ہے۔ تفتہ نے ان تمام شعرا کی تقلید کی ہے اور ان کی خوبیوں کو اپنے کلام میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور سے غالب کو اپنا مرشد مان کر اس کی پیروی پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی خوبیاں بیان سے باہر اور کمالات تمام شاعروں سے برتر ہیں۔ اس پیروی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے کلام میں نرم و نازک الفاظ اور نفیس و عمدہ ترکیبیں پیدا ہوئیں اور فصاحت و بلاغت ایسی کہ قاری اور سامع کا دل باغ باغ ہو اٹھتا ہے۔ غزل عموماً سات اشعار پر مشتمل ہوتی ہے مگر تفتہ نے عام روش سے ہٹ کر چالیس چالیس اشعار پر مشتمل غزلیں کہیں ہیں۔

تفتہ نے جن اہم شاعروں کے کلام کا بغور مطالعہ کیا اور ان کی پیروی کی ہے ان میں خاص طور سے جلال اسیر سے بہت متاثر نظر آتا ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اس کا تیسرا دیوان سراسر جلال اسیر کی تقلید میں ہے۔ ہر غزل سے پہلے اس نے حاشیے میں اسیر کی غزل کا مطلع لکھا ہے اور اس کی زمین میں غزل کہی اور کہیں کہیں تو دو دو تین تین غزلیں کہیں ہیں۔ دوسرے دیوان میں بھی بہت سی غزلیں اسیر کی تقلید میں ہیں۔ اسیر کے کلام کی شان و شکوہ، شوخی و بیباکی اور سرمستی و سرخوشی یہ تین خصوصیت ایسی تھیں جس نے تفتہ کو بے حد متاثر کیا جبکہ شبلی اسے "گل و بلبل کی شاعری" اور ذبیح اللہ صفا اسے "نازک خیالی اور دقیق بیانی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

کتابیات:

1. دیوان اول مرزا ہرگوپال تفتہ
2. دیوان دوم مرزا ہرگوپال تفتہ
3. دیوان سوم مرزا ہرگوپال تفتہ
4. سنبلستان تفتہ
5. تضمین گلستان تفتہ
6. قصائد مدحیہ نظام تفتہ
7. غالب کے خطوط: مرتب خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ 1987
8. تلامذہ غالب، مالک رام مرکز تصنیف و تالیف 1957
9. تفتہ و غالب، ضیاء الدین انصاری، غالب اکادمی، نئی دہلی 1984
10. مرزا ہرگوپال تفتہ: مرتبہ پروفیسر ریحانہ خاتون، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی 2008

■

Dr. Ahmad Hasan
Dept. of Persian, Jamia Millia Islamia
New Delhi - 1100255

نقد و نگاہ

اردو ادب کے ارتقا میں ہندوستانی اکادمی الہ آباد کی خدمات

طاہرہ پروین

کسی بھی زبان کے فروغ اور اس کی توسیع کے لیے ادارے کافی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ زبان کی نشو ونما اور اس کے ارتقا کی نمائندگی بھی ان اداروں پر ہی منحصر ہے۔ اس اعتبار سے ہندوستانی اکادمی الہ آباد کا اردو ادب کے ارتقا میں خاص رول رہا ہے۔ ہندوستانی اکادمی الہ آباد اس غرض سے بھی اہم ہے کہ اس اکادمی نے دونوں زبانوں کا یکجا طور پر فروغ دینے کا بیڑہ اُٹھایا اور شاید یہ غالباً پہلی اکادمی ہے جس نے اردو اور ہندی دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کی فکر کی۔

بقول سچد انند سنہا:

''یہ اردو اور ہندی کے مصنفین کو ایک ہی نظام میں ملا کر اور ان زبانوں میں سادگی پیدا کر کے اس خلیج کو پُر کرنا چاہتی ہے۔''[1]

غرض کہ ہندوستانی اکادمی الہ آباد جیسا کہ نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اکادمی نے ہندوستانی تہذیب و تمدن، زبان و بیان رسم و رواج ان سب کو ایک رنگ میں پیش کیا ہے پھر یہ بھی کہ الہ آباد تہذیبوں کا شہر بھی رہا ہے مذہبی رسم و رواج کا شہر رہا ہے۔ تعلیم وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ مہادیوی ورما، فراق گورکھ پوری، اکبر الہ آبادی اور دوسری طرف نثر نگاروں میں پروفیسر ضامن علی صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی، ڈاکٹر تارا چندر، پنڈت گنگا ناتھ، ڈاکٹر اعجاز حسین، جیسے ادیبوں کا شہر رہا ہے اور انہی ادیبوں اور شاعروں کی سرزمین سے مشترکہ تہذیب پروان چڑھی۔ ان کے یہاں ہندی اور اردو کے ملے جلے الفاظ اور تہذیب وتمدن، تعلیم وتربیت کی ایک روشن شمع جل رہی ہے۔ اس لیے ہندوستانی اکادمی کا ایک خاص مقصد اور منصب تھا۔

شہرِ الہ آباد گنگا جمنی تہذیب کی بہترین مثال ہے بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ یہ گنگا جمنا اور سرسوتی کی ایک انجمن ہے۔ یہاں میل وملت اتحاد قومی یکجہتی کا بین ثبوت کل بھی ملتا تھا اور آج بھی ملتا ہے۔ کہیں نہ کہیں اس کا اثر ہندوستانی اکادمی پر بھی تھا اور ہے۔

ہندوستانی اکادمی ان سماجی تہذیبی اور تاریخی صورتوں کو لے کر کافی سرگرم رہی ہے اکادمی کی خوش قسمتی بھی ہے کہ اس کو چلانے والے لوگ بھی سماجی، تہذیبی اور تاریخی صورتوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ جن میں پہلا نام سر تیج بہادر سپرو کا ہے۔ جو اکادمی کے بنیاد گزاروں میں تھے جنھوں نے اس کی توسیع میں ہر طرح کا تعاون کیا اور انھیں پہلے اکادمی کا صدر ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ جیسا کہ انھوں نے اپنے ایک بیان میں مشترکہ تہذیب اور اردو ہندی کے ارتقاء کے بارے میں کہا ہے:

''میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے اگر ہندوستان میں قومی اتحاد کی بنیاد کوئی ہوسکتی ہے تو وہ مشترکہ ادب یا مشترکہ تہذیب ہے۔ اگر ایک دوسرے کو سمجھنے لگیں تو بہت کچھ اختلافات اور غلط فہمیاں، جو اس وقت ہمارے لیے باعث ننگ ہیں، دور ہوسکتی ہیں اور اس طرح ایک متحدہ ہندوستان کے خواب کی تعبیر محسوس طور پر ہمارے سامنے آسکتی ہے۔'' (ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو)

اس ہندوستانی اکادمی کی کوشش تھی کہ اردو اور ہندی دونوں زبانیں عملی طور پر بھی اپنی مشترکہ تہذیب اپنے طریقے پر اپنی نشانیاں پیش کرتی رہیں اور صرف الہ آباد نہیں بلکہ ہندوستان کی شکل انھیں دونوں زبانوں کی اتحاد کی صورت میں ترتیب پائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تاریخی، تہذیبی اور تصنیفی ادارے نہ صرف وجود میں آئے بلکہ ان اداروں نے اردو زبان وادب کے فروغ واشاعت میں اہم کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔ ان اداروں کو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے کہ ان اداروں کے ذکر کے بغیر اردو زبان وادب اور مطبوعات اسکولوں، تحریکوں کی کوئی بھی تاریخ ادھوری ہے۔

''ہندوستانی اکادمی کا قیام 29 مارچ 1927 میں قیصر باغ لکھنؤ میں عمل میں آیا۔ اور اس کا صدر مقام الہ آباد قرار پایا''[1] سر ولیم نے افتتاح کے موقع پر فرمایا:

''ہر ہندی لکھنے والے کے پیشِ نظر یہ مقصد ہونا چاہیے کہ وہ مسلمانوں کے پڑھنے کے لیے کتاب لکھ رہا ہے۔ اور اسی طرح مسلمانوں کو خیال رکھنا چاہیے کہ ان کی لکھی ہوئی کتاب ہندو پڑھیں گے۔ ممکن ہے یہ امید پوری نہ ہو لیکن میں یہ امید کرتا ہوں کہ اکادمی کے اراکین اس پر بالکل تیار رہیں گے کہ وہ کسی زبان میں فرقہ وارانہ شان پیدا نہ ہونے دیں گے۔ اور زبانوں کو ایک مخصوص جماعت کی زبان نہ ہونے دیں گے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر اردو لکھنے والے عربی جملے استعمال کریں جیسا کہ بعض پولیس کے روزنامچے لکھنے والے کچھ دن پہلے کیا کرتے تھے۔ یا ہندو مصنفین سنسکرت کے الفاظ خواہ مخواہ اپنی عبارت میں بھریں تو یہ لوگ دوہری مصیبت لا رہے ہیں۔[2]

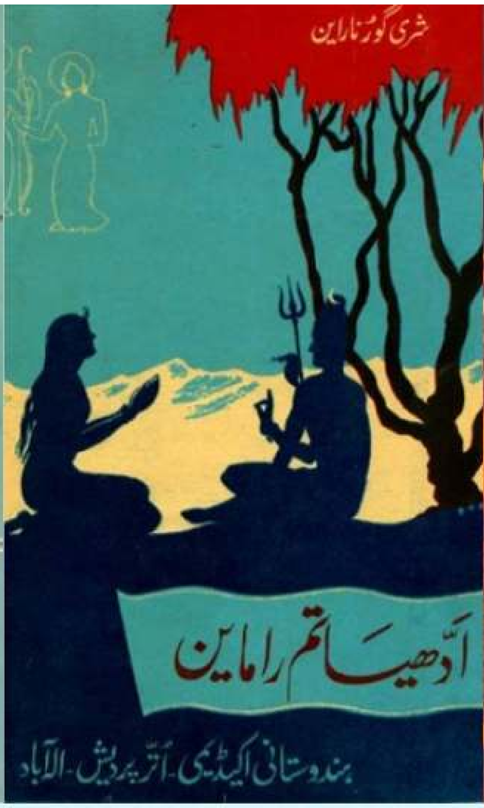

اردو کے مشہور رسالہ 'زمانہ' جس نے پریم چند کو اردو زبان میں تقریباً لکھنے کی ایک طرح کی ٹریننگ دی اور جس کے مدیر دیا نرائن نگم تھے ان کا خیال اردو ہندی زبان کے سلسلے میں اسی فکر کا حامل ہے کہتے ہیں:

''صوبۂ متحدہ آگرہ، اودھ میں ہندی اور اردو کی توسیع و ترقی کے لیے جس ہندوستانی اکادمی کے قیام ہونے کا ایک عرصہ سے غلغلہ تھا، اس کا باقاعدہ افتتاح 29مارچ 1927 کو قیصر باغ لکھنؤ میں گورنر صوبہ کے دستِ مبارک سے ہوگیا۔[3]

رام بابو سکسینہ نے بھی ہندی اور اردو دونوں کے فروغ کے لیے اور مشترکہ تہذیب کی بنیاد کو مضبوط کرنے کے لیے ہندوستانی اکادمی کی ترقی کے لیے کوشش کی۔

لکھتے ہیں:

''گورنمنٹ ممالک متحدہ نے صوبے کی کونسل کی دلچسپیوں سے مطمئن ہوکر اپنے صوبے میں ایک ہندوستانی اکادمی قائم کی ہے تاکہ اردو اور ہندی ادب کو ایک نمایاں ترقی کا موقع مل سکے۔[4]

غرض کہ اکادمی کا مقصد دونوں زبانوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لانا تھا۔ اور اکادمی کے ذریعے ہندوستانی تہذیب وتمدن کو اُجاگر کرنے کی جانب لوگوں کی دلچسپیوں کی طرف متوجہ کرنا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دونوں زبانوں میں تصنیف وتالیف عام لوگوں تک پہنچنے کا یہ اکادمی ذریعہ بن جائے۔

ہندوستانی اکادمی کا ایک تعاون یہ بھی ہے کہ اس نے کتابوں کی ترتیب وطباعت میں اہم رول انجام دیا ہے، جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ اکادمی کا مقصد ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں ادبی کتابیں تیار کرنا تھا۔ اسی غرض سے دونوں زبانوں میں کتابیں شائع بھی ہوئیں۔ اکادمی کا یہ خیال تھا کہ وہ کوئی اپنا ایک رسالہ بھی شائع کیا۔

بقول سچد انند سنہا:

'ہندوستانی' جو اردو اور ہندی کا تماہی رسالہ ہے۔ سنجیدہ مضامین پر پُر از معلومات مقالے شائع کرتا ہے۔ اور ایک بلندی علمی معیار قائم رکھتا ہے ان ٹھوس اور نمایاں خدمات کے علاوہ ہندوستانی اکادمی نے اور بھی بہت سے کام کیے ہیں...... یہ اردو اور ہندی کے مصنفین کو ایک ہی نظام میں ملا کر اور ان زبانوں میں سادگی پیدا کر کے اس خلیج کو پُر کرنا چاہتی ہے۔[5]

اکادمی کا مقصد یہ تھا اور شاید یہی ایک راستہ بھی تھا جس نے نہ صرف اردو اور ہندی زبان کو فرقہ واریت سے دور کرنے اور مذہبوں اور دلوں کو آپس میں ملا کر اچھا ادبی کام کرنے کی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی تاکہ آپسی رشتے بھی اچھے ہوں۔

ہر چند آپسی رقابتوں کو دور کرنے کی غرض سے اکادمی کی مطبوعات کو شائع کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ زبانوں کے لیے تین تین کمیٹیاں بنائی گئی۔ اردو کمیٹی کے کنویز پروفیسر سید ضامن علی، صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی اور اس کمیٹی کے ممبران میں سے سجاد حیدر یلدرم رجسٹرار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اور پروفیسر رشید احمد صدیقی مقرر ہوئے۔ منشی دیا نرائن نگم اردو کتابوں کے شائع ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

اس اکادمی کی جانب سے اردو زبان کے شعرا کے کلام کا انتخاب کرایا جارہا ہے جو بعد تکمیل یقیناً ایک مستقل کارنامہ ہوگا۔ اس انتخاب میں ابتدائی زمانے سے لے کر آخری دور تک کے تمام مشاہیر ومستند شعرا کا کلام موجود ہوگا جس کی چھ جلدیں ہوگی۔[6] ہندوستانی اکادمی نے اردو کی کتابوں کی ترتیب وتدوین میں کافی مدد کی۔ اکادمی نے جو کتابیں مُرتب کی اور شائع کی ان میں جواہرسخن کے نام سے شعرائے اردو کا ایک شاندار انتخاب بھی شامل ہے۔ جس کو مولانا محمد حسین چریا کوٹی نے مُرتب کیا۔

کتابوں کی اشاعت کی تعریف کرتے ہوئے سر عبدالقادر نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس فیصلے کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

سب سے بڑا کام جو آپ نے اپنے ذمے لیا ہے اردو اور ہندی زبان میں عمدہ اور مفید تصنیفات اور تالیف کا کام مہیا کرنا ہے۔ ترجموں کے آپ کی اس تجویز سے اتفاق ہے یورپ کے ان نئے علوم وفنون کی کتابوں کے ترجمے ہماری زبان میں کیے جائیں جنھوں نے یورپ کو اس زمانے میں عروج ترقی پر پہنچادیا ہے۔[7]

ہندوستانی اکادمی ایک لغت بھی شائع کرنا چاہتی تھی جس میں اردو اور ہندی کے روزمرہ استعمال ہونے والے الفاظ شامل ہوں۔ اس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ ایک مشترکہ زبان اور ایک مشترکہ تہذیب وجود میں آسکتی ہے۔

1938 میں ہندوستانی اکادمی نے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا بقول ڈاکٹر یونس غازی:

''اس سلسلہ کی ہر کتاب دو سوصفحات پر مشتمل ہوتی

تھی اور اس کی قیمت صرف ایک روپیہ مقرر تھی ان کتابوں کے لیے موضوع کی کوئی تخصیص نہ تھی''[8]

اکادمی کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے سید سجاد حیدر یلدرم 1939 کے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں:

''ابتدائے تاسیس سے اس وقت تک اچھی اچھی تصانیف اکادمی کی طرف سے اردو اور ہندی میں شائع ہوئی ہیں ان میں سے ایک کتاب تو ایسی ہے جو تنہا اپنی ذات سے اکادمی کے وجود کا بہترین ثمرہ ہے میرا اشارہ علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب 'عرب و ہند کے تعلقات' کی طرف ہے'' 3 سید سجاد حیدر یلدرم ہندوستانی اپریل 1938 ص:3

ہندوستانی اکادمی کا رسالہ 'ہندوستانی' اردو کے مشہور شاعر مولوی اصغر حسین (اصغر گونڈوی) کے زیر ادارت نکلنا شروع ہوا اور وہ 1936 اپنی وفات کے وقت تک یہ کام اچھی طرح سے انجام دیتے رہے ان کے بعد اس ادارت کا کام مولوی سعید انصاری نے کیا پھر ان کے بعد 1942 میں محمد رفیع الدین خاں محزوں اس کے مدیر ہوئے۔ بعد ازاں 1942 میں پیرزادہ عبدالباسط اور اُن کے بعد 1947 میں محمد رفیع فاضلی نے بخوبی ادارت کا کام انجام دیا۔

اصغر حسین (اصغر گونڈی) نے اپنے اڈیٹوریل میں لکھا ہے:

''ہندوستانی اکادمی کے اردو اور ہندی رسالوں کے لیے ایک ایسے نام کی تلاش ہوئی جو دونوں کے لیے یکساں کام دے سکے۔ اور جس طرح ہندوستانی اکادمی کا اطلاق اردو اور ہندی دونوں شعبوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے اسی طرح خیال ہوا کہ رسالوں کا نام بھی ایسا ہونا چاہیے۔''[9]

رسالہ 'ہندوستانی' میں اردو زبان کے ہر پہلو پر غور کیا جاتا تھا۔ جس میں تاریخ فلسفہ، تنقید، نظم دیگر موضوعات سے متعلق کتابوں پر تبصرے ہوتے تھے۔ تبصرہ کرنے والوں میں ڈاکٹر تاراچند، عبدالقادر سروری، اصغر گونڈوی، آصف علی، مولوی محمد رفیق لطف الدین احمد اور ریاض الحسن وغیرہ کے نام خاص ہیں۔

”
ہندوستانی اکادمی کا رسالہ 'ہندوستانی' اردو کے مشہور شاعر مولوی اصغر حسین (اصغر گونڈوی) کے زیر ادارت نکلنا شروع ہوا اور وہ 1936 اپنی وفات کے وقت تک یہ کام اچھی طرح سے انجام دیتے رہے ان کے بعد اس ادارت کا کام مولوی سعید انصاری نے کیا پھر ان کے بعد 1942 میں محمد رفیع الدین خاں محزوں اس کے مدیر ہوئے۔
“

اور ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ جن ادیبوں کے مضمون شائع ہوتے تھے انھیں معاوضہ بھی دیا جاتا تھا۔

بقول دیا نرائن نگم: ''مضامین نگار حضرات کو مضامین کا مناسب معاوضہ بھی دیا جائے گا''[10]

اس رسالے میں بہت سے اہم مضامین بھی شائع ہوئے۔

1۔ اردو املا: ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، جنوری 1931 ص1

2۔ کلیات میر حسن دہلوی: مولانا حبیب الرحمٰن، خاں شیروانی، جولائی 1931 ص 505

3۔ ظریات اردو: رشید احمد صدیقی اپریل 1931 ص 218

4۔ دہلی میں اردو شاعری کا آغاز: ڈاکٹر محی الدین قادری جولائی 1932 ص 308

5۔ مرزا رسوا کے قصے: مولوی عبدالماجد، اکتوبر 1934، ص 454

6۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کی اردو شاعری: مولوی نصیر الدین ہاشمی، اکتوبر 1934 ص 443

7۔ غالب کی اصلاح: مولوی مہیش پرشاد، جنوری 1935، ص 239

8۔ ہندوستان کا قدیم تمدن: ڈاکٹر بنی پرساد، اکتوبر 1935 ص 239

9۔ عود ہندی کی ترتیب: مولوی مہیش پرساد، اکتوبر 1935 ص 239

10۔ ادب اردو کا عملی حصہ: مولانا سیماب اکبرآبادی، جولائی 1936 ص 303

11۔ بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق: مولانا سید سلیمان ندوی، جولائی 1938 ص 233

12۔ شاہ سراج کی اردو شاعری: مولوی عبدالقادر سروری جولائی 1939 ص1

یہ صورت آزادی ہند تک تقریباً قائم رہی پھر یوپی میں جب نئی حکومت بنی تو اس کا نام بھی اتر پردیش ہوا اور یہ بھی طے ہوا کہ انگریزی کی جگہ اب زیادہ تر کام ہندی میں ہوا کرے گا۔ اور تب سے ہندوستانی اکادمی سے اردو میں خال خال اردو کی کتابیں چھپیں۔

یہاں اس مختصر سے تعارفی مضمون میں ہندوستانی اکادمی کی سب سے اہم خدمات یعنی علمی و ادبی کتابوں کی ترتیب و تدوین اور اشاعت پر خصوصی توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

”
اکادمی اپنے زمانہ عروج اور عہد شباب میں ایک بڑا علمی اور ادبی مرکز تھی۔ اور اس کے زیر اہتمام مختلف موضوعات پر علما اور دانشوروں کے لیکچر، خطبات، تقاریر و کانفرنسوں کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ 1930 سے 1938 تک کل 6 کانفرنسوں 9 خطبات اور 6 لیکچرس منعقد کیے گئے۔
“

واقعہ یہ ہے کہ اپنے مختلف الجہات علمی و ادبی عطایا اور خدمات و کارناموں کے اعتبار سے ہندوستانی اکادمی اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں ایک گراں قدر ادارے کی حیثیت رکھتی ہے ہندوستانی اکادمی کی اپنی ایک شاندار اور ثروت مند لائبریری بھی تھی جس میں ہندی کی دس ہزار، اردو کی چار ہزار، سنسکرت کی تین سو، انگریزی کی ایک ہزار اور بنگلہ اور مراٹھی کی کتابیں بھی موجود تھیں۔

اکادمی اپنے زمانہ عروج اور عہد شباب میں ایک بڑا علمی اور ادبی مرکز تھی۔ اور اس کے زیر اہتمام مختلف موضوعات پر علما اور دانشوروں کے لیکچر، خطبات، تقاریر و کانفرنسوں کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ 1930 سے 1938 تک کل 6 کانفرنسوں 9 خطبات اور 6 لیکچرس منعقد کیے گئے۔

حواشی

1۔ ڈاکٹر یونس غازی اردو ادب کے فروغ میں ہندوستانی اکادمی، الہ آباد کا حصہ ص16
2۔ اصغر گونڈوی اداریہ۔ ہندوستانی ۔ جنوری 1931 ص 156
3۔ منشی دیا نرائن نگم، اداریہ علمی خبریں رسالہ زمانہ اپریل 1927
4۔ رام بابو سکسینہ تاریخ ادب اردو ترجمہ: مرزا محمد حسن عسکری، ص 341
5۔ ڈاکٹر یونس غازی: اردو ادب کے فروغ میں ہندوستانی اکادمی الہ آباد کا حصہ، ص 169
6۔ منشی دیا نرائن نگم......'زمانہ' جولائی 1929 ص 41
7۔ سر عبدالقادر...... رسالہ ہندوستانی 1936 ص 13
8۔ ڈاکٹر یونس غازی...... اردو کے فروغ میں ہندوستانی اکادمی الہ آباد کا حصہ ص 262
9۔ اصغر حسین اداریہ رسالہ ہندوستانی، جون 1931 ص 5-3
10۔ منشی دیا نرائن نگم زمانہ فروری، 1930 ص 133

■

Dr. Tahira Parveen
1182, Old Katra, Manmohan Park
Allahabad - 211002
Email.: tahiraparveen59@gmail.com

ساجد حسین انصاری

شفاف اسلوب کا شاعر
شہریار

جدید غزل یا جدید نظم پر گفتگو کرتے وقت ہم ان شعراء کو نظر انداز نہیں کر سکتے جن کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا کیونکہ اس تحریک سے متعلق شعرا نے غزل اور نظم دونوں کو جدید اسلوب، جدید طرز احساس اور جدید موضوعات سے روشناس کرایا۔ فراق، جذبی، مجروح اور جانثار اختر کا نام غزلیہ شاعری میں لیا جا سکتا ہے تو نظم میں فیض، ن۔م۔راشد، میراجی اور اختر الایمان کا نام خاص طور پر آتا ہے ان شعراء میں ن۔م۔راشد اور میراجی کا تعلق حلقہ ارباب ذوق سے تھا جو ترقی پسندی کے مقابلے میں متوازی اسالیب کی پروردہ ادیبوں کی ایک ایسی جماعت تھی جنھوں نے داخلی کیفیات اور نفسیاتی سنجیدگیوں کو اپنی نظموں میں جگہ دی تھی۔ ان شعرا نے ترقی پسند ادب کی اجتماعیت اور منصوبہ بند شاعری سے انحراف کیا۔

حسرت موہانی کو اردو کی غزلیہ شاعری میں اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے جدید غزل کا احیاء کیا۔ حسرت موہانی کے علاوہ جگر اور فراق نے بھی جدید غزل کے گیسو سنوارنے میں بڑی محنت اور سلیقہ مندی کا ثبوت دیا۔ ترقی پسند تحریک سے متعلق شعرا جانثار اختر، جذبی اور مجروح نے اردو غزل کو ترقی پسند رجحانات سے روشناس کرایا۔ اس کے موضوعات میں تنوع پیدا کیا۔

مذکورہ شعرا بھی آزادی کے بعد کے شعری افق پر چھائے رہے لیکن ان کے علاوہ ایک نئی نسل نے نئے انداز اور نئے اسلوب کے ساتھ اردو شاعری میں اپنی جگہ بنائی۔ اس نئی نسل کے شعرا میں نوعمر شعرا جوش و جوانی اور آزادی کے جذبے کے تحت اس تحریک سے وابستہ تھے آہستہ آہستہ اس سے بیزار ہونے لگے اور نتیجتاً انفرادی جذبات اور داخلی موضوعات کو قلم بند کرنا شروع کر دیا جو ترقی پسند تحریک سے مختلف رویہ تھا۔ ان نئے شعرا کی شاعری میں ترقی پسند شاعری کا اثر نہیں تھا بلکہ ان شعرا نے دور بینی اور خود کلامی کو اپنا مقصد بنایا۔ ان شعرا میں خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، بلراج کومل، مصطفےٰ زیدی، ابن انشا، وحید اختر کے نام قابل ذکر ہیں۔ دوسری طرف وہ شعرا بھی تھے جن کی ذہنی تربیت حلقہ ارباب ذوق کے زیر اثر ہوئی ان میں منیر نیازی، مجید امجد، وزیر آغا اور ضیاء جالندھری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں قبیل کے شعراء کے علاوہ ایک بڑا حلقہ ان شعرا کا تھا جو ہر رویہ اور ہر جذبے کو اپناتے رہتے تھے۔ ان شعرا میں اختر الایمان، عمیق حنفی، زبیر رضوی، حمید الماس، محمد علوی، عادل منصوری، مخمور سعیدی، کمار پاشی، ندا فاضلی، مظہر امام، شاذ تمکنت کے علاوہ ایک اہم نام شہریار کا ہے۔

شہریار نے 1959 سے باقاعدہ شعر کہنا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک اپنا تاریخی رول ادا کر چکی تھی اور بطور تحریک تقریباً ختم ہو چکی تھی لیکن ترقی پسندانہ خیالات زندہ تھے شہریار نے اپنی شاعری پر کوئی ٹھپا یا نشان نہیں لگایا لیکن وہ ایک مدت تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اس کے بعد وہ جدیدیت تحریک سے بھی منسلک رہے لیکن ان کے اندر کا شاعر ہمیشہ کشمکش میں رہا اور ان کی تخلیقی صلاحیت ہمیشہ انھیں ذہنی آزادی کی نئی راہیں تلاش کرنے کے لیے مہمیز کرتی رہی اسی کوشش نے انھیں شخصی واردات اور ذاتی تاثرات کو پیش کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ ان کی نظمیں اور غزلیں بھی داخلیت سے مملو ہیں۔

شہریار کی تربیت ایک مذہبی خاندان میں ہوئی۔ ان کے والد محکمہ پولس میں ملازم ہونے کے باوجود صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اس لیے شہریار کے یہاں باوجود آزاد خیالی کے مذہب کا احترام ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے تعلق سے نہایت دردمندانہ انداز اختیار کیا ہے اور زندگی کے حالات اور مختلف واقعات کی بہتر ترجمانی کی ہے شہریار کے پہلے مجموعۂ کلام 'اسم اعظم' میں شامل نظموں سے ان کے تخلیقی سفر کی ابتدائی منزلوں، اس کے محرکات اور مذاق فن کے تمام زاویوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا

ہے۔ ان نظموں میں اجتماعی اور انفرادی تجربوں کی وہ داستانیں پوشیدہ ہیں جن سے عصری تہذیب اور حسیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شہریار کے یہاں اکثر وہی موضوعات ان کے قلم سے نکلے جوان کے ذہن اور زندگی پر اثر انداز ہوئے۔ زندگی سے اثر اندازی اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وہ سچے شاعر ہیں اسی لیے انھوں نے احساسات اور جذبات کی ترجمانی کی جو ان کے دل کو چھوتے اور ان کے جذبات کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کی شاعری لسانی افراط سے پاک ہے ساتھ ہی جذباتی خودمختاری میں مافی الضمیر کو ادا کرنے پر قادر بھی۔ بقول شمیم حنفی:

''شہریار کا سب سے بڑا کمال ان کی لسانی کفایت شعاری اور جذباتی خودمختاری میں مضمر ہے۔ وہ اپنی آواز کو، اپنے تجربے کو، اپنے شدید ترین ردعمل کو اور ان سب کا احاطہ کرنے والے بے حد شفاف اور شخصی اسلوب کو پل بھر کے لیے بھی بے حجاب نہیں ہونے دیتے۔ خواب اور حقیقت کی ایک ازلی اور ابدی Dialectics ایک گہرے باطنی تصادم اور پیکار کی حصار بندی میں اپنی حسیات کی تمام تر شمولیت کے ساتھ بھی شہریار اپنے تجربے کا وقار قائم رکھتے ہیں۔ اسے کبھی بے قابو نہیں ہونے دیتے۔ ایک سوچی سمجھی سطح سے اوپر نہیں جانے دیتے۔ جذبے کا اسراف اور لفظوں کا اسراف جو شہریار کے بیشتر معاصرین کے ساتھ پرچھائیں کی طرح لگا ہوا ہے، شہریار کی شاعری میں اس کی گنجائش کبھی نہیں نکلی۔''

"شہریار کا سب سے بڑا کمال ان کی لسانی کفایت شعاری اور جذباتی خودمختاری میں مضمر ہے۔ وہ اپنی آواز کو، اپنے تجربے کو، اپنے شدید ترین رد عمل کو اور ان سب کا احاطہ کرنے والے بے حد شفاف اور شخصی اسلوب کو پل بھر کے لیے بھی بے حجاب نہیں ہونے دیتے۔"

شہریار کی شاعری میں یہ وصف ان کی بنیادی سچائی کی وجہ سے پیدا ہوئی اور یہ وصف ہر اچھے شاعر کے لیے ضروری بھی ہے۔ سچائی سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی مخصوص رنگ یا کسی مخصوص مکتب خیال کے پابند نہیں رہے اور نہ ہی انھوں نے خود کو کسی دائرے میں محدود ہونے دیا بلکہ جیسے جیسے ان کی شخصیت میں تبدیلیاں پیدا ہوتی گئیں وہ ان کا اظہار کرتے رہے۔ شہریار کی شاعری کا دور ایک عبوری دور تھا جس میں اقدار کی پامالی کی وجہ سے انسان کسی بھی نظریے اور کسی خیال کا پابند نہیں ہو پاتا تھا۔

انھوں نے جہاں اپنے زمانے سے اثرات قبول کیے ہیں وہیں روایت سے بھی اپنا رشتہ برقرار رکھا ہے جس کی بدولت ان کی شاعری کو وہ خاص کیفیت بھی حاصل ہوئی جس کو ہم تغزل سے عبارت کرتے ہیں۔ بقول شمس الرحمن فاروقی:

''شہریار ہمارے زمانے کے ان چند شعرا میں سے ہیں (اور ان میں بھی ممتاز ہیں) جن کے یہاں جدید فکر ایک ایسے اسلوب میں ظاہر ہوئی ہے جو اوپر تو مختلف معلوم ہوتا ہے لیکن جس میں روایت کے تسلسل کا احساس ہے یہ روایت بہت سے دوسرے شعرا کے علی الرغم) ماضی قریب سے اتنی زیادہ منسلک نہیں جتنی اس اصل روایت سے جڑی ہوئی ہے جس کو فیشن کی تبدیلی اور مغربی فکر کو سمجھنے میں غلطی کرنے (یعنی حالی) یا مشرقی فکر کو سمجھنے میں غلطی کرنے کے باعث ہم لوگ ایک عرصے سے بھولے ہوئے تھے اسی لیے انھوں نے نظم اور غزل دونوں میں ایک ہم آہنگی بھی دریافت کرلی ہے (یہ معاملہ بہت سے جدید شعراء کو پریشان کرتا رہا ہے کہ نظم کو غزل سے مختلف رکھیں یا مماثل بنائیں، اگر مماثل بنائیں تو دونوں میں سے ایک غیر حاضر ضروری ہوجاتی ہے اور اگر مختلف رکھیں تو اس اختلاف کی بنیاد کیا ہو؟) شہریار نے مماثل یا مخالف کے بجائے ہم آہنگی کا راستہ اختیار کرکے اس مشکل کو جس طرح حل کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔''

روایت کے شعور نے ان کی شاعری میں پختگی اور تازگی پیدا کردی ہے اس کے علاوہ اس رشتے کی توسیع کا عمل بھی ان کے یہاں نظر آتا ہے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

غم زدہ وہ بھی ہیں دشوار ہے مرنا جن کو\
وہ بھی شاکی ہیں جنھیں جینے کی آسانی ہے\
اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں سبھی آخر میں\
حاصل سیر جہاں کچھ نہیں ویرانی ہے

مذکورہ بالا اشعار شہریار کے آخری مجموعہ 'شام ہونے والی ہے' سے لیے گئے ہیں۔ اس مجموعے کی بیشتر غزلیں اور نظمیں روایت پرستی اور تغزل کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان میں وہی موضوعات ہیں جو کلاسیکی شعراء کے یہاں عام طور سے ملتے ہیں۔ ان میں واردات عشق کی مختلف کیفیات ہیں اور ہر کیفیت کو نہایت سادگی اور خلوص کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ساتھ ہی زمانے کی تلخ حقیقتوں کو انتہائی مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے اسی لیے شہریار کی شاعری جدید ہونے کے باوجود قدیم شعری روایات کی پاسداری کی بدولت بے رنگ ہونے سے بچ گئی ہے اور

اس میں ایک خاص قسم کی رنگارنگی پیدا ہوگئی ہے۔ شہریار کی غزلوں کے یہی بنیادی موضوعات ہیں جن کے تعلق سے انھوں نے حیات وکائنات کے راز، دنیا کی پیچیدگی اور عصر حاضر کے انسانوں کی لامحفوظیت اور بے چہرگی کو بیان کیا ہے۔ شہریار نے زندگی سے بڑی حد تک محبت کی ہے ان کی شاعری میں جو دکھ درد کی مدھم آنچ روشن ہے، وہ دراصل دنیا سے محبت کا ہی نتیجہ ہے جس نے انھیں دنیا سے لاتعلقی اختیار کرنے سے بچائے رکھا۔ شہریار کی شاعری ان کے ذاتی تجربے کی ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے تجربوں کو اپنا کر خود اپنی ذات کا حصہ بنتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی ذات کو آئینہ بنانے کے ساتھ ساتھ دوسرے آئینوں میں بھی اپنی صورت دیکھنے کا ہنر جانتے ہیں اور اسی ہنرمندی نے انھیں اچھا اور کامیاب شاعر بنایا۔ شہریار کی شاعری میں اپنا دکھ زمانے کا دکھ اور زمانے کا درد اپنا درد ابھرتا ہے اور یہی وہ خاصیت ہے جو شہریار کو اپنے ہم عصر شعرا میں ممتاز کرتی ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری چاہے غزل کی ہو یا نظم کی جدید رجحانات کی بہترین عکاسی کرتی ہے اور غزل کے سلسلے میں تو یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے جدید غزل کو سنوارنے اور سجانے میں بڑا اہم کام کیا ہے جس طرح ترقی پسند تحریک کے زیر اثر فیض، جذبی، سردار جعفری، جاں نثار اختر اور مجروح سلطانپوری پیش پیش رہے۔ اسی طرح جدید شاعری کے اہم اور نمائندہ شعراء میں شہریار کی شاعرانہ عظمت مسلّم ہے، ان کی شاعری کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

■

Dr. Sajid Husain Ansari
Dept. of Urdu, St. Andrews, PG College
Civil Court Road, Civil Lines
Gorakhpur - 273001 (UP)

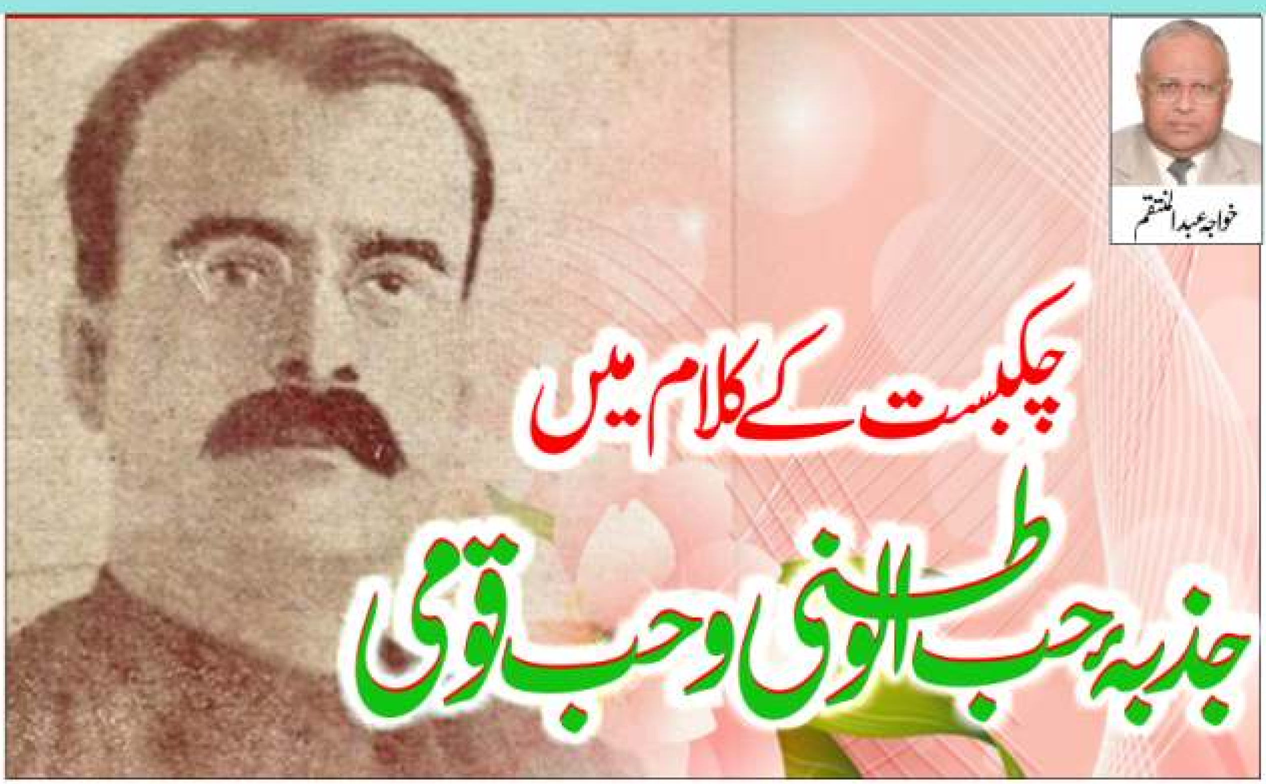

خواجہ عبدالمنتقم

چکبست کے کلام میں جذبۂ حب الوطنی و حب قومی

فدا وطن پے جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

چکبست

ہم سب اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ادب معاشرتی صورت حال کا آئینہ ہوتا ہے اور یہ عام طور پر جہات اربعہ کا احاطہ کرتا ہے یعنی رومانی، سماجی، مذہبی و حب الوطنی، خواہ وہ نظم کی شکل میں ہو یا نثر کی، حالانکہ زندگی کے ہر شعبہ میں تیزی سے ہونے والے تغیرات اور تبدیلیوں کے پیش نظر اب کسی بھی زبان کے ادب کو محض چار جہات تک محدود کرنا سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہوگا۔ جہاں تک حب الوطنی کی بات ہے ہمیں کسی بھی زبان میں کوئی بھی ایسا شاعر نہیں ملے گا جس نے کم و بیش اس جہت کو نظمیہ جامہ نہ پہنایا ہو۔ اردو ادب میں بھی ادب اور حب الوطنی کا ایک جذباتی مگر مبنی بر ہوشمندی باہمی رشتہ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں ہر دور میں اور خاص کر آزادی کے حصول کی جدوجہد میں ہمارے شعرا کے کلام نے ہمارے مجاہدین آزادی کے لیے دم کش (Inspirator) کا کام کیا ہے اور ہر دور میں ہمارے شعرا نے اپنے کلام میں حب الوطنی کو کما حقہ معقول جگہ دی ہے۔ ویسے بھی جذبۂ حب الوطنی ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک اس کے ساتھ رہتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کو تقسیم کی کسی رسمی کارروائی کے بغیر ہو بہو منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو عروج تک تو پہنچ سکتا ہے مگر اس کا زوال نہ صرف ناممکن بلکہ بعید از قیاس ہے۔ یہ جذبہ دائمی ہے نہ کہ عارضی یا وقتی۔ یہ کل بھی تھا، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔

غالباً انگریزی کا یہ مقولہ کہ خدا کو وہ لوگ زیادہ عزیز ہوتے ہیں جو اس دنیا سے جلد رخصت ہو جاتے ہیں (God loves those who die young) چکبست جیسی مثالی شخصیتوں کے لیے ہی وجود میں آیا تھا۔ جب کسی بچہ کی یا کسی شخص کی نو عمری میں موت ہو جاتی ہے تو اس وقت اکثر یہ شعر پڑھا جاتا ہے:

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

مگر جب غنچہ پوری طرح کھل جائے، 44 سال کھلا رہے، اس پر پہلے پھول پھر پھل آنے لگیں، وہ ایک مکمل درخت کی شکل اختیار کر لے، اس پر کتنی ہی بہاریں گذر جائیں، اس کی خوشبو ہر آنگن تک رسائی کے لیے رواں دواں ہو اور وہ اچانک ہم سے جدا ہو کر ابدی نیند سو جائے تو پھر ثاقب لکھنوی کا یہ شعر ہی پڑھا جائے گا:

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

پنڈت برج نرائن چکبست کی شکل میں یہ پھلدار درخت صرف 44 سال کی عمر میں اردو ادب کو بہت کچھ دے کر اور بہت کچھ سے محروم کر کے، ہم سب ہندوستانیوں کو حب الوطنی و حب قومی کا سبق دے کر داغ مفارقت دے گیا۔ اُسے ابھی طبعی و ادبی زندگی کی کئی منازل سے گزرنا تھا اور اپنی زندگی کی دوسری اور تیسری اننگز میں اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے 'ادبی اولمپکس' میں سونے کا تمغہ حاصل کرنا تھا مگر وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

چکبست کا شمار کشمیری پس منظر والے ان اہلیان قلم، ادبا و شعرا میں ہوتا ہے جن کی اردو ادب کی مختلف اصناف میں قابل قدر حصہ داری رہی ہے۔ رتن ناتھ سرشار اور دیا شنکر نسیم کے ساتھ ساتھ ان کا نام آج بھی دیگر محسنان اردو کی طرح نہایت عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے مگر افسوس کہ اس عظیم شاعر کو اپنی کم عمر ہونے کے باعث حیثیت سر بفلک یا وہ ممکنہ حیثیت، جو وہ حاصل کر سکتا تھا، نہ حاصل ہو سکی یا یوں کہیے کہ وہ اردو ادب کی اس بعید ترین حد تک نہیں پہنچ سکا جہاں تک وہ پہنچ سکتا تھا۔ چکبست نے علامہ اقبال کی طرح اپنے کلام میں رومانی شاعری سے کسی حد تک کنارہ کشی کرتے ہوئے نیشنلزم یعنی جذبۂ قومیت اور مغربی افکار کو اس طرح اپنے کلام کا حصہ بنایا کہ اپنے ادب کے تئیں پیار و محبت میں کمی نہ آنے پائے۔ سر تیج بہادر سپرو نے بھی چکبست اور اقبال کا موازنہ کرتے ہوئے یہ لکھا تھا:

”پنڈت برج نرائن چکبست کی شکل میں یہ پھلدار درخت صرف 44سال کی عمر میں اردو ادب کو بہت کچھ دے کر اور بہت کچھ سے محروم کرکے، ہم سب ہندوستانیوں کو حب الوطنی و حب قومی کا سبق دے کر داغ مفارقت دے گیا۔ اُسے ابھی طبیعی و ادبی زندگی کی کئی منازل سے گزرنا تھااوراپنی زندگی کی دوسری اور تیسری اننگز میں‌اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ’ادبی اولمپکس‘ میں سونے کا تمغہ حاصل کرنا تھامگر وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔“

”یہ اقبال اور چکبست کی انگریزی ادب کے تئیں کسی حد تک خوش ذوقی کا ہی نتیجہ ہے کہ انھوں نے ہمیں انگریزی ادب کے اعلیٰ ترین حصے سے بطریق احسن باور کرایا اور وہ بھی اس طرح کہ اپنے ادب کے تئیں پیار ومحبت میں کمی نہ آنے پائے۔“

آیئے اس سے پہلے کہ ہم چکبست کے کلام میں حب الوطنی وحب قومی کی بات کریں اردو کے کچھ دیگر شعرا کے کلام میں حب الوطنی وحب قومی کے جذبہ اوران امور کا مختصراً جائزہ لیتے ہیں جن کا انھوں نے احاطہ کیا ہے:

کیا میر تقی میر نے دہلی کے گلی کوچوں کو اوراق مصور نہیں کہا؟ کیا ذوق نے کون جائے دلی کی گلیاں چھوڑ کر جیسی بات کہہ کر اپنے وطن عزیز کے تئیں محبت کا اظہار نہیں کیا؟ کیا مرزا غالب نے اپنے شعر’رنگ لالہ وگل و نسریں جدا جدا، رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے‘ میں گنگا جمنی تہذیب اورملی جلی ثقافت یعنی کثرت میں وحدت کی بات نہیں کی؟ کیا علامہ اقبال نے ’سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا‘ جیسا پیارا ترانہ ہمیں نہیں دیا؟ کیا مجاز نے ’مکۂ تعلیم‘ علیگڑھ کی شام وشب کو بالترتیب شام مصروشب شیراز نہیں کہا؟ کیا ساحر نے ’اب کوئی گلشن نہ اجڑے اب وطن آزاد ہے، روح گنگا کی ہمالیہ کا بدن آزاد ہے کہہ کر اپنی حب الوطنی کا ثبوت نہیں دیا؟ کیا فیض احمد فیض نے ’نثار میں تری گلیوں کے اے وطن‘ الفاظ کے ذریعہ اپنے جذبۂ حب الوطنی اورحریت خواہی کا اظہار نہیں کیا؟ کون سا ایسا وطن پرست ہوگا جس میں کیفی اعظمی کے شعر’کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیوں اب تمہارے حوالے وطن ساتھیوں‘ کو پڑھ کر جذبۂ قربانی نہ پیدا ہو؟ کیا اختر شیرانی کے یہ الفاظ’وہ باغ وطن فردوس وطن، وہ سرو وطن ریحان وطن محتاج وضاحت ہیں؟

کیا رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری کے شعر’اے خاکِ وطن تونے بنایا ہم کو، کچھ ہم بھی بنائیں تیرے بگڑے ہوئے کام‘ میں نہاں ملک کے تئیں محبت، جذبۂ احسان مندی اوراحساس ذمہ داری آج بھی ہم سب کے لیے مشعل راہ نہیں؟ کیا راہی معصوم رضا کا شعر’ہم تو ہیں پردیس میں دیس میں نکلا ہوگا چاند، اپنی رات کی چھت پر کتنا تنہا ہوگا چاند‘وطن سے دوری کے درد کا مظہر نہیں؟ کیا شکیل بدایونی کا شعر’انصاف کی ڈگر پہ بچوں دکھاؤ چل کے، یہ دیش ہے تمہارا نیتا تم ہی ہو کل کے‘ وطن کے حوالے سے بچوں کے لیے سبق آموز اور ان کے روشن مستقبل کا امین نہیں؟ کیا مجروح سلطانپوری کا شعر’دشمن کی دوستی ہے اب اہل وطن کے ساتھ‘ ہمیں کسی ملک مخالف سازش سے باور نہیں کراتا؟ کیا ندا فاضلی کے یہ الفاظ’جدا جدا ہیں دھرم علاقے ایک سی لیکن زنجیریں ہیں‘ قومی یکجہتی کی جانب راست اشارہ نہیں؟

کیا سمپورن سنگھ کالڑا گلزار کا شعر’اے میرے پیارے وطن اے میرے بچھڑے چمن تجھ پہ دل قربان، تو ہی میری آرزو تو ہی میری آبرو تو ہی میری جان‘وطن پرستی کا اظہار نہیں؟ پنڈت آنند نرائن زتشی گلزار دہلوی کا یہ شعر ’ہم روز نئے ملک بنا سکتے ہیں،تہذیب کی تقسیم نہیں ہوسکتی‘ اگرایک جانب ان کے دل میں تقسیم ہند کا درداور گنگا جمنی تہذیب کی جانب اشارہ ہے تو دوسری جانب یہ ہماری تاریخ کا ایک ایسا قابل مطالعہ ورق ہے جو قارئین کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوسکتا۔ کیا مخدوم محی الدین کے شعر’حیات لے چلو کائنات لے کے چلو‘،’چلو تو سارے زمانے کوساتھ لے کے چلو‘ سے فرد کی عظمت ،قوم کے اتحاد اور ملک کی سالمیت کو یقینی بنانے والی اخوت کا اشارہ نہیں ملتا؟ کیا کلیم عاجز کا شعر’اپنا لہو بھر کر لوگوں کو بانٹ گئے پیالے لوگ‘،’دنیا بھر کو یاد رہیں گے ہم جیسے دیوانے لوگ‘ خدمت خلق اورملک کے لیے کی گئی قربانی کی جانب اشارہ نہیں؟

کیا جاوید اختر کا یہ نظمیہ نعرۂ حب قومی ہم سب کے دل کی دھڑکن نہیں؟

جاگے ہیں اب سارے لوگ تیرے دیکھو وطن
گونجے ہیں نعروں سے اب یہ زمیں اور یہ گگن
کل تک میں تنہا تھا سوتے تھے سب رستے
کل تک میں تنہا تھا پر اب ہیں ساتھ میرے
لاکھوں دلوں کی دھڑکن

آیئے اب ہم اپنے اصل موضوع ’چکبست کی شاعری میں جذبۂ حب الوطنی‘ کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

چکبست نے اپنے کلام میں مندرجہ موضوعات کا احاطہ کیا ہے:

”آبروئے وطن، ناموس وطن، آب جوئے گلشن، آبروئے قوم، سہاگ قوم، قوم کی شیرازہ بندی وخانماں بربادی، وطن و اہلیان وطن کی شکستہ حالی، طوق غلامی، لازمیت اسیری، دورضبط،حکمران وقت کی ستم ایجادی، نئی طرز جفا،قلب دشمن کی سیاہی، آزادی کی تڑپ، فغان درد دل، رنگ بے کسی، رنگِ جنوں، کوئل کے دردانگیز نالے، شہیدوں کی داستان خونچکاں، رہبران قوم وعوام کی داستان ایثاروقربانی، قومی یکجہتی کی خواہش دلخواہ، کبھی شیدائے حرم وفدائے صنم کی حد درجہ قربت والفت تو کبھی خلش خار تعصب، کبھی اذان کا نعرۂ دلکش تو کبھی نغمۂ ناقوس کی نغمگی، بے مائیگی دل، دوستوں کی بے وفائی، تہذیب نو، بے حجابانہ نگاہیں،حسن حیا پہ زور، خدمت انساں، عالم اسیری میں اپنی صدائے محرومی، لرزتی ہوئی زمین، بہتے ہوئے خون کے دریا،شہید یاس وغیرہ۔

چکبست کا یہ بھی کہنا ہے:

مٹی ہیں گل جو اور کسی بوستاں کے ہیں
کانٹے عزیز گلشن ہندوستاں کے ہیں

اس شعر کا جذبہ یقینی طور پر ہر محب وطن ہندوستانی کے جذبہ حب الوطنی کی عکاسی کرتا ہے مگر پہلے مصرعہ کے بارے میں اپنی سوچ میں تھوڑی سی تبدیلی لانی ہوگی۔ آج انسانی حقوق کو آفاقی حیثیت حاصل ہوچکی ہے اوراس گلوبل ولیج میں ہر ملک ایک دوسرے کا پڑوسی ہے اور ہر ملک اور ہر چمن میں کھلنے والا پھول ہم سب کا ہے۔ اس لیے اب ہم کسی دیگر ملک کے پھول کو محض مٹی کہہ کراس کی اہمیت کم نہیں کرسکتے۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں گلشن ہند کے کانٹے بھی اتنے ہی عزیز ہیں جتنے اس کے پھول۔

چکبست نے جن مندرجہ بالا موضوعات کا احاطہ کیا ہے وہ نہ صرف ان کے جذبہ حب الوطنی کی حقیقی عکاسی کرتے ہیں بلکہ یہ ایک ایسی مثالی ادبی تخلیق ہے جس

کے لیے محبان اردو، محبان ادب ومحبان وطن ان کے ہمیشہ مرہون منت رہیں گے اور ہمیشہ یہ جاپ جپتے رہیں گے' کاش قلم کے اس سپاہی کو جنگ خامہ فرسائی میں مزید سرگرم ہونے کے لیے ایک لمبی عمر نصیب ہوتی!'

آیئے اب ان امور سے متعلق چکبست کی نظموں، غزلوں، مرثیوں ونوحہ جات سے منتخب باموقع اشعار معتبر قابل اعتماد تائیدی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں:

خاک وطن (1905)

'خاک وطن' عنوان کے تحت چکبست کے کلام میں شامل نظم کا درج ذیل شعر صرف شاعر کے جذبات کی عکاسی ہی نہیں بلکہ برطانوی دور حکومت میں ہر ہندوستانی کے اندر جذبۂ حب الوطنی اور آزادی کی چاہ کا مظہر ہے:

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

اسی نظم کے ایک دیگر شعر کا یہ مصرعہ 'اے صور حب قومی اس خواب سے جگادے' ہر ہندوستانی میں اُس دور غلامی میں جذبۂ حریت پیدا کرنے کے لیے کافی تھا اور چکبست کی یہ دعا قبول بھی ہوئی مگر افسوس وہ اپنی آنکھوں سے اپنی زندگی میں آزادی کے دلکش مناظر نہیں دیکھ سکے لیکن ہندو مذہب کے پیرو ہوتے ہوئے اور تصور پنرجنم (احیائے نو یا Resurrection) میں یقین رکھنے کے سبب وہ کہیں نہ کہیں لالہ وگل کی شکل میں نمایاں ہوکر ان مناظر کو ضرور دیکھتے رہے ہوں گے۔ اس نظم میں انھوں نے اس ملک کو سب کا ملک بتایا ہے۔ انھوں نے جہاں ایک طرف رانا پرتاپ کی بہادری کی بات کی ہے تو وہیں اکبر کی اعتدال پسندی اور فراخ دلی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس معبد کہن کو گوتم کے ذریعہ آبرو دینے کی بات بھی کہی ہے۔ اگر ایک جانب 'ناقوس کی فغاں' کی بات کہی ہے تو دوسری جانب 'کیفیت اذان' کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔

چکبست نے اس نظم میں دور غلامی میں ہندوستانیوں کی بے کسی سے متاثر ہوکر ہندوستان کے علم وکمال وایمان کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان کو ایک نعش بے کفن بتایا ہے۔ کاش آج اگر وہ زندہ ہوتے تو یقینی طور پر انگریزی اخبار 'ٹائمز آف انڈیا مورخہ 24-8-2016 ودیگر اخبارات میں شائع ہونے والی 'نیو ورلڈ ویلتھ' کی اُس رپورٹ کو چوم لیتے جس میں ملکیت جائیداد پر مبنی معیار کے مطابق کی گئی تحقیق کی بنیاد پر ہندوستان کا شمار دنیا کے سب سے مالدار 10 ممالک میں ہوتا ہے۔ اس فہرست میں ہندوستان کا نمبر ساتواں ہے۔

خاک وطن سے دیگر اشعار:

شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہر دانش اس وادیٔ کہن میں
گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش اب تک کیفیت اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک
علم و کمال و ایماں برباد ہورہے ہیں
عیش وطرب کے بندے غفلت میں سورہے ہیں
اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

فریادقوم (1914)

چکبست کی اس نظم کو اگر عصری سیاسی وسماجی زبوں حالی کی حقیقی منظرکشی اور اہلیان وطن کی داستان غم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ فریاد کسی فرد واحد کی نہیں بلکہ اس پوری قوم کی ہے جس پر انگریز حکومت کررہے تھے اور پوری قوم اپنے اختیارات سے محروم تھی۔ یہاں قوم سے مراد کوئی فرقہ، طبقہ یا گروپ نہیں بلکہ اس میں ملک کے تمام باشندے شامل ہیں۔ چکبست نے یہ نظم اس زمانے میں لکھی تھی جب مہاتما گاندھی جنوبی افریقہ میں دور افتادگان وطن کے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے وہاں تشریف لے گئے تھے جبکہ خود ہندوستان میں بھی عوام کو انگریزی غلامی کے باعث تشویشناک صورت حال کا سامنا تھا۔ اس نظم میں چکبست نے اہل ہنود اور اہل اسلام دونوں کو ہی للکارا ہے۔ جہاں ایک جانب ہندوؤں کو ہوشیار رہنے او بھنور، اندھیری رات، کالی گھٹا اور منجھدار سے باہر آنے کی بات کہی ہے تو دوسری جانب انھوں نے اہل اسلام کو بھی اپنے جوہر دکھانے کی دعوت دی ہے۔ جہاں ایک طرف اجڑے گھروں کے صحرا میں نماز پڑھنے کی بات کی ہے تو دوسری طرف اپنے لہو کی گنگا میں نہانے کی جانب اشارہ کیا ہے اور ان دونوں فرقوں کی توجہ وقار قوم کی محرومی کی جانب مبذول کرائی ہے اور انھیں یہ باور کرایا ہے کہ ایسی صورت حال میں انھیں ایک ذمہ دار قوم کا رول ادا کرنا چاہیے۔

سنیں تو ملک کے ہمدرد قوم کے دلساز
ہوا کے ساتھ یہ آتی ہے دکھ بھری آواز
وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ کرلینا
اِدھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی
ہوئے ہیں نذر مصیبت کے دین و ایماں بھی
پڑھی نماز تو اجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کی گنگا میں
اگر دلوں میں نہیں اب بھی جوش غیرت کا
تو پڑھ دو فاتحہ قومی وقار و عزت کا
وفا کو پھونک دو ماتم کرو محبت کا
جنازہ لے کے چلو قوم و دین و ملت کا
بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ہوشیار
اندھیری رات کالی گھٹا ہے اور منجھدار
دکھا دو جوہر اسلام اے مسلمانو!
وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو
جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو
نبی کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شان حمیت کے یادگار ہو تم
فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

قوم کے سورماؤں کو الوداع

یہ نظم براہ راست ہندوستان کی جنگ آزادی سے متعلق تو نہیں لیکن اس سے ہمارے ملک کے سپاہیوں کے جانباز اور اپنے حکمرانوں کے تئیں وفادار ہونے کا اشارہ ضرور ملتا ہے۔ ہر ذمہ دار اور فرض شناس شخص کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان فرائض منصبی کو صدق دلی اور ایمانداری سے انجام دے جو اسے اس کے آجر یا حکمراں نے سونپے ہوں۔ اس نظم میں ان ہندوستانی سپاہیوں کے نام شاعر کا پیغام ہے جو پہلی جنگ عظیم میں حصہ لینے کے لیے روانہ ہورہے ہیں۔

ساحل ہند سے جرار وطن جاتے ہیں
کچھ نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوئے شمشیر وکفن جاتے ہیں
تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں
ہاں دلیران وطن دھاک بٹھاکر آنا
طنطنہ جرمن خودبیں کا مٹاکر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلاکر آنا

ندیاں خون کی برلن میں بہاکر آنا
یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لیے
مادرِ قوم کا ہے اپنے سپوتوں سے پیام
خطۂ ہند کا اس جنگ میں روشن رہے نام

'آوازۂ قوم' (1916)، ہم ہونگے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا (1916) اور 'وطن کا راگ' (1917)
(ہوم رول کی وکالت)

چکبست کی تین نظموں 'آوازۂ قوم'، 'ہم ہونگے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا' اور 'وطن کا راگ') میں ہوم رول یعنی اپنی حکومت قائم ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ غالباً انھوں نے یہ نظمیں انڈین ہوم رول لیگ کے قیام سے متاثر ہو کر لکھی تھیں۔ انڈین ہوم رول لیگ برصغیر کی ایک ایسی قومی سیاسی تنظیم کی شکل میں ابھر کر آئی تھی جو ہندوستان میں ہندوستانیوں کے ذریعہ بااختیار ہندوستانی حکومت کے قیام کی حامی تھی۔ یہ لیگ اینی بسنت (Annie Besant)، محمد علی جناح اور بال گنگا دھر تلک نے مل کر قائم کی تھی۔ اینی بسنت ایک معروف انگریز Theosophist (بلا واسطہ خدا کی معرفت بذریعہ وجدان میں یقین رکھنے والی شخصیت)، جہد کار حقوقِ انسانی، مصنفہ، مقرر اور محبِّ وطن بھارتی خاتون تھیں۔

چکبست نے متذکرہ بالا ہوم رول کے نظریے کو نظمیہ جامہ پہنا کر قوم کی اس خواہش دلخواہ کی جانب واضح اشارہ کیا ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی بااختیار مملکت قائم ہونی چاہیے جس کا انتظام وانصرام صرف ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہو اور اس میں انگریزوں و برطانوی حکومت کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ انھوں نے اپنی اس نظمیہ تخلیق میں صاف صاف یہ بات کہی ہے کہ 'وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے'، 'نہ کوئی مرغ خوش الحال اسیر دام رہے'۔ اظہار خیال کی آزادی پر اس دور میں جو قدغن لگا ہوا تھا اس کے بارے میں ان کا کہنا ہے۔

زباں ہے بند قلم کو پہنائی ہے زنجیر
بیان درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر
ہے دل میں درد مگر طاقت کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

آزادی کی چاہ کا درج ذیل شعر سے بڑا دستاویزی ثبوت کیا ہوگا:

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے
چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے

آوازۂ قوم (1916)

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے
ہوائے شوق میں غنچے بکس * نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے
جو اپنے حال پہ یہ بے کسی برستی ہے
یہ نابان حکومت کی خود پرستی ہے

*غنچے کا کھلنا

اسی کے مست کہیں ہیں حرم پہ چھائے ہوئے
اذاں کے نعرۂ دلکش سے حظ اٹھائے ہوئے
کہیں ہے نغمۂ ناقوس دل لبھائے ہوئے
نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے

وطن کا راگ (1917)

زمین ہند کی رتبہ میں عرشِ اعلیٰ ہے
یہ ہوم رول کی امید کا اجالا ہے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے
وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے
ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اسے بنائیں گے
ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
زباں کو بند کیا ہے یہ غافلوں کو ہے ناز
ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز
رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز وگداز
چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے
یہی پیام ہے کوئل کا باغ کے اندر
اسی ہوامیں ہے گنگا کا زور آٹھ پہر
ہلال عید نے دی ہے یہی دلوں کو خبر
پکارتا ہے ہمالہ سے ابر اٹھ اٹھ کر
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

حب قومی

چکبست کی یہ نظم بھی جذبۂ حب الوطنی سے شرابور ہے۔ انھوں نے اس نظم میں دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ کثرت میں وحدت کے تصور کی جانب اشارہ کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جو لطف کثرت الوجود میں ہے وہ اپنی ایک اینٹ کی عمارت بنانے میں نہیں۔

اس نظم کے ہر ہر لفظ سے اس جذبے کا اظہار ہوتا ہے کہ ملک کا ہر شہری پیار و محبت، ہمدردی والفت اور ملک کی ترقی کا نہ صرف خواہاں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ اس میں دیوانگی کی حد تک یہ جذبہ کسی نے کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ یقینی طور پر اس دور کی یہ صورت حال اور یہ جذبہ نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ قابل رشک بھی ہے۔

جو ہے وہ قومی ترقی کے لیے دیوانہ ہے
لطف یکتائی میں جو ہے وہ دوئی میں ہے کہاں
درفشاں ہے ہر زباں حب وطن کے وصف میں
جوش زن ہر سمت بحر ہمت مردانہ ہے
جمع ہیں قومی ترقی کے لیے ارباب قوم
رشک فردوس ان کے قدموں سے یہ شادی خانہ ہے

مرثیہ گوپال کرشن گوکھلے

'مرثیہ گوپال کرشن گوکھلے' محض کسی فرد واحد کی موت کا مرثیہ ہی نہیں بلکہ یہ مرثیہ ہے اس دور کی سیاسی و سماجی صورت حال کا، ایک عظیم ترین حب الوطن انسان کی جدائی کا، قوم ہند کے سر سے تاج گرنے کا، حبیب قوم کے اس دنیا سے اچانک رخصت ہوجانے کا، غربا کے گھر کے چراغ اور ایک روشن دماغ شخصیت کی جدائی کا، افق پہ قوم کے ایک ستارے کے ٹوٹ جانے کا اور ایک ایسے شخص کی موت کا جس کی موت پر اس کا دشمن یا رقیب بھی غم زدہ ہے:

حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا
جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

وطن کی جان پہ کیا کیا تباہیاں آئیں
امنڈ امنڈ کے جہالت کی بدلیاں آئیں
اس انتشار میں جس نور کا سہارا تھا
افق پہ قوم کے وہ ایک ہی ستارا تھا
وطن کی خاک تری بارگاہ اعلیٰ ہے
ہمیں یہی نئی مسجد نیا شوالا ہے
جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

بال گنگا دھر تلک

چکبست نے نہ صرف گوپال کرشن گوکھلے کی وفات پر ہندوستان اور ہندوستان کی عوام کو ہونے والے ناقابل تلافی نقصان کا نوحہ قلم بند کیا ہے بلکہ انھوں نے بال گنگا دھر تلک و دیگر اہم شخصیات کے انتقال پر بھی نوحہ جات لکھے ہیں اور ان میں سے ہر نوحہ میں صریحی طور پر یا اشارتاً ملک کی صورت حال اور متوفیان کی حب الوطنی کو اپنے مخصوص انداز میں نظمیہ جامہ پہنایا ہے۔

اٹھ گیا دولتِ ناموسِ وطن کا وارث
قوم مرحوم کے اعزاز کہن کا وارث
جاں نثار ازلی شیرِ دکن کا وارث
پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث
تھا نگہبانِ وطن دبدبۂ عام ترا
نہ ڈگیں پاؤں یہ تھا قوم کو پیغام ترا
زندگی تیری بہارِ چمنستانِ وفا
آبرو تیرے لیے قوم سے پیمانِ وفا
ہوگئی نذرِ وطن ہستی فانی تیری
نہ تو پیری رہی تیری نہ جوانی تیری
شور ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہیے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی

غزلیات میں حب الوطنی کی جھلک

ہم مضمون ھٰذا کے بالائی حصے میں ان امور کا ذکر کر چکے ہیں جن کا چکبست نے اپنی نظمیہ تخلیقات میں احاطہ کیا ہے۔ مختلف غزلیات میں سے بھی کچھ ایسے اشعار چنے گئے ہیں جن میں حب الوطنی وحب قومی کی خوشبو ہم تک پہنچتی ہے۔

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے
حکم مالی کا یہ ہے پھول نہ ہنسنے پائیں
چپ رہے باغ میں کوئل اگر آزاد رہے
باغ میں لے کے جنم ہم نے اسیری جھیلی
ہم سے اچھے رہے جنگل میں جو آزاد رہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے
یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اس کے ساقی ہیں
شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

—

اسیر ضبط ہو کر تنگ ہے منہ میں زباں اپنی
رگ گردن سے نکلی ہے لہو بن کر فغاں اپنی

—

انھیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے
امیدیں مل گئیں مٹی میں دورِ ضبط آخر ہے
صدائے غیب بتلا دے ہمیں حکم خدا کیا ہے

—

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

—

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا
ابھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائیگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا
محبت ہے مجھے کوئل کے درد انگیز نالوں سے
چمن میں جا کے میں پھولوں کا شیدا ہو نہیں سکتا

—

زباں تک لا نہیں سکتا ہوں شکوے بے وفائی کے
جلا دی دل کو میرے قلب دشمن کی سیاہی نے

—

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا
اگر دم بھر بھی مٹ جاتی خلش خار تمنا کی
دل حسرت طلب کو اپنی ہستی سے گلا ہوتا
زباں کے زور پر ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

—

نو گرفتار بلا ہوں کچھ کہا جاتا نہیں
نالہ کرنا بھی مجھے اے ہم نشیں آتا نہیں
دوستی میں اپنا اپنا حق ادا کرتے رہے
وہ جفا کرتے رہے اور ہم وفا کرتے رہے

—

یہ انقلاب ہوا عالم اسیری میں
قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

—

کچھ ایسا پاس غیرت اٹھ گیا اس عہد پُر فن میں
کہ زیور ہوگیا طوق غلامی اپنی گردن میں
شجر سکتے میں ہیں خاموش ہیں بلبل نشیمن میں
سدھارا قافلہ پھولوں کا سناٹا ہے گلشن میں
یہاں تسبیح کا حلقہ وہاں زنار کا پھندا
اسیری لازمی ہے مذہب شیخ و برہمن میں
وطن کی خاک سے مرکر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

—

باغباں نے یہ انوکھا ستم ایجاد کیا
آشیاں پھونک کے پانی کو بہت یاد کیا
در زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

—

آئے تھے جس چمن سے وہ برباد ہوگیا
اب ہم قفس میں یاد کریں کیا بہار کو
ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو

—

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بیکار ہے
طرز ہندو دیکھ کر رنگ مسلماں دیکھ کر
دیدنی ہے بے خودی وارفتگان شوق کی
ہنس رہے ہیں خود بخود چاک گریباں دیکھ کر
انتشار قوم سے جاتی رہی تسکین قلب
نیند رخصت ہوگئی خواب پریشاں دیکھ کر

—

شاد ہیں ناشاد ہیں یا خانماں برباد ہیں
ہم سے اچھے ہیں کہ یہ وحش و طیور آزاد ہیں

یاد کشمیر و یاد ماضی

جو شخص بھی ایک جگہ سے ہجرت کر کے دوسری جگہ چلا جاتا ہے وہ زندگی بھر اس مقام کو جہاں سے اُس نے ہجرت کی ہے، کبھی نہیں بھول پاتا اور اس کی شیریں و تلخ یادیں اس کے ذہن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ چونکہ چکبست کے بزرگ بھی کشمیر سے آکر یوپی میں بس گئے تھے اس لیے وہ بھی اپنے بزرگوں اور اپنی کشمیر سے وابستہ یادوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے کشمیر، حسن کشمیر، اقدار کشمیر و کشمیریت کو اس طرح نظمیہ جامہ پہنایا کہ قاری کبھی

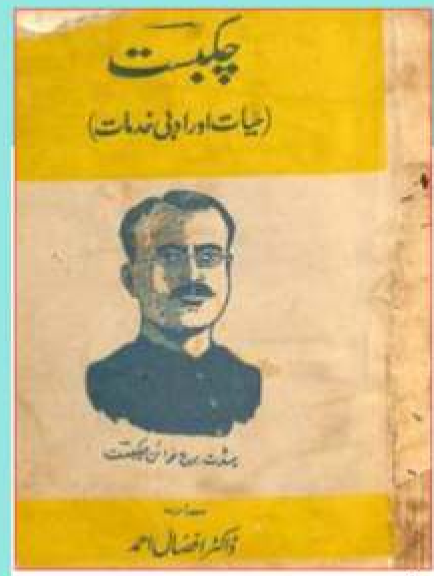

یہ محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ آج کے کشمیر اور اس کے حسن کی بالیدگی کا نقشہ کھینچ رہے ہوں۔ آخر وہ کشمیر کے لوگوں، ان کی مہمان نوازی و رواداری، ڈل جھیل، تیرتے شکارے، ولر جھیل کی کشادگی، چشمہ شاہی کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی، وہاں سے مہارانی کے محل کا نظارہ، شنکراچاریہ مندر میں کئی کلو میٹر کی چڑھائی کے بعد عقیدت مندوں کی حاضری، حضرت بل، شالیمار باغ کی خاموش فضا، پر رونق نشاط باغ، پہلگام کے خوبصورت مناظر، گل مرگ کا وسیع میدان، سون مرگ کی برف پوش پہاڑیاں، ڈکسم مرگ کی خاموش فضا، شوپیاں کا کشمیری محلّہ، اہربل کے تیز بہاؤ والے جھرنے کا دلکش نظارہ، ٹن مرگ، بابا رشی کا مزار، سیبوں کے شہر سوپور، پلوامہ، بارہمولہ، اننت ناگ جیسے شہروں اور سب سے بڑھ کر زعفران کی خوشبو اور جنت نظیر اس خطۂ ارض سے وابستہ یادوں کو انسان بھلا بھی کس طرح سکتا ہے۔

وہ طائرِ کہسار لبِ چشمۂ کہسار
وہ سرد ہوا وہ گرم ابرِ گہربار
وہ میوہ خوش رنگ وہ سرسبز چمن زار
اک آن میں صحت ہو جو برسوں کا ہو بیمار
یہ باغِ وطن روکشِ گلزار جہاں ہے
سرمایۂ نازِ چمن آرائے جہاں ہے
ہے خطہ سرسبز میں اک نور کا عالم
ہر شاخ و شجر پر شجرِ طور کا عالم
میووں سے گراں بار وہ اشجار کے ڈالے
بکھرے ہوئے وہ دامنِ کہسار پہ لالے
اڑتے ہوئے بالائے ہوا برف کے جھالے
دیکھے جو کوئی دور سے ہیں روئی کے گالے
وہ ابر کے ٹکڑوں کا تماشہ شجروں میں
جھرنوں کی صدائیں وہ پہاڑوں کے دروں میں
عالم نے شرف جن کی بزرگی کا ہے مانا
اٹھے تھے اسی خاک سے وہ عالم و دانا
تن جن کا ہے پیوند اب اس پاک زمیں کا
رگ رگ میں ہماری ہے رواں خون انھیں کا
ہاں میں بھی ہوں بلبل اُسی شاداب چمن کا
ہے چشمۂ فردوس یہ عالم ہے دہن کا
کس طرح نہ سرسبز ہو گلزار سخن کا
ہے رنگ طبیعت میں چمن زار وطن کا
تازے ہیں مضامیں بھی طبیعت بھی ہری ہے
ہاں گلشن قومی کی ہوا سر میں بھری ہے

جو شخص بھی ایک جگہ سے ہجرت کرکے دوسری جگہ چلاجاتا ہے وہ زندگی بھر اس مقام کو جہاں سے اُس نے ہجرت کی ہے کبھی نہیں بھول پاتا اور اس کی شیریں وتلخ یادیں اس کے ذہن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجاتی ہیں۔ چونکہ چکبست کے بزرگ بھی کشمیر سے آکر یو پی میں بس گئے تھے اس لیے وہ بھی اپنے بزرگوں اور اپنی کشمیر سے وابستہ یادوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے کشمیر، حسن کشمیر، اقدار کشمیر و کشمیریت کو اس طرح نظمیہ جامہ پہنایا کہ قاری کبھی کبھی یہ محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ آج کے کشمیر اور اس کے حسن کی بالیدگی کا نقشہ کھینچ رہے ہوں۔

بچوں کے نام پیغام حب الوطنی

کسی بھی ملک کا مستقبل اُس ملک کے بچوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے چونکہ یہی بچے بڑے ہوکر ملک کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی کا یہ قدیم مقولہ 'Child is the father of man' آج بھی اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے جتنا یہ اپنے وجود میں آنے کے وقت رہا ہوگا۔ چکبست نے اسی جذبے کو اپنی دو نظموں 'ہمارا وطن دل سے پیارا وطن (1916)' اور 'وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک (1916)' میں سموتے ہوئے بچوں کو بڑی آسان زبان میں وطن پرستی کا پیغام دیا ہے:

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن (1916)

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن
محبت کی آنکھوں کا تارا وطن
اسی سے ہے اس زندگی کی بہار
وطن کی محبت ہو یا ماں کا پیار
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک (1916)

یہ پیاری انجمن ہم کو مبارک
یہ الفت کا چمن ہم کو مبارک
یہاں کی خاک ہم کو کیمیا ہے
یہ سونے سے بھی قیمت میں سوا ہے
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

گائے

چکبست کو ہر وطن پرست انسان کی طرح نہ صرف ملک سے بلکہ اس کی ہر مخلوق سے محبت تھی۔ چکبست نے اپنی اس نظم میں گائے کی معصومیت کا اتنے خوبصورت انداز اور الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے کہ اس نظم کو پڑھنے کے بعد یقینی طور پر قاری کے دل پر اس کی موہنی صورت نقش ہوجائے:

تو وہ مخلوق ہے خلقت میں نہیں جس کی گناہ
لی ہے قالب میں ترے روح محبت نے پناہ
تیری صورت سے عیاں ہوتی ہے انسان کی چاہ
رس بھری آنکھ سموئی ہوئی امرت میں نگاہ
نقش ہے دل پہ مرے موہنی صورت تیری
خوب دنیا کے شوالے میں ہے مورت تیری
تن سے تیرے ہے عیاں نرمیِ دل کا جوہر
جوڑ بند ایسے کہ سانچے میں بنے ہیں ڈھل کر
رنگ کالا ہو کہ اجلا ہو یہ کہتی ہے نظر
بندرابن کی وہ ہے شام یہ متھرا کی سحر
کنگرے سے یہ نہیں چہرۂ نورانی پر
تاج قدرت نے سجا ہے تری پیشانی پر
صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں
چشمۂ فیضِ خدا مردِ خدا کہتے ہیں
درد مندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں
ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں
مثل بچوں کے ترے دودھ کے ہیں متوالے
جو ضعیفی سے پڑے رہتے ہیں بستر ڈالے
مست رہتے ہیں ترے فیض کس بل والے
پیار سے کہتے ہیں 'ماتا' تجھے بچے بالے

Khwaja Abdul Muntaqim
H-3, Dharma Apartments,
2-I.P. Extn., Delhi-110092

'جھنڈا گیت' کے خالق شیام لال گپت

کرشن بھاوک

سنسکرت زبان کے کوی بھو بھوتی نے لکھا تھا کہ ''کبھی کہیں (مستقبل میں) مجھ جیسے ہی معیار کا کوئی برابری کا مصنف پیدا ہوگا، کیونکہ وقت بے معیاد ہے اور زمین لامحدود''۔

یہ حقیقت ہے کہ عظیم فنکاروں اور ادیبوں کی قدر ان کے مرنے کے بعد ہوتی ہے۔ تقریباً یہی بات شری شیام لال گپت پارشد کی شاعری (کاویہ)، بالخصوص ان کے لکھے 'جھنڈا گیت' پر بھی صادق آتی ہے۔

سوانحی کوائف

اگرچہ 'جھنڈا گیت' کی تخلیق سنہ 1924 میں ہو چکی تھی، تاہم اس کے سات سال گزر جانے کے بعد بھی سنہ 1931 میں گوروکل کانگڑی کے پنڈت نردیو شاستری نے آگرہ کے ہفتہ وار اخبار 'آریہ مترٗ' میں شائع اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ ''جھنڈا گیت' تو آج سارا راشٹر گا رہا ہے، لیکن یہ کیسے پتا چلے کہ اس کا مصنف کون ہے؟'' اس سوال کے جواب میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے عالم و فاضل پروفیسر رام داس جی گوڑ نے روزانہ اخبار 'آج' میں یہ واضح کیا تھا کہ ''میں 'جھنڈا گیت' کے مصنف سے بخوبی واقف ہوں۔ ان کا نام شیام لال گپت پارشد ہے اور وہ کانپور جن پد (صوبہ، ضلع) کے نرول گرام (موضع، گاؤں) کے واسی (باشندے) ہیں۔''

(ہندی کتاب 'جھنڈا اونچا رہے ہمارا'، مؤلف پنڈت سوہن لال دویدی، نیشنل پبلشنگ ہاؤس، اجمیری گیٹ، دہلی، اول ایڈیشن سنہ 1972، ڈاکٹر برج لال ورما، مضمون 'جھنڈا گیت کے گائک''، صفحہ 51)

جب پنڈت جواہر لعل نہرو جی سنہ 1931 میں پارشد جی کے ہی گاؤں نرول پدھارے تھے، تب پارشد جی نے ان کے خیر مقدم میں ایک گیت بھی سنایا تھا، تبھی انھوں نے سرعام یہ اعلان بھی کر ڈالا تھا کہ ''پارشد جی کو بھلے ہی لوگ نہ جانیں، ان کے 'جھنڈا گیت' کو تو پورا ملک جانتا ہے۔''

(ہندی کتاب 'جھنڈا اونچا رہے ہمارا'، مؤلف پنڈت سوہن لال دویدی، نیشنل پبلشنگ ہاؤس، اجمیری گیٹ، دہلی، اول ایڈیشن سنہ 1972 اور اس صفحہ 6 اور ڈاکٹر برج لال ورما کا مضمون 'جھنڈا گیت کے گائک' صفحہ 52)

شری شیام لال گپت پارشد کی پیدائش سنوت 1953 (سنہ 1896) بھادر پد شکل کی چوتھی تاریخ کو کانپور موضع میں نرول نام کے گاؤں میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام شری وشویشور پرساد اور والدہ کا نام کوشلیا دیوی تھا۔ سنہ 1911 میں انھوں نے اسی موضع (گاؤں) سے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا اور بعد ازاں الہ آباد کے ہندی ادارے (مدرسے) سے 'وشارد' کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ اس سال جب انھوں نے ہری گیتیکا، سوَیا، گھنا کشری وغیرہ ہندی کی مشہور و مقبول عام بحروں میں شری رامائن کے 'بال کانڈ' کو منظوم کیا، تو تمام لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ انھوں نے ان دو سطور میں بھگتی (عبادت) اور مذہب کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کیا تھا:

چاہوں کرپا یہی تم سوں، متی میری بھٹکتی ہی ماہی سنی رہے
سووت جاگت ہی نسی باسر، مو متی دھرم ماہیں بنی رہے

جب لوگوں نے ان کے والد کو ڈرایا کہ اگر ان کا یہ فرزند اسی طرح ادب تخلیق کرتا رہا، تو اس کے کان اور ناک کاٹ ڈالے جائیں گے، تو ان کے خوف زدہ والد نے ان کے تخلیق شدہ سارے 'بال کانڈ' کو ایک کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پارشد جی اس واقعے کے بعد بھی چھپ کر حسب سابق ہندی کویتائیں رچتے رہے۔ ہندی ادب کے ایک دیگر بلند پایہ ادیب شری جے شنکر پرساد جی کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ دونوں ہی ویش ذات و خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جے شنکر پرساد جی کے والد تو انھیں اپنے نسلی کاروبار میں لگانے اور اپنے قرض کو اتارنے کے خواہاں تھے، جبکہ پارشد جی کے والد ان کی ادبی رغبت و شغف سے از حد متنفر تھے۔ پرساد اور پارشد جی دونوں کو ہی چوری چھپے ہندی ادب کی تشکیل کرنی پڑی تھی۔

ڈاکٹر برج لال ورما نے لکھا ہے کہ انھیں دنوں کانپور سے مشہور و معروف مجاہد آزادی، ہندی صحافی شری گنیش شنکر ودیارتھی نے سنہ 1912 میں 'پرتاپ' نام سے جاری کیا۔ پارشد جی کی نظمیں اس اخبار میں متواتر شائع ہونے لگی تھیں۔ روزی کمانے کے لیے انھوں نے پرانے کانپور پرائمری اسکول میں بطور مدرس نوکری کر لی تھی۔ جب یہ 'عام تربیت' (نارمل ٹریننگ) کی غرض سے لکھنؤ گئے، تب وہاں نوکری کے لیے تین سالوں تک کا ایک بانڈ بھرنے کی شرط سے ان کی انا اور خودداری کو کچھ ایسی ضرب لگی کہ انھوں نے نوکری سے ہی استعفیٰ دے ڈالا۔ اس کے بعد پارشد جی کانپور میں ہی دوسر ویش انٹر کالج کی بنیاد رکھ کر اسی میں مشغول ہو گئے۔ یہی کالج آگے چل کر بہت ترقی کر گیا تھا۔ مہاتما گاندھی جی کی پکار پر یہ سیاست میں بھی فعال کارکن ہو گئے اور انھوں نے اپنا علاقہ فتح پور ضلع (صوبہ) کو بہت غور و خوض کے بعد منتخب کیا اور آگے چل کر ضلع کانگریس کے نگران و منتظم بھی بنے۔ سنہ 1921 میں عدم تعاون تحریک (Non-cooperation Movement) میں پہلی دفعہ قیدی ہوئے۔ تین سال بعد انھوں نے ایک طنزیہ نظم تخلیق کی، جس کی پاداش میں قید کے ساتھ چار سو روپے کا جرمانہ بھی بھرنا پڑا تھا۔ سنہ 1930 اور 1940 میں بھی جیل کی ہوا کھانے کے بعد یہ سنہ 1932 اور 1940 میں مفرور کے طور پر زندگی بسر کرتے رہے۔ زیادہ شہرت تو راجرشی پرشوتم داس ٹنڈن کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے بعد ہی ملی۔ یہ رابطہ انھیں الہ آباد میں منعقد کانگریس کے سمیلن میں پنڈت سوہن لال دویدی کے توسط سے ہوا تھا۔ شری گنیش شنکر جی ودیارتھی کے بارہا تنبیہ کرنے اور ٹنڈن جی کے اصرار پر ہی انھوں نے 'جھنڈا گیت' کی تخلیق کی تھی۔ سنہ 1924 میں لکھے اس گیت میں زبان کی سلاست، حلاوت نے بہت جلد پورے ہندوستان میں مقبول ہو گیا۔ اسی سال کانگریس نے بمبئی میں اپنے جنرل ہاؤس کی میٹنگ کے اجلاس میں اس گیت کو قومی گان کے طور پر منظور کیا تھا۔ اس گیت کے اہم محرک پنڈت گنیش شنکر ودیارتھی تھے اور اس کی تدوین راج رشی پرشوتم داس جی ٹنڈن نے کی تھی۔ سنہ 1924 میں جلیاں والا باغ کے بلیدان کے دن یعنی 13 اپریل کو کانپور میں اس قومی گیت کو پنڈت جواہر لعل نہرو نے بھی گایا تھا۔

ہندی کتاب 'جھنڈا اونچا رہے ہمارا' کے اداریے (سنپادکیہ) میں پنڈت سوہن لال دویدی نے ان سبھی معلومات کے علاوہ یہ بھی بالخصوص رقم کیا تھا کہ اگرچہ پارشد جی کی کویتاؤں میں فنی بلندی دستیاب نہیں ہوتی ہے، تاہم عوام کے جس قومی جذبے کو اجاگر کرنے کے لیے اس گیت کی تخلیق ہوئی تھی، اس کے لیے اس سے زیادہ شعری اسلوب وفن کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ اسی راشٹریہ گان یا گیت نے نہ جانے کتنے لوگوں کو آزادی کے لیے سرگرم کر دیا تھا۔

پنڈت نہرو جی کا تبصرہ :

کہتے ہیں کہ سنہ 1941 میں جب دہلی میں کانگریس کا ایک اجلاس منعقد ہوا تب، 'جھنڈا گیت' کا چرچا ہونے پر پنڈت جواہر لعل جی نہرو نے اس گیت کی پہلی سطر پر ہی اپنا اعتراض ظاہر کرتے ہوئے پارشد جی سے کہا تھا۔

''کیا 'وجئی وشو' کی بات کرتے ہو؟''

اس پر پرُشوتم داس جی سے مکالمہ کرتے ہوئے پارشد جی نے صفائی میں یہ کہا تھا کہ 'وجئی وشو' الفاظ سے میری مراد 'دنیا میں جیتنے والا' کے معنی ہیں، نہ کہ 'دنیا کو جیتنے والا' کے مفہوم میں'' ٹنڈن جی نے ان کی اس تشریح سے اتفاق ظاہر کیا تھا۔ اس کے بعد جب انھوں نے جا کر پنڈت نہرو جی سے اس معنی کی وضاحت کی، تب وہ بھی ان سے متفق ہو گئے تھے۔

(ایضاً، رام سیوک لال شری واستو کا پارشد جی کے ساتھ مشافیہ ص 62)

پینشن اور خودی

ہندی ادب میں عالم فاضل اور طنزیہ ناول نگار پانڈے بیچن شرما اُگر نہایت سخت مزاج کے ادیب و نقاد تسلیم کیے جاتے تھے، لیکن انھوں نے بھی شیام لال جی گپت پارشد کے بارے میں یہ الفاظ رقم کیے تھے کہ ''اگر پارشد جی دوسرے ملک میں پیدا ہوئے ہوتے، تو چاندی ان کے آنگن میں برستی، اعزاز و اکرام ان کے قدموں میں لوٹتے، لیکن یہ احسان فراموش سرکار پارشد جی کی یاد تک نہیں کرتی ہے۔'' ان کے اس مضمون کا کچھ ایسا ردِعمل ہوا کہ اتر پردیش سرکار نے بلا تاخیر پارشد جی کو پینشن دینا شروع کر دیا تھا۔''

(ایضاً، مضمون ''جھنڈا گیت کے گائک''، ڈاکٹر برج لال ورما، ص 55)

شری رام سیوک شری واستو کے ساتھ ایک مصاحبے میں پنڈت نہرو جی کے ساتھ ایک مختصر ملاقات کے ضمن میں پارشد جی نے بتایا تھا کہ ''سنہ 1949 میں میں دہلی کے لال قلعے سے پیدل ہی راشٹرپتی بھون کی طرف جا رہا تھا۔ لال قلعے سے کچھ ہی دور آگے پہنچا تھا کہ پیچھے سے آ کر ایک موٹر رک گئی، نہرو جی اس میں سے اتر کر آئے اور مجھ سے بولے۔ ''پارشد جی! کیسے ہو؟ آؤ، میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہوں۔ پر موٹر میں نہیں بیٹھوں گا۔''

رام سیوک شری واستو نے پارشد جی کے ساتھ اسی مشافیے (مصاحبے) کے آخر میں ان کا یہ اعتراف بھی یوں رقم کیا تھا'' کچھ مہینوں کے بعد پنڈت سوہن لال دویدی میرے یہاں آئے اور کہا کہ میں ان کے ساتھ دہلی چلوں، وہ میری پینشن بڑھوا دیں گے۔ میں نے کہا'' نا بابا نا! پینشن تو بڑھ جائے گی، لیکن پھر نہرو جی مجھے دیکھ کر موٹر نہیں روکیں گے۔ میری بیٹی نے بھی یہی کہا اور میں نہیں گیا۔''

(ایضاً رام سیوک شری واستو ''پارشد جی سے ایک ساکشکار (مشافیہ)''، ص 64)

اس سے قبل بھی نوکری کا تین سالہ بانڈ نہ بھر کر پارشد جی نے اپنی انانیت اور خودداری کا ثبوت فراہم کیا تھا۔

'جھنڈا گیت' کی تخلیق

رام سیوک لال شری واستو کو پارشد جی نے ہی بتایا تھا کہ سنہ 1923 میں وہ فتح پور ضلع کانگریس کے نگران کی صورت میں سرگرم تھے۔ سالانہ اجلاس میں صاحب صدر کے طور پر پنڈت موتی لال نہرو کو باعزت مدعو کیا گیا تھا اور انھوں نے اس کام کو بخوبی سرانجام بھی دیا تھا۔ دوسرے دن ان کو بمبئی جا کر وہاں بھی ویسی ہی صدارت کرنے کے لیے ایک تار ارسال کر کے مدعو کر لیا گیا تھا۔ اس لیے وہ پہلے کی طرح صدارت نہ کر سکے تھے۔ آگے پارشد جی نے ہی بتایا کہ انھوں نے پنڈت گنیش شنکر ودیارتھی سے صدارت کرنے کی التجا کی، جسے انھوں نے بادلِ نخواستہ ہی قبول کیا اور انھوں نے ایسی بغاوتی تقریر کی، کہ گرفتار کر لیے گئے اور مقدمہ چلا کر انھیں ایک سال کی سزا دے دی گئی تھی۔

پارشد جی کو متواتر یہی لگتا رہا ان کی اس سزا کے ذمے وار وہ خود تھے۔ ان کے یہ الفاظ کہ'' جیل سے رہا ہونے کے بعد آ کر انھوں نے مجھ (پارشد) سے کہا کہ ''ہمارے پاس کوئی جھنڈا گیت نہیں ہے۔ تم کیوں نہیں لکھ دیتے؟'' یہ بات سنہ 1924 کی تھی۔ کئی دنوں تک وہ ٹالتے بھی رہے۔ اس پر انھوں نے ان سے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ ''بہت گھمنڈ ہو گیا ہے کیا؟ وعدہ کرو کہ کل صبح تک ہر حالت میں گیت بنا کر دے دو گے۔''

رات بھر میں بہت ہی فکرمند رہا کہ جس شخص کو میری وجہ سے ایک سال تک جیل میں رہنا پڑا، اس کا مطالبہ میں پورا نہیں کر پا رہا ہوں۔ لہٰذا رات کے آخری پہر ایک کے بجائے دو گیتوں کی رچنا کر ڈالی۔ پہلا گیت تو یہی 'جھنڈا گیت' تھا اور دوسرا گیت ''راشٹر گان کی دویہ جیوتی، راشٹریہ پتاکا، نمو نمو!'' والی سطر کا تھا۔''

آگے ان کے الفاظ تھے کہ'' صبح آنکھ کھلی تو دروازے پر ڈاکٹر جی۔جی جوگ، گنگا سہائے چوبے اور حمید علی موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کو گنیش شنکر ودیارتھی جی نے گیت لانے کے لیے ان کے پاس بھیجا تھا۔ بعد میں جب 'جھنڈا اونچا رہے' والا گیت پرُشوتم داس ٹنڈن جی کو دکھایا گیا تب انھوں نے کہا کہ یہ گیت کچھ بڑا ہو گیا ہے۔ لہٰذا ''لال رنگ بجرنگ بلی کا'' اور ''اس چرکھے کا چتر سنوارا'' والے یہ دو پد نکال دو۔''

میں نے ان کی بات مان لی اور یہ گیت منظور ہو گیا اور اس کے بعد جگہ جگہ گایا جانے لگا۔''

کل ہند کانگریس کمیٹی کی جانب سے پنڈت اُما شنکر دیکشت جی نے بمبئی سے پارشد جی کو 'جھنڈا گیت' کی منظوری تار سے ارسال کی تھی۔ آگے چل کر وہ ایک مرکزی وزیر بھی بنے تھے۔ سنہ 1924 میں کانپور میں ضلع کانفرنس میں پنڈت جواہر لال نہرو، جمنا لال بجاج اور شنکر لال بینکر وغیرہ موجود تھے۔ پارشد جی نے جھنڈا گیت سنایا تو لوگ مسحور اور مبہوت رہ گئے۔ بعد میں جمنا لال بجاج نے انعام کے طور پر پارشد جی کو 250 روپے دیے تھے، ہندی کے مقبولِ عام کوی جگن ناتھ داس رتنا کر نے 101 روپے اور کان پور کے سیٹھ لالہ پھول چند جین نے 501 روپے بطور انعام عنایت کیے تھے۔

اس قومی گیت کی تخلیق ہوئے آج تقریباً نوے سال سے بھی کچھ زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور آج کی نئی نسل کے نوجوان تو کیا، بہت سے بڑے بوڑھے بھی اس گیت اور اس کے عظیم خالق سے انجان ہیں۔ کاش بچوں کے قاعدوں میں اس گیت کو شامل کیا جاتا، تا کہ ملک کے اس قومی گیت اور اس مصنف شری شیام لال جی گپت پارشد کے تئیں فخر ہو سکے۔ ان کا درجہ کسی شہیدِ وطن سے کم تر نہیں ہے۔

شیام لال گپت پارشد کا جھنڈا گیت

1. جھنڈا گیت:

''وجئی وشو ترنگا پیارا / جھنڈا اونچا رہے ہمارا!

''سدا شکتی برسانے والا / ویروں کو ہرشانے والا
پریم سُدھا برسانے والا / ماترِ بھومی کا تن من سارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا!''

''اس جھنڈے کے نیچے نربھے / ہو وے مہاشکتی کا سنچے
بولو بھارت ماتا کی جے / سبل راشٹر ہے دھیئے ہمارا!
جھنڈا اونچا رہے ہمارا!''

''آؤ پیارے ویرو آؤ! / دیش دھرم پر بلی بلی جاؤ
ایک ساتھ سب مل کر گاؤ / پیارا بھارت دیش ہمارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا!''

''اس کی شان نہ جانے پائے / چاہے جان بھلے ہی جائے
وشو وجے کر کے دکھلائے
تب ہووے پرن پورن ہمارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا!''

■

Dr. Krishan Bhavuk
Kothi No.: 201-A, Lane No.: 18-A
Gurunanak Nagar
Patiala - 147003 (Punjab)

عبدالرحمن

سرور کی قومی و وطنی شاعری

مخصوص تہذیب اور محدود زاویۂ نگاہ کی بنا پر کسی زبان میں اعلیٰ ادب تخلیق نہیں کیا جاسکتا۔ ادب آفاقیت سے قبل مقامیت سے عبارت ہے لہٰذا مخصوص تہذیب اور محدود زاویۂ نگاہ کی بنا پر کسی ادب میں آفاقیت کی تلاش بے معنی ہے۔ آفاقی ادب مشترکہ تہذیب (Composite Culture) کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب کی شاندار تہذیب ہمیشہ سے اس طرح کے باہمی اختلاط اور آپسی رواداری کا پیش خیمہ رہی ہے۔ اردو زبان اپنے ابتدائی دور سے ہی کسی ایک مخصوص مکتبۂ فکر یا کسی ایک خاص تہذیبی روایت سے سروکار نہیں رکھتی۔ مختلف مذاہب کے پیروکار شعرا اور ادبا ماسوا ذاتی معاملات کے سیاسی، سماجی اور مذہبی خیالات پیش کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اس زبان کا سہارا لیتے رہے ہیں۔ زبان کی یہ روایت اتنی مستحکم اور پائیدار ہے کہ شاعروں نے اپنے مذہبی رہنماؤں اور دانشوروں کے علاوہ مختلف مذاہب کے رہنماؤں اور دانشوروں کو اس زبان میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے میں خود کو کبھی عاجز محسوس نہیں کیا۔ اردو زبان میں جہاں ایک طرف مختلف مذہبی پیشواؤں کی شان میں قصیدے لکھے گئے اور مذاہب کی تبلیغ واشاعت اس زبان میں کی گئی، وہیں دوسری طرف مارکسی خیالات ونظریات کی تشہیر میں بھی اس زبان نے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ سیکولرزم کی جو صحت مند روایت اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ملتی ہے، بنگالی ادب کو چھوڑ دیں تو اس کی مثال ہندوستان کی ایسی کسی اور دوسری بڑی زبان میں شاذ و نادر ہی دیکھنے کو مل سکتی ہے۔ جس وقت ہندوستانی اقوام باطل انگریز قوم سے برسر پیکار تھی تو 'انقلاب زندہ باد' کا پرشکوہ نعرہ اسی زبان کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ سیکڑوں شعرا نے اس زبان میں وطن اور قوم سے متعلق گیت لکھ کر حب الوطنی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اردو زبان میں قلی قطب شاہ، نظیر اکبرآبادی، اقبال، جوش ملیح آبادی اور پنڈت برج نرائن چکبست کے علاوہ جن شعرا نے وطن سے متعلق جذبے کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے ان میں سرور جہان آبادی کا نام سرفہرست ہے۔

اردو شاعری میں وطن سے متعلق اشعار سب سے پہلے قلی قطب شاہ کے یہاں ملتے ہیں۔ قلی قطب شاہ نے اپنی نظموں میں ہندوستانی پھلوں، پھولوں اور رسم وعقائد کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ نظیر نے قلی قطب شاہ کی اس روایت کی توسیع کی۔ نظیر کو اپنے ماحول سے نہایت لگاؤ تھا۔ انھوں نے بلا امتیاز ملت و مذہب ہندوستان کے تمام تہواروں اور رسم ورواج کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ ان کی نظموں میں ہندوستان ہنستا، کھیلتا اور اٹکھیلیاں کرتا نظر آتا ہے۔ مختصر یوں کہا جاسکتا ہے کہ نظیر کی شاعری میں قدیم ہندوستان اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

نظیر کے بعد سرور جہان آبادی کے یہاں حب الوطنی کا جذبہ نسبتاً زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ انھوں نے نظم کی تعمیر و ترقی میں ہندوستانی عناصر کو شامل کرنے جیسا اہم اور نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ ان کے مجموعۂ کلام میں نظموں کے علاوہ رباعیات بھی شامل ہیں جو ہمیں ہندوستانی رنگ میں رنگی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ نظمیں اور رباعیات ہندوستان کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، تاریخی اور تہذیبی

نظریات کی ترجمان و عکاس ہیں۔ سرور کی نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے عہد کا ہندوستان سیاسی، سماجی اور اقتصادی بحران کا شکار تھا۔ ملک ایسے موڑ پر کھڑا تھا جہاں حب الوطنی کے جذبے کو ابھارنے کی اشد ضرورت تھی، سرور نے یہ کارنامہ بحسن خوبی انجام دیا۔

سرور کو وطن اور وطن کی ہر شے سے دلی وابستگی ہے۔ نظیر نے اپنی نظموں میں جو ہندوستان پیش کیا تھا سرور کی شاعری میں ایسا ہی ہندوستان ایک بار پھر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہمارے روبرو دکھائی پڑتا ہے۔ ان کے کلام میں ہر جانب ہندوستان کی تصویر بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی نظریں ہندوستان کو دلہن کے روپ میں دیکھتی ہیں۔ ان کی پوری شاعری میں ہندوستان پر شباب برستا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے ہر شے کی تصویر اتنی عمدگی سے پیش کی ہے کہ اس کی مثال بعد کے شعرا میں جوش کے سوا کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتی۔ نسیم سحر کا یہ بند ملاحظہ کیجیے:

گھونگھٹ الٹ الٹ کے رخ نازنیں سے تو
کرتی ہے چھیڑ سلسلۂ عنبریں سے تو
ہونے کو ہمکنار گل و یاسمیں سے تو
چلتی ہے بس کے عطر میں خلد بریں سے تو
یوں دھیمی دھیمی آتی ہے تاروں کی چھاؤں میں
مہندی لگا کے جیسے چلے کوئی پاؤں میں

سرور کے یہاں حب الوطنی عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ انھیں وطن کے ذرّے ذرّے سے بے تحاشہ لگاؤ ہے۔ ان کے نزدیک وطن کبھی دیوی ہے تو کبھی وطن میں انھیں ماں کا روپ دکھائی دیتا ہے۔ کچھ جگہوں پر وطن کو لکشمی، درگا اور سرسوتی بھی کہا گیا ہے۔ غرض وطن کی محبت ان کے دل کے نہاں خانوں میں گہرائی سے رچی اور بسی ہوئی ہے۔ مادر ہند کا یہ بند ملاحظہ فرمائیے۔

تیرا دیواستھان دیوی دل کے کاشانے میں ہے
تیری تصویر مقدس ہر صنم خانے میں ہے
لکشمی تو ہے زمانے میں اُجالا ہے تیرا
ہر کنول کا پھول پانی میں شوالا ہے تیرا
سرسوتی کا روپ ہے درگا کا ہے اوتار تو
نطق و دانش کی ہے دیوی مادر غم خوار تو
اُف یہ سندر چھب تری، یہ سانولی صورت تری
دل کے مندر کی ہے زینت موہنی صورت تری

وطن سے متعلق سرور نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں موضوعات کی وسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ دلکشی اور رعنائی کی جھلک بھی ملتی ہے۔ سرور کے ذریعے اردو شاعری میں پہلے پہل ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی جو اردو شاعری کے لیے بالکل نئے اور اچھوتے تھے۔ گنگا، جمنا، پریاگ کا سنگم، نور جہاں، پدمنی، بیر بہوٹی، گل فردوس، لکشمی جی، سیتا جی کی گریہ وزاری، پھولوں کا کنج، مہارجہ دشرتھ کی بیقراری، نسیم سحر، فضائے برشگال، عروس برشگال، شفق شام بھنورے کی بیقراری جیسے مضامین کو اردو میں سب سے پہلے متعارف کرانے کا سہرا سرور کے سر ہے۔ متقدمین شعرائے اردو نے اس سے قبل اس طرح کے موضوعات سے کبھی استفادہ نہیں کیا تھا۔ ان موضوعات کی اہم بات یہ ہے کہ ان سے متعلق نظموں کی فضا اور رنگ خالص ہندوستانی ہے۔

گنگا جمنا پر لکھی نظموں میں سرور نے قدیم ہندوستانی روایت کو بروئے کار لاتے ہوئے چھیڑ چھاڑ اور عشق و عاشقی کے پیرائے میں وطن سے اپنی محبت اور انسیت کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح کی شاعری میں بعض جگہ جمال پرستی کے ساتھ ساتھ جنسیت کا دھوکا ہوتا ہے۔ شاعر نے اپنے محبوب کے پیکر اور سراپا کا ذکر کرتے ہوئے اسے برج کی پاکدامن اور مقدس نازنین جیسے القاب سے خطاب کیا ہے اور اس کی جادوئی روش کو حسینوں سے بھی زیادہ البیلی روش قرار دیا ہے۔ جمنا کے تقدس اور پاکدامنی کا بیان بھی اسی بند میں کیا گیا ہے۔ یہاں لفظوں کا تضاد بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔

آہ! او رنگیں ادا او دلی والی نازنیں
او دو عالم کے حسینوں سے نرالی نازنیں
دھیمی دھیمی وہ تری رفتار بل کھائی ہوئی
وہ نظر جھینپی ہوئی چتون وہ شرمائی ہوئی
وہ حسینوں سے نرالی تیری البیلی روش
دل پہ جادو کرنے والی تیری البیلی روش

”
حب الوطنی ایسا جذبہ ہے جو تقریباً ہر ذی روح میں پایا جاتا ہے۔ وطن کی محبت میں انسان بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتا ہے۔ سرور کا وطن ان کا پرستش کدہ ہے۔ ان کی شاعری میں وطن اس قدر اعلیٰ اور عظیم قدروں کا حامل ہے کہ یہاں تمیز مذہب و ملت کی کوئی گنجائش دکھائی نہیں دیتی ہے وطن سے عشق سرور کا ایمان ہے۔
“

برج کی او پاکدامن اور مقدس نازنیں
نقش ہے دل پر ترے اک اک ادائے دلنشیں

اسی نظم کے اگلے اشعار میں وہ جمنا سے پوچھتے ہیں کہ وہ کون ہے جو تیری لہروں میں پردہ نشیں ہوکر بیٹھا ہے، تیری موجوں سے آرہی صدائے دلفریب کس کی ہیں کون تیرے خانۂ دل میں رقص کناں ہے، اور یہ چھاگل کی صدائے جاں نواز کس کی ہے؟ (حرکت کے باعث لہروں میں پیدا ہورہی آواز کو سرور نے چھاگل کی صدائے جاں نواز کہا ہے)

کون یہ پردہ نشیں ہے تیرے دامن میں نہاں
کس کا چہرہ بے نقاب زلفِ پرفن میں نہاں
تیری موجوں میں ہے یہ کس کی صدائے دلفریب
گارہی ہے کون یہ غارت گر صبر و شکیب
خانۂ دل میں ہے تیرے کون محوِ رقص و ناز
آرہی ہے کس کی چھاگل کی صدائے دل نواز

اسی طرح گنگا سے متعلق اشعار میں بے پایاں محبت اور خلوص کا اظہار کرتے ہوئے اس حیات آفریں ندی کو پاک نازنیں، ناز آفریں اور صدق وصفا کی دیوی کے ساتھ ساتھ بحر معرفت اور پاکباز ہستی جیسے الفاظ سے خطاب کرکے گنگا کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کریں۔

اوپاک نازنیں او پھولوں کے گہنے والی
سرسبز وادیوں کے دامن میں بہنے والی

او ناز آفریں اوصدق و صفا کی دیوی
اوعفت مجسم، پربت کی رہنے والی
حسن غیور تیرا ہے بے نیاز ہستی
تو بحر معرفت ہے اوپاک باز ہستی

حب الوطنی ایسا جذبہ ہے جو تقریباً ہر ذی روح میں پایا جاتا ہے۔ وطن کی محبت میں انسان بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتا ہے۔ سرور کا وطن ان کا پرستش کدہ ہے۔ ان کی شاعری میں وطن اس قدر اعلیٰ اور عظیم قدروں کا حامل ہے کہ یہاں تمیز مذہب وملت کی کوئی گنجائش دکھائی نہیں دیتی ہے وطن سے عشق سرور کا ایمان ہے۔

ناقوس اور اذاں میں نہیں قید کفر و دیں
اس کے لیے کہ جس کا پرستش کدہ ہے تو
گنگا نہائے شیخ اگر تیرا اذن ہو
تیرا اشارہ ہو تو برہمن کرے وضو
تیرا طریق عشق ہی ایمان ہے مرا
تیرے فدائیوں میں ہوں اے شوخ خوبرو
جلوہ نہ ہو کسی بت رعنا کا سامنے
وہ دن خدا کرے کہ ہو آنکھوں میں تو ہی تو

سرور کے عہد کا ہندوستان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ملک کے آسمان پر شکست وریخت کے بادل منڈلا رہے تھے تو زمین پر ہر سو مطلوک الحالی کا دور دورہ تھا۔ سرور کو ملک کے حالات کا بخوبی علم تھا۔ وہ اپنے تہذیبی سرمایے سے بھی مکمل واقفیت رکھتے تھے۔ اس شکست وریخت اور پرآشوب عہد میں ہندوستانی قوم میں بیداری کی غرض سے سرور نے انھیں ملک کی عظمت پارینہ کی داستانیں سنائیں اور وطن کی عظمت کے نغمے گائے۔ اسلاف کے کارناموں کا ذکر ان کی نظموں میں بڑے موثر اور دلنشیں انداز میں ملتا ہے۔ ان کی نظموں کو دیکھ کر یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ سرور کی نظمیں ہندوستان کی عظمت کی تاریخ اور عظیم ہندوستانیوں کی داستان ہیں۔ خاک وطن کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

آہ اے خاک وطن اے سرمۂ نور نظر
آہ اے سرمایۂ آرائش جان و جگر
تیرے دامن میں شگفتہ تھے کبھی قدرت کے پھول
گندھ رہے تھے تیری چوٹی میں کبھی وحدت کے پھول
جب مسلط خلق پر تھی خواب غفلت کی گھٹا
موتی برساتی تھی تجھ پر ابر رحمت کی گھٹا
رفعت بام فلک تھی تیری پستی میں نہاں
عظمت خود تھی شرار اوج ہستی میں نہاں
جب تمدن کا بندھا عالم میں شیرازہ نہ تھا
شاہد قدرت نے جب رخ پر ملا غازہ نہ تھا
بادۂ تہذیب سے خالی تھا جب یورپ کا خم
ایشیا کا آہ جب بیڑا تھا تاریکی میں گم
جب نہ تھی یونان میں علم و ہنر کی روشنی
جلوہ افروز خرد تھی تیرے گھر کی روشنی

سرور کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے ذریعے عوام کے دلوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کرنے کی بجائے ان کے دلوں میں محبت کا جذبہ بیدار کیا۔ مزاج میں شرافت اور سادگی کی وجہ سے انقلاب کا نعرہ بلند کرنے کی بجائے انھیں مصلحت پسندی پر آمادہ کیا۔ احتجاج کے بجائے دلوں میں مادر وطن کی عظمت کا احساس پیدا کیا۔ قومی اتحاد اور آپسی محبت کا درس دیا۔ آزاد ہندوستان کا ایسا واضح اور دل خوش کن تصور پیش کیا جو دوسرے کسی اور شاعر کے یہاں قطعی نظر نہیں آتا۔ پھولوں کا کنج ان کی ایسی ہی ایک نظم ہے۔ اس نظم کے چند اشعار سے سرور کی جدت طبع کا احساس بخوبی ہوجاتا ہے۔

پھولوں کا کنج دل کش بھارت میں اک بنائیں
حب وطن کے اس میں پودے نئے لگائیں
خون جگر سے سینچیں ہر نخل آرزو کو
اشکوں سے بیل بوٹوں کی آبرو بڑھائیں
ایک ایک گل میں پھونکیں روح شمیم وحدت
اک اک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں
فردوس کا نمونہ ہو اپنا کنج دل کش
سارے جہاں کی جس میں ہوں جلوہ گر فضائیں
مل مل کے ہم ترانے حب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

سرور نے سیاست میں کبھی دلچسپی نہیں دکھائی۔ ان کے عہد کا ہندوستان جس کشمکش سے دوچار تھا سرور اس سے لاعلم قطعی نہیں تھے۔ وطن سے متعلق ان کی نظموں میں سیاسیات کی جگہ جمالیاتی عنصر زیادہ نمایاں ہے۔ ان کی بعض نظموں میں سیاسی رنگ و آہنگ ملتا ہے، لیکن یہاں بھی ان کا انداز دیگر شعرا سے مختلف اور جدا ہے۔ شہر آشوب کا ذیل بند انھیں خیالات کی نمائندگی کرتا ہے۔

جگر فگار جدا دل ہے دردمند جدا
کہ قومیت کے ہے پتلے کا بند بند جدا
روش جدا ہے، طریقہ جدا، پسند جدا
کہ ایک ایک کے ہے درپئے گزند جدا
یہ غیریت مرے پروردگار کیسی ہے؟
روش یہ قوم نے کی اختیار کیسی ہے؟

سرور کی قومی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ:

''ان کی قومی شاعری کی شان دوسری ہے۔ یہ قدیم وجدید کی کشمکش سے آزاد ہے۔ اس کے جذبے میں

> **شاعری کے ذریعے عوام کے دلوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کرنے کی بجائے ان کے دلوں میں محبت کا جذبہ بیدار کیا۔ مزاج میں شرافت اور سادگی کی وجہ سے انقلاب کا نعرہ بلند کرنے کی بجائے انہیں مصلحت پسندی پر آمادہ کیا۔ احتجاج کے بجائے دلوں میں مادر وطن کی عظمت کا احساس پیدا کیا۔ قومی اتحاد اور آپسی محبت کا درس دیا۔ آزاد ہندوستان کا ایسا واضح اور دل خوش کن تصور پیش کیا جو دوسرے کسی اور شاعر کے یہاں قطعی نظر نہیں آتا۔**

سادگی، خیال میں معصومیت اور محبت میں عقیدت کا عنصر ملتا ہے...... ان کی وطن دوستی اور قوم پرستی بے میل، بے ریا اور بے لوث ہے۔ یہ اجتماعی احساس سے ناآشنا نہیں لیکن سیاست کے داؤ پیچ سے بلند اور بے نیاز ہے۔''

(ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر ص 277)

اس مختصر تجزیے کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ قومی اور وطنی شاعری کے لیے فکر ونظر کی جو گہرائی، تخیل کی جو بلند پروازی، جذبات کی جو آہنگی اور فطرت سے جس قدر وابستگی درکار ہے سرور کی وطنی شاعری ان تمام خوبیوں سے مالا مال ہے، نظمیہ شاعری جن حسین جذبوں اور خوبصورت احساسات سے عبارت ہے سرور کی شاعری میں وہ تمام اوصاف وعوامل پوری طرح پائے جاتے ہیں۔

■

Abdur Rahman
Tapti Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob.:9015763031
Email.: uharahman@gmail.com

1857 اور بہادر شاہ ظفر

سعدیہ پروین نہال احمد

سراج الدین ظفر خاندان تیموریہ کا آخری بادشاہ تھا، جس کی تقدیر میں کاتب ازل نے زندگی کی دیگر تلخیوں اور ناکامیوں کے علاوہ قید فرنگ بھی لکھدی تھی، اس کے اسباب کئی طرح کے تھے جیسے ملی کردار کا کمزور ہو جانا، خاندان کی قدیم روایات جیسے بہادری، شجاعت، دلیری کو چھوڑ کر عیش وعشرت میں گم ہو جانا، معاملات حکومت کی طرف سے غفلت برتنا، رعایا پر ظلم وستم ڈھانا۔ ذاتی مفاد کے لیے ملک وقوم کو غلامی کی زنجیروں کی نذر کرنا، جس کی وجہ سے زوال رونما ہوتا ہے۔ یہی وہ بنیادی کمزوریاں تھیں جو اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل بادشاہوں میں بداعمالی پیدا ہوگئی۔ ان چیزوں نے دیمک بن کر سلطنت عالم گیر کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں۔ اورنگ زیب کے جانشین سلطنت کو سنبھالنے کے اہل نہیں تھے۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد شہزادوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ جیسے۔

بہادر شاہ اوّل نے 1707 سے 1712 تک حکومت کی اس میں راجپوتوں اور سکھوں نے بغاوت کر دی۔ فرخ سیر کے دور حکومت 1713 سے 1719 تک مسلمان امراء کے 2 حصے ہوگئے۔ ایرانی اور تورانی (شیعہ اور سنی) اس سے اسلامی حکومت کو شدید ضرب لگی۔

بہادر شاہ ظفر اوّل کے عہد 1712 سے بہادر شاہ ثانی کے عہد حکومت 1857 تک کی تاریخ سیاسی افراتفری اور زبوں حالی، خود غرضی وخانہ جنگی، قتل وغارت گری اور لوٹ کھسوٹ کے ہولناک واقعات کی تاریخ ہے، بحیثیت مجموعی اس مدت میں جتنے بادشاہ برسر حکومت آئے، وہ عیش وعشرت کے بندے اور نفس کے غلام تھے، دشمن کمین گاہ میں تھا انھیں پرواہ نہ تھی۔

میدان کارزار میں داد شجاعت دینے والے، تلواروں کی جھنکار کو نغمہ وسرود جنگ سمجھنے والے، ملک کے پاسبان، قوم کے رکھوالے، یعنی خود شاہان ذی وقار اپنے اسلاف کے کارنامے بھلائے آنکھوں پر غفلت کی پٹی باندھے۔ بزم عیش وطرب سجائے بیٹھے تھے۔

اسی اثنا 1775 میں بہادر شاہ ظفر ستاۃ لال بائی کے بطن سے پیدا ہوئے ان کی پیدائش کے وقت 24 صوبوں پر حکومت کرنے والے بادشاہوں کا وارث، ان کے والد اکبر شاہ ثانی اپنی آنکھوں سے محروم اور انگریزوں کا پنشن خوار ہو چکا تھا، اس جرم میں کہ وہ الہ آباد چھوڑ کے دہلی چلے آئے تھے، ان کی پنشن بند کر دی گئی، اسی بے بسی اور بیکسی میں بہادر شاہ ظفر کی تعلیم وتربیت ایسی نہیں ہو سکتی تھی جیسی مراد و دانیال کی یا دارا شکوہ اور اورنگ زیب کی ہوئی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ظفر امور حکمرانی سیکھنے کی بجائے ادب وانشاء، تصوف واخلاق، فقہ وحدیث، تفسیر، خوش نویسی اور فن شعرگوئی میں مہارت رکھتے تھے۔

1837 میں بہادر شاہ ظفر کے تخت نشین ہوتے ہی ہندوستان میں انگریزوں کا زور بہت بڑھ گیا، انگریز افسر لارڈ کیننگ نے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بعد خطاب شاہی ختم کر دیا۔

شہنشاہ عالم گیر کے بعد بہادر شاہ ظفر تک کا دور سیاسی افراتفری اور اقتصادی بدحالی کا دور تھا، ایسی بدحالی جس میں بدنظمی، انتشار، لوٹ مار، قتل وغارت غرض کہ ایک عجب طرح کی بے اطمینانی اور بے سروسامانی ہر طرف چھائی نظر آتی تھی، ہر شخص سراسیمہ تھا، عزت وناموس اور جان کے لالے پڑے تھے، فوج کی اقتصادی پریشانی کا یہ حال تھا کہ سپاہی تنگ آکر اپنی ڈھال اور تلوار تک گروی رکھ دیتے تھے، اس دور کے عوام یہاں تک کہ شعراء کے یہاں بھی ان حالات وزمانہ اور گردش تقدیر کا رونا ملتا ہے، ہر خاص وعام انگریزوں کے ظلم وستم سے عاجز آگئے تھے، کیا ہندو، کیا مسلمان، ہر کوئی سیاسی آزادی کا خواہاں تھا، خود بہادر شاہ ظفر بھی ایسا بادشاہ تھا...

''جسکی زندگی کی ایک ایک سانس اپنے غموں کی زنجیر سے الجھ رہی تھی۔''

بقول نواب نصیر حسین خیال

''دنیا کی تاریخ میں ایسی نظیر ڈھونڈنے پر نہ ملے گی کہ کوئی حکمراں قوم اپنی زبان کو سلام کر کے رعایا کی زبان کو یوں تسلیم کرے کہ یہ رعایت ومروت اسی خاندان پر ختم ہوگئی۔ (بحوالہ مغل اور اردو)

30 ستمبر 1837 ہفتہ کے روز بہادر شاہ ظفر نے تخت نشینی اختیار کی، اسی کے ساتھ بادشاہ کو بھی انگریزوں کی طرف سے بے اثر وبے عزت کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں، خاندانی تنازعات ابھرتے گئے، کمپنی کی جانب سے دئے جانی والے تحائف (عیدین اور نوروز کے) لارڈ الجز نے بند کر دیے، 1843 میں پنشن بھی نہیں بڑھائی گئی، خرچ زیادہ ہونے لگے، اور آمدنی کا ذریعہ کم تھا، شہریوں کی نظروں میں بادشاہ کو ذلیل کرنے کی سعی کی جانے لگی، اختیارات شاہی کو ختم کرنے کے لیے ذلیل حرکتیں کی جانے لگیں۔

ہندوستانی مذہب کی بے حرمتی اور عیسائیت کی تبلیغ کی جانے لگی۔

مجموعی طور پر ہندوستانیوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف بغاوت ابھرنے لگی، چنانچہ سب سے پہلے بادشاہ نے فوجیوں کو طلب کیا جب اس بات کا علم لفٹنٹ گورنر کو ہوا تو اس نے تحقیقات شروع کی، اور فوجی لوگوں کا آئندہ بادشاہ سے مرید ہونا بند کرایا۔ (مقدمہ بہادر شاہ ظفر، ص 103)

بقول مکند لال مجز:

''اس روز سے بادشاہ اور فوج میں ایک قسم کا ارتباط ہوگیا تھا۔'' (مقدمہ بہادر شاہ ظفر، ص 103)

نہیں حال دہلی سنانے کے قابل
یہ قصہ ہے رونے رلانے کے قابل
اجاڑے لٹیروں نے وہ قصر اس کے
جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل
نہ گھر ہے نہ در ہے، فقط اک ظفر ہے
فقط حال دہلی سنانے کے قابل

چنانچہ ہندو مسلم جنگ آزادی کے لیے اکٹھا ہوگئے، اور 11 مئی 3 بجے سہ پہر کے قریب بغاوت کا اعلان کیا گیا اور اس میں نعرہ لگایا گیا کہ

خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا''

اس نعرے کے ساتھ ساتھ دیکھتے ہی دیکھتے لال قلعہ بغاوت کا مرکز بن گیا، فوجی سازش کا نتیجہ تھا کہ قلعہ میں کارتوس کے استعمال سے سپاہیوں میں ناراضگی پیدا ہوگئی، اور 31 مئی 1857 اتوار کا دن بغاوت کا ہونا طے پایا اور طے ہوا کہ:

(1) تمام یورپین کو مار ڈالیں گے۔

(2) خزانوں پر قبضہ کیا جائے جو ربیع کی فصل کی پیداوار سے بھرے ہوئے ہیں۔

(3) جیل سے قیدی رہا کرائے جائیں جن سے پچیس ہزار سپاہیوں کی فوج تیار کی جائے گی۔

اس بات کی خبر جب انگریزوں کو ہوئی اور جب یہ خبر لفٹنٹ کرنل اسمتھ کو ہوئی تو انھوں نے تار کے ذریعے فوراً خبر پھیلادی اور انگریز الرٹ ہوگئے۔ 10 مئی 1857 کو میرٹھ میں بغاوت کی چنگاری اٹھی، اور اسی رات فوجی دہلی آئے، صبح جمنا ندی پر پہنچے اور ابتدا سلیم پور کی پرمٹ چوکی پر آگ لگانے سے کی، اس دوران کلکٹر کو قتل کر دیا گیا، جمنا کے پل کو پار کیا اور کلکتی دروازے پر پہنچے، بادشاہ نے پوچھا: کون؟

تو لوگوں نے کہا، ہم انگریزوں کے ظلم سے عاجز آچکے ہیں، یہاں تک کہ اب محرب کارتوس میں چربی کا استعمال کیا جانے لگا، اب غدر کے چھڑنے کا رجحان ہم لے آئے ہیں۔

بادشاہ خاموش رہا، اس کے بعد انھیں جو انگریز دہلی میں ملتا اسے قتل کرتے چلے گئے، دین ودھرم کا نعرہ بلند ہونے لگا، ہندو مسلمان ایک ساتھ جمع ہوگئے، فوجیوں نے بھی مدد کی، اور اس میں ہندو مسلم جنگ آزادی کے لیے شریک ہوگئے، اور نعرہ دیا، ''خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا۔''

بادشاہ نے بھی فوجی بھرتی کا اعلان کر دیا جب کہ دربار میں مخبروں کا جال پھیلا ہوا تھا، خاندانی اختلافات عروج پر تھے، درباری لوگوں میں اور شاہی قرابت داروں میں اتحاد و یک جہتی نہیں تھی، عوام کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

لیکن!

ان کی آزادی کے جذبے میں خلوص تھا، تحریک سے ہمدردی تھی، انگریزوں سے نفرت تھی، یہ جنگ آزادی کا نعرہ تقریباً 4 مہینے 4 دن جاری رہا۔

جوابی کاروائی میں انگریزوں نے 13 ستمبر کو دہلی پر پانچ طرف سے حملہ کردیا، اور 19 ستمبر کو دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

بادشاہ آخر میں ہمایوں کے مقبرے پر چلے گئے، ہڈسن ہمایوں کے مقبرے پر آیا، وعدے وعید کے بعد بادشاہ پالکی پر سوار ہوا، ساتھ میں جواں بخت، بیگم زینت محل، بیگم تاج محل، حکیم احسن اللہ خان، مرزا قیصر شکوہ، میر فتح علی، فوجدار، بقول مینول شاہی خاندان کے سات سو آدمی سوار ہوئے، بہادر شاہ ظفر جب شہر میں داخل ہوئے تب انگریز و آفیسران نے طعن و تشنیع کی، (تواریخ اودھ، ص 453)

''20 ستمبر کو پوری دہلی پر انگریز قابض ہوگئے جامع مسجد کے صحن میں مسلمانوں کو قتل کیا گیا، اس قتل عام میں 27 ہزار عام مسلمان اور 8 ہزار فوج شہید ہوگئی، عورتوں کی عصمت کو ریزہ ریزہ کیا گیا، (قیصر التواریخ، 455)

ہندوستانی مسلمانوں کو زندہ آگ میں جلایا گیا، جو بھی ملتا اسے سنگینوں سے ختم کر دیا جاتا، خاوندوں نے اپنی عورتوں کو قتل کیا اور پھر خودکشی کی، ہزاروں مجاہدین پھانسی پر چڑھے، زندہ مجاہدوں کو سور کی کھال میں سیل کر دیا گیا۔

Dr. lane Ireland کے مدیر Time of India اپنی رسل ڈائری مئی 1858 میں ص 43 میں لکھتے ہیں۔

''زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا، یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں ایسی مکروہ اور ظالمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی بھی تہذیب بھی اجازت نہیں دیتی۔''

بہادر شاہ ظفر کے جانشیں مرزا خضر سلطان، مرزا مغل اور ابوبکر کو ہڈسن نے تین تین گولیاں قلب پر ماریں، شہ رگ کو سنگین سے چیر دیا، چلو میں لے کر ان کا خون بہایا، اور ان کے سر کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا، پھر کوتوالی چبوترے پر جا کر نعشوں کو زمین پر ڈال دیا، 3 دن بعد خواجہ باقی باللہ میں دفن کروادیا۔ (تواریخ اودھ، ص 454)

بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلا، 27 جنوری 1858 سے 9 مارچ 1858 پر ختم ہوا، اور جلا وطنی کی سزا ملی، کلکتہ سے فوراً بحری سفر کے ذریعے رنگون بھیج دیا گیا، 7 نومبر 1862 بمطابق 14 جمادی الاول 1289ھ بروز جمعہ کو دنیائے فانی کو الوداع کہا، (واقعات دارالحکومت دہلی، اول، ص 737)

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ایک سلطنت کا ہی نہیں بلکہ ایک تہذیبی روایت کا بھی خاتمہ ہوگیا، ایک ایسی روایت جسے مغلوں نے پروان چڑھایا، جس نے یہاں کی تہذیب کو آب و رنگ بخشا، جس نے اس تہذیب کو وسعت اور کشادگی عطا کی، لطافت اور نزاکت بخشی، یہ ایسی تہذیب تھی جس میں جلال بھی تھا اور جمال بھی تھا، جس نے آگرہ اور دلی کے سنگ سرخ کے قلعے اپنی یادگار چھوڑے، اور جس نے انسانی حسن کے تخیل کو تاج محل کی صورت میں جنم دیا، لیکن 1857 کے انقلاب نے اس ملک پر ایک ایسی قوم کو مسلط کیا جو پہلے پہل صرف تجارت اور کاروبار کی نیت سے اس ملک میں داخل ہوئی اور آہستہ آہستہ مختلف تدبیروں سے اس نے ملکی سیاست اور حکومت پر ڈورے ڈالے، اس ملک کی بدقسمتی تھی کہ درباروں میں بغض و کینہ و حسد کا ایسا جال پھیلا کہ قوائے عمل بالکل مضمحل ہوگئے، اور دھرتی پر اس ڈوبتی ناؤ کو بچانے والا کوئی نہ رہا۔

لیکن! آندھی چڑھتی ہے تو اترتی بھی ہے، طوفان اور سیلاب کتنا ہی زور کیوں نہ باندھے، اور کتنی ہی تباہی اور ہلاکت کیوں نہ پھیلائے ایک مدت کے بعد اسے بھی اپنا زور کھونا پڑتا ہے، برصغیر ہندو پاکستان کی سیاسی حدود اسی زور کو توڑنے کی کوشش تھی، بلاشبہ یہ ایک تنکے کی کوشش تھی، جو سمندر کی طوفانی موجوں کے مقابلے میں سینہ تان کر کھڑا ہوا تھا، لیکن آہستہ آہستہ ان تنکوں نے ہی اس طوفان کے دھاروں کو روکنا شروع کیا، جس میں سرسید کی کاوشیں قابل تعریف ہیں۔

ہم دیکھ چکے خوب تماشائے زمانہ
اچھا ہے جو کچھ اور نہ دکھلائے زمانہ
ڈھونڈو تو زمانے میں نہیں مہر و محبت
کس طرح کا آیا ہے ظفر ہائے زمانہ

■

Prof. Sadiya Parveen Nehal Ahmed
Ass.Prof. Department of Urdu/persian, M.S.G. Arts, Science and Commerce College, Malegaon camp, Dist.: Nasik - 423203 (Maharashtra)
Mobile No: 98605903002
email : zafershafeeque@yahoo.com

خان محمد آصف

اردو زبان و ادب کی ترویج میں سائبر سماج کا حصہ

ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں وہ نت نئی ایجادات و اختراعات کا دور ہے۔ جو چیزیں آج تک طلسماتی اور قول محال سمجھی جاتی تھیں سائنس وٹکنالوجی نے انھیں سچ کر دکھایا۔ موجودہ عہد میں انٹرنیٹ انسان کی روز مرہ زندگی کا جزو لاینفک بن چکا ہے۔ ماضی کا انسان اپنے خیالات وجذبات کا بیان خطوط سے کیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس آج بلاگس، ٹویٹر اور واٹس اپ کے ذریعے پیغام کی بآسانی ترسیل کی جاسکتی ہے۔ انٹرنیٹ کے اثرات نے کائنات کے حجم کو سمیٹ کر گلوبل ویلج میں تبدیل کر دیا ہے۔ اطلاعاتی انقلاب نے کائناتی نظام کو سائبر اسپیس میں منتقل کر دیا ہے، جہاں معلومات کا لامتناہی انبار ہے۔ اس سائبر اسپیس میں ڈیجیٹل لائبریریز، انسائیکلوپیڈیا، اخبارات ورسائل، ویب سائٹس، بلاگز اور ای کتب موجود ہیں، جو اردو زبان و ادب کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں اور اردو کی لسانی، تہذیبی اور ثقافتی قدروں کو روایتی محبان اردو کے علاوہ ان حلقوں سے جوڑ رہی ہیں، جو بالعموم اردو والوں میں شمار نہیں کیے جاتے۔ تو دوسری طرف انٹرنیٹ نے اردو رسم الخط کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس کی ترویج و اشاعت میں مثبت کردار ادا۔ محبان اردو کو اس بات کا غم کھائے جا رہا تھا کہ اگر اردو کو سوشل نیٹ ورکنگ سے نہیں جوڑا گیا تو اردو زبان و ادب کا تہذیبی و ثقافتی اثاثہ ٹکنالوجی کی تیز رفتار اور چکا چوند دنیا میں دھندلا پڑ جائے گا۔ اردو کے شیدائیوں کی اسی لگن اور جذبے نے زبان کو نئی ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کیا، اپنی اس کوشش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ذاتی سرمائے لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ یہ انھیں کی محنتوں کا ثمرہ ہے کہ آج انٹرنیٹ پر اردو ڈیجیٹل لائبریریز اور کئی اہم ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی سائٹس موجود ہیں۔ اس مقالے میں اردو کی انھیں ویب سائٹس اور بلاگ کا تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے، جو اردو زبان و ادب کے فروغ میں مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ تاکہ اردو زبان اپنے رسم الخط کے ساتھ محفوظ ہو جائے۔ اردو کی ان ویب سائٹس کا مقصد جہاں زبان و ادب اور تہذیب وثقافت کی ترویج و اشاعت ہے، وہیں نئی نسل کے اندر صالح اقدار کو پروان چڑھانا بھی ہے، تاکہ ادبی ذوق رکھنے والوں کا ایک ایسا حلقہ وجود میں آئے جو اپنے ذوق کی تسکین ان ویب سائٹس کے ذریعے کر سکے۔ میری خواہش تھی کہ اپنے مضمون میں ان تمام ویب سائٹس کا تجزیہ وتعارف پیش کروں، جو اردو کے فروغ میں کام کر رہی ہیں۔ لیکن طوالت کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ اس لیے صرف انھیں ویب سائٹس کو اپنے مضمون کے لیے منتخب کیا جو اردو ادب کے طالب علموں، ریسرچ اسکالروں اور روایتی اور غیر روایتی محبان اردو کے ذوق کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔

بہار اردو یوتھ فورم ڈاٹ آرگ کا قیام 2009 میں عمل میں آیا اس ویب سائٹ کا مقصد بالعموم اردو زبان و ادب اور بالخصوص بہار کے اردو تخلیق کاروں کے فن پاروں کو انٹرنیٹ کے ذریعے فروغ دینا تھا۔ پچھلے آٹھ سالوں سے یہ ویب سائٹ اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے بھرپور کوشش کر رہی ہے جس کے نتیجے میں اب تک قومی و بین الاقوامی سطح پر ایک کروڑ سے زیادہ وزیٹرس اس سائٹ کی سیاحت کر چکے ہیں۔ اس ویب سائٹ پر ہندو پاک کے علاوہ اردو کی نئی بستیوں کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس فورم کی اہمیت اردو دنیا میں اس وجہ سے مسلم ہے کہ اس پر شعراو

ادبا کے نام باعتبار حروف تہجی دیے گئے ہیں جس کے سبب ویب سائٹ کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوا، اور اردو کے اسکالرس اور شائقین کو یہ آسانی ہوئی کہ وہ اپنے پسندیدہ شاعر و ادیب تک بلا کسی ٹکنیکل روک ٹوک کے پہنچ سکیں۔

بہار اردو یوتھ فورم نے اپنی ویب سائٹ کو دیدہ زیب اور پرکشش بنانے کے لیے 341 شعرا کی ڈیزائن پوٹریز تیار کی ہے، اس کے علاوہ قاری کی دلچسپی کو ذہن میں رکھتے ہوئے افسانے، افسانچے، پوپ کہانیاں، منی افسانے کو جدید گرافک ڈیزائن سے مزین کر کے سائبر سماج کا حصہ بنایا۔ جس نے انٹرنیٹ کی دنیا میں ایک ایسا انقلاب برپا کیا، جسے تاریخ ادب اردو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اردو ادب کی تاریخ میں اس فورم کی اہمیت سنگ میل کی رہے گی۔ اسی طرح 258 کہانی کاروں کے 896 افسانوی متون ڈیزائن کے ساتھ موجود ہیں۔ ادبی متن کے علاوہ انسانی شعبہ ہائے زندگی سے متعلق کل مضامین کی تعداد 4014 ہے۔ قارئین کو تلاش و جستجو میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے اس کے لیے مضمون نگاروں کے نام حروف تہجی میں دیے گئے ہیں۔ اس ویب سائٹ کو عالمی شہرت اس وجہ سے بھی حاصل ہے کہ اس پر ویزیٹرس کی پسند اور ضرورت کے متعلق مضامین وافر مقدار میں موجود ہیں۔ جن میں تعلیمی، اسلامی، سیاسی، ادبی، اسپورٹس اور خواتین و اطفال پر مضامین قابل ذکر ہیں، جن کی الگ الگ فہرست ہے تاکہ قاری کو پریشانی نہ ہو۔ تعلیمی مضامین کی کل تعداد 281 ہے جس میں کمپیوٹر پر 11، علم وفن پر 65، معلوماتی باتیں 162، مسلم معاشرے پر 36، تعلیم کی اہمیت پر 7 مضامین شامل ہیں۔ ادبی مضامین کی کل تعداد 2251 ہے آپ بیتی پر 76، ادبی خبریں 405، ادبی گوشہ 360، افسانے 38، غزلیں 37، انٹرویوز 21، لمحہ فکر 238، مزاحیہ مضامین 41، شخصیات 402، شاعری 73، تجزیاتی مطالعہ 179، تیشۂ فکر پر 332 مضامین شامل ہیں۔

اردو کے عام قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے خاصی تعداد میں ایسے مضامین اپلوڈ کیے گئے ہیں جن کا تعلق نسائی حسن و ہستی سے ہے جیسے مضامین برائے نسواں جس کی کل تعداد 189 ہے اس میں خوبصورتی پر 6، خواتین کے لیے 66، امور خانہ داری سے متعلق 94 اور خواتین کے صفحات کے نام پر 23 مضامین شامل ہیں۔ اسلامی مضامین کی کل تعداد 368 ہے اسلامی تعلیمات پر 74، اسلامیات 229، بزرگان دین کے حالات زندگی پر 33 اور محمد عربی کی باتیں کے عنوان سے 32 مضامین شامل ہیں۔ حالات حاضرہ پر 505 مضامین ہیں جن میں بنگلہ دیش پر 9، ہندستان پر 365، پاکستان پر 47، ساؤتھ ایشیا پر 80 اور عالمی سطح کے 80 مضامین شامل ہیں۔ مضامین برائے اطفال کی کل تعداد 77 ہے جن میں بچوں کے لیے اصلاحی مضامین 14، بچوں کی کہانیاں 49 اور بچوں کی نظمیں 14 شامل ہیں۔ فلمستان کی زرق برق دنیا اور ہیرو ہیروئن کے افیئرس پر 39 مضامین ہیں جو فلمی شائقین کے لیے بڑا تحفہ ہے۔ سیاسی مضامین کی کل تعداد 193 ہے جس میں قومی سطح کے مضامین 54، ریاستی سطح کے 72 اور 2014 کے عام انتخاب کے متعلق 67 مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اسپورٹس کی خبروں پر مشتمل مضامین کی تعداد 38 ہے۔

بہار اردو یوتھ فورم کی ویب سائٹ پر معروف شخصیات، شعرا و ادبا کی 612 ویڈیوز بھی ہیں جنھیں آپ بآسانی دیکھ اور سن کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس ویب سائٹ کا مقصد جہاں نئی نسل کو صالح اقدار عطا کرنا ہے وہیں ان کے اندر اردو زبان و ادب کے تہذیبی ورثے کو ان کے حوالے کرنا ہے، تاکہ نئی نسل اردو کی شیرینی کے ساتھ اس کی ثقافت کو اپنے اندر سمو سکے۔ اس کے لیے انٹرنیٹ سے بہترین کوئی ذریعہ نہیں جس سے آج کی نسل پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ لائق مبارک باد ہیں جاوید محمود صاحب جنھوں نے اردو ادب کے فروغ کے لیے انٹرنیٹ کو میڈیم کے طور پر انتخاب کیا اور اردو کے شعری اور نثری سرمائے کو اس کے وقار اور معیار کے ساتھ نئی ٹکنالوجی سے جوڑا۔

ریختہ ڈاٹ او آر جی کا بنیادی مقصد سائبر دنیا میں اردو کی شعری اصناف کو معیاری اور مستند متن کے ساتھ پیش کرنا ہے تاکہ قاری و سامع اردو تہذیب کے ساتھ صحیح تلفظ سے واقف ہو سکے۔ اس ویب سائٹ پر معروف و مقبول شعرا و ادبا، کی تخلیقات کو اردو کے علاوہ دیوناگری اور رومن رسم الخط میں بھی آن لائن مہیا کیا گیا ہے۔ چونکہ غیر روایتی محبان اردو زبان کی چاشنی اور شیرینی سے محظوظ ہوتے ہی ہیں، لیکن اردو ادب اور بالخصوص شعری متن کی معنیاتی تفہیم سے نابلد ہوتے ہیں۔ ریختہ نے اردو ادب کے فہم کو فروغ دینے اور اس کے رس کو عقیدت مندان اردو تک پہونچانے کے لیے مشہور شعرا کے کلام کو ان کی اپنی آواز میں پیش کیا۔ مقصد یہ ہے کہ سامعین و ناظرین کلام کے ساتھ ساتھ شاعروں کے صوتی آہنگ سے بھی لطف اندوز ہوں۔ جن شعرا کا آڈیو یا ویڈیو دستیاب نہ ہو سکا ان کے کلام کو عصر حاضر کے معروف شاعروں اور زبان کے ماہرین کی آواز میں محفوظ کیا گیا۔ جو ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔ تاکہ سامع و ناظر شعری وزن و آہنگ سے حظ اٹھا سکیں۔

ریختہ کا اپنا ایک اسٹوڈیو ہے جس میں اردو کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور ناقدین سے انٹرویوز لیے جاتے ہیں۔ جس میں ہند و پاک کے نئی نسل کے شعرا و ادبا کے علاوہ بزرگ ادیبوں سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ ان انٹرویوز کا مقصد شاعروں اور ادیبوں کی آرا سے سامعین کو واقف کرانا ہوتا ہے اس تیز رفتار دنیا کے بدلتے تہذیبی و ثقافتی رجحان میں شعر و ادب کی تفہیم کیسے ممکن ہو سکے۔ اس کے علاوہ ریختہ پر موضوعاتی اشعار کا ای۔ بینک بھی موجود ہے، جس میں قاری اپنے پسندیدہ موضوع کے تحت اشعار کا انتخاب کر سکتا ہے اور اپنے عزیزوں کے ساتھ اسے شیئر بھی کر سکتا ہے۔ حال ہی میں ریختہ نے علم عروض پر آسان اور عام فہم زبان میں لیکچر سیریز شروع کی ہے تاکہ شعری ذوق و شوق رکھنے والے حضرات اشعار

بحروں اور اس کے اصول و اوزان سے واقف ہو سکیں۔

ریختہ پر خصوصی گوشہ کے تحت بلند ادبا و شعرا کی تخلیقات پیش کی گئی ہیں جن میں قابل ذکر میر تقی میر، اسد اللہ خاں غالب اور سعادت حسن منٹو ہیں۔

ریختہ فاونڈیشن کے بانی سنجیو صراف کے بقول ''ریختہ دراصل محبتوں کا پھول ہے جس کی خوشبو آج دنیا کے 154 ملکوں تک پہنچ چکی ہے۔'' سائبر اسپیس میں ریختہ کی مقبولیت اور اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے پہلے یوم تاسیس پر پروفیسر اختر الواسع نے کہا تھا کہ ''اگر پچھلی صدی چھپے ہوئے حرف کی حرمتوں واشاعت کے حوالے سے منشی نول کشور کی صدی تھی تو سائبر انقلاب کے زمانے میں یہ سنجیو صراف کی صدی کہلائے گی۔'' ریختہ ڈاٹ او آر جی کی ادبی حلقے میں مقبولیت اور کامیابی کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے کمپیوٹر اسکرین کے ساتھ ساتھ موبائل اسکرین پر بھی دستیاب ہے۔ اس صورت میں ایسی ہائی ٹیک ٹکنالوجی کا استعمال کیا گیا ہے جس سے ویب سائٹ پر موجود شعرا کا کلام، ای۔ بکس اور دیگر تمام آڈیوز اور ویڈیوز کو موبائل اسکرین پر بھی پڑھے، سنے اور دیکھے جا سکیں گے۔ ریختہ نے اردو ادب کی خوشبو کو نئی نسل تک پہنچانے کا جو ہائی ٹیک طریقہ اپنایا ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اردو سے متعلق انٹرنیٹ کی دنیا میں 'اردو ویب ڈیجیٹل لائبریری' کی اپنی الگ پہچان ہے اس کا مقصد اردو زبان وادب کے بیش بہا، کم یاب اور نایاب سرمائے کو محفوظ کرنا، اسے معدوم ہونے سے بچانا بھی ہے تا کہ آنے والی نسل کے لیے اس کی رسائی آسان ہو سکے، اور اردو زبان کے موجودہ مواد کو انٹرنیٹ کے ذریعے عوام تک بآسانی پہنچایا جا سکے۔ یہ ایک ایسی آن لائن لائبریری ہے جو کاپی رائٹ سے آزاد اپنے قاری کو ادبی اور تدریسی مواد فراہم کرتی رہے، کتابوں کا یہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں سے علم وادب کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ علمی ذوق رکھنے والے، محققین اور علم کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہنے والوں کے لیے یہ آن لائن ڈیجیٹل لائبریری اولین مستند حوالے کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔ ڈیجیٹل لائبریری میں شامل متون سے آپ پوری طرح استفادہ کر سکتے ہیں بس شرط یہ ہے کہ اگر اس متن کو اپنی تحریر میں حوالے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اردو ویب ڈیجیٹل کا حوالہ اور نام ضرور دیں۔ تا کہ سند رہے۔

'اردو کی برقی کتابیں ڈاٹ کام' اردو کی برقی کتابوں کی نشر واشاعت اور ترویج میں فعال کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ ویب سائٹ اردو کی مفت برقی کتابوں کا مطبع ہے جہاں کتابیں برقی شکل میں شائع ہوتی ہیں۔ کتابوں

کی اشاعت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل تین شرطوں کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

1۔ جملہ حقوق (کاپی رائٹ) سے آزاد کتب کی اشاعت

2۔ ان کتب کی اشاعت جو پہلے کاغذ پر شائع ہو چکی ہیں اور پرنٹ ورژن کے بعد مصنفین یا ناشرین کی اجازت کے بعد برقی شکل میں پیش کی جائیں گی۔

3۔ اب آپ بھی اپنی کتابیں برقی شکل میں شائع کرا سکتے ہیں اگر آپ کی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی ہو تو یہاں شائع کرا سکتے ہیں۔

اردو کی برقی کتابیں ڈاٹ کام پر دو موضوعات پر کتابیں موجود ہیں، متفرقات کے زمرے میں کئی موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تفصیل ملاحظہ کریں۔

دین ومذہب

مذہبی لٹریچر پر 425 کتابیں ہیں جو متعدد موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً اسلام کے متعلق 32، احادیث 15، عقیدے پر 57، سیرت نگاری 11، اور اسلامیات پر 310 کتابیں ہیں۔ اور دیگر ادیان پر سات کتابیں موجود ہیں۔

اردو کی برقی کتابیں ڈاٹ کام پر اردو ادب کی تمام اصناف مطالعے کے لیے موجود ہے جن میں شعری مجموعے، افسانوی مجموعے، ناول، داستان، ڈرامہ، تنقید و تحقیق، ادب اطفال، جاسوسی ادب اور طنز ومزاح شامل ہیں۔ اس ویب سائٹ سے کتابوں کے مطالعے کے ساتھ ڈاون لوڈ کر کے اپنے پاس محفوظ بھی کر سکتے ہیں۔

عصر حاضر میں جدید ٹکنالوجی کے ذریعے اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت 'بزم اردو لائبریری' کا اولین مقصد ہے۔ دن بہ دن سکڑتی ہوئی دنیا اور اطلاعاتی ٹکنالوجی کے اس دور میں اردو زبان وادب کے وسیع ذخیرے کو انٹرنیٹ پر پیش کیا جانا ایک ناگزیر امر بن چکا ہے۔ جب کہ نئی نسل وقت کی قلت اور مصروفیت کی بنا پر کتابوں سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اسی فکر نے اعجاز عبید کو برقی کتابیں جمع کرنے کی ترغیب دلائی، جس سے اردو قاری دنیا کے کسی بھی کونے سے بلا روک ٹوک اردو کے برقی مواد تک رسائی کر سکیں۔ اس دیوانگی نے انھیں کاپی رائٹ سے آزاد یونیکوڈ فارمیٹ میں کتابوں کو برقی شکل میں کرنا شروع کیا۔ جو آج ایک عظیم الشان آن لائن حوالہ جاتی لائبریری کی شکل میں موجود ہے۔ آج اسی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے کہ اینڈ رائڈ ایپ کی معاونت سے اردو لٹریچر کے عظیم سرمائے کو آپ موبائل پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔

کتابستان ڈاٹ کام نے اردو کی سائبر دنیا میں بڑے کم وقت میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ اس کی ای۔ بک لائبریری میں اردو کے اصناف ادب کی اب تک سو کتابیں اپ لوڈ کی جا چکی ہیں، جن میں ناول، افسانے، خطوط کے مجموعے، کلاسک ادب، شاعری، مزاح، ادب الاطفال، مقالے، تذکرہ و تحقیق، خودنوشت، سفرنامہ، شخصی

خاکے، شکاریات، فلم آرٹ موسیقی اور رسائل و جرائد قابل ذکر ہیں۔ اس ویب سائٹ پر نایاب و کمیاب موضوعاتی کتابوں پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ جس کی دسترس طلبا و ریسرچ اسکالرز اور عام قارئین کی پہنچ سے باہر ہے۔

کتابستان ڈاٹ کام کا مقصد اپنے قارئین کو معیاری کتابیں بہم پہونچانا ہے، تاکہ نئی نسل کا قاری سستے، بازاری اور گھٹیا قسم کے رومانی موضوعات سے گریز کرے اور اپنے مطالعے میں عمدہ اور بہترین ادب کو رکھے۔ اس ویب سائٹ کا بنیادی مقصد بھی خالص اردو ادب کے فروغ کے لیے کام کرنا ہے، اس ویب سائٹ کی سبھی کتابیں اسکینگ شدہ پی ڈی ایف فارمیٹ میں موجود ہیں، جن کا آسانی کے ساتھ پرنٹ لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں کی کتابوں کو اقتباس یا حوالے کی صورت میں استعمال کرتے وقت کتابستان ڈاٹ کام کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

ہند و پاک میں طلبا اور ریسرچ اسکالرز کے لیے پی، ڈی، ایف فائل کی صورت میں اردو زبان و ادب کے اہم موضوعات پر مشتمل کتابستان ڈاٹ کام کامیابی کی ہر لمحہ نئی تاریخ رقم کر رہا ہے۔ کئی مہینوں کی مسلسل سعی کے بعد 17 اپریل 2016 کو گوشہ مشفق خواجہ کا اجرا عمل میں آیا ہے۔ جو اس ویب سائٹ کے لیے فال نیک ثابت ہوگا۔ اس گوشے میں خواجہ صاحب کے متعلق 25 سے زائد کتب و رسائل شامل ہیں۔ جو ان کی شخصیت اور فکر و فن سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ خواجہ صاحب کے خطوط اور کالمز کے مجموعے کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

'اردو لائف ڈاٹ کام' اردو کا پہلا ویب سائٹ ہے جس نے اردو کی ادبی تاریخ میں پہلی مرتبہ قلم دوست ڈاٹ کام کے اشتراک سے ورچوئل مشاعرے کا انعقاد کیا۔ جسے اردو ادب کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ اس ویب سائٹ کی ادبی حلقوں میں مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ اردو ادب سے متعلق تقریباً تمام مشہور و معروف شعراء کے کلام ان کی آواز میں موجود ہیں۔ محفل مشاعرہ کے عنوان سے مشاعرے کا ذخیرہ بھی ہے جس میں آپ اپنی پسندیدہ غزلیں اور نظمیں بہ آسانی سرچ کر سکتے ہیں۔ اردو لائف ویڈیو کے عنوان کے تحت مشہور و مقبول شعراء کے کلام، انٹرویوز، ادبی تقریبات اور ادبی شخصیات پر ڈاکومنٹری فلموں کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا ہے جسے حال ہی میں یوٹیوب پر منتقل کیا گیا ہے۔ محفل موسیقی کے تحت اس ویب سائٹ پر آپ کو معیاری، نایاب اور کمیاب موسیقی کا ذخیرہ ملے گا۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس طرح کی موسیقی انٹرنیٹ پر دستیاب نہیں ہے۔

عصر حاضر جدید تکنالوجی اور تیز رفتار ترقی کا عہد ہے۔ انٹر نیٹ کی ایجاد نے جغرافیائی سرحدوں کے ساتھ تہذیبی، ثقافتی اور لسانی حدود کو بھی منہدم کر دیا ہے۔ غیر ترقی یافتہ زبانیں نزع کی حالت میں دم توڑ رہی ہیں۔ ایسے میں اگر اردو زبان و ادب اور اس کے رسم الخط کو نئی تکنالوجی سے ہم آہنگ نہیں کیا گیا، تو ترقی کے اس دور میں ہمارا ادب، ہماری زبان اور ہماری تہذیب جس پر ہمیں فخر ہے، سب سے پیچھے رہ جائیں گی، کیونکہ دور حاضر میں ترقی و تنزلی کا تمام تر دار و مدار جدید تکنالوجی پر ہے۔ دراں حالانکہ انٹر نیٹ پر ہزاروں ویب سائٹس اور بلاگس موجود ہیں جو ارود کی ترویج و اشاعت کا کام بڑی محنت اور دیانتداری سے کر رہی ہیں۔

'اردو لائف ڈاٹ کام' نے 2006 میں اردو پیڈ کے نام سے انٹرنیٹ پر سب سے پہلے یونی کوڈ میں لکھنے کی سہولت بلا معاوضہ شروع کی، جو اردو کی ترویج و اشاعت میں میل کا پتھر ثابت ہوا۔ اردو پیڈ کے استعمال کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ قارئین کے ادبی ذوق کی تکمیل کے لیے اردو لائف ڈاٹ کام نے آن لائن انٹرنیٹ ادبی شمارے کی شروعات 'ادبی افق' کے نام سے کی، جس پر ادب کی مختلف شعری و نثری اصناف کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

'اردو پوائنٹ ڈاٹ کام' انٹرنیٹ کی دنیا میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ روز اول سے ہی بزرگ ادیبوں اور استاذ شعراء کے ساتھ نئی نسل کے لکھنے والوں کو بھی بلا تفریق شائع کیا، لیکن ادبی معیار سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اردو کی اسی بے لوث خدمت اور مقبولیت کی وجہ سے دنیا بھر سے لاکھوں افراد اردو پوائنٹ کی سیاحت کرتے ہے۔ اور معیاری ادب سے اپنے ذوق کی تسکین کرتے ہیں۔ اردو کی نئی نسل کے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی شفیق استاذ کی طرح کرتا ہے۔ ان کی تخلیقات کو مناسب اور موزوں جگہ بھی فراہم کرتا ہے۔ اس ویب سائٹ پر مضامین، ادبی تحریریں، کتابیں، شاعری، تکنالوجی کے مضامین و خبریں، کالم، اخباری خبریں، مزاحیہ تحریریں اور پکوان سے متعلق تراکیب مطالعے کے لیے مل جائیں گی۔

اردو پوائنٹ ڈاٹ کام نے جہاں ادب کی دنیا میں اہمیت حاصل کی وہیں اردو صحافت میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا۔ اپنی خبروں، مضامین، کالمز اور اداریوں میں صداقت، سچائی کو فروغ دینے کا کام کیا۔ یہ کام اس نے بغیر کسی اندرونی و بیرونی دباؤ کے بڑی خوبصورتی اور ایمان داری سے انجام دیا۔ اردو پوائنٹ کی اسی حق گوئی اور دیانت داری نے قاری کے اندر یقین و اعتماد پیدا کیا اور آج 'روز نامہ اردو پوائنٹ' پاکستانی اور بین الاقوامی سائبر صحافت کی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کر چکا ہے۔

عصر حاضر جدید تکنالوجی اور تیز رفتار ترقی کا عہد ہے۔ انٹرنیٹ کی ایجاد نے جغرافیائی سرحدوں کے ساتھ تہذیبی، ثقافتی اور لسانی حدود کو بھی منہدم کر دیا ہے۔ غیر ترقی یافتہ زبانیں نزع کی حالت میں دم توڑ رہی ہیں۔ ایسے میں اگر اردو زبان و ادب اور اس کے رسم الخط کو نئی تکنالوجی سے ہم آہنگ نہیں کیا گیا، تو ترقی کے اس دور میں ہمارا ادب، ہماری زبان اور ہماری تہذیب جس پر ہمیں فخر ہے، سب سے پیچھے رہ جائیں گی، کیونکہ دور حاضر میں ترقی و تنزلی کا تمام تر دار و مدار جدید تکنالوجی پر ہے۔ دراں حالانکہ انٹرنیٹ پر ہزاروں ویب سائٹس اور بلاگس موجود ہیں جو اردو کی ترویج و اشاعت کا کام بڑی محنت اور دیانتداری سے کر رہی ہیں۔ ان میں سے معیاری سائٹس کا انتخاب کرنا میرے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ کیونکہ انٹرنیٹ پر اردو میں ڈیجیٹل کتب خانے اور کئی اہم ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی سائٹس موجود ہیں لیکن میرے نزدیک اردو کی ان سائٹوں پر موجود مواد کا معیاری اور مستند ہونا شرط تھا۔ میں نے انھیں سائٹوں کو اپنے مقالے میں جگہ دی ہے، جس پر متن سند کے ساتھ موجود ہے۔ اور جو معیاری ادب کو پیش کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر اردو ادب کے حوالے سے اب تک جو کام ہوا ہے تشفی بخش تو ہے مگر کافی نہیں ہے۔ اس پر ابھی اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اردو کا ادبی سرمایہ اپنے صحیح متن کے ساتھ قارئین تک پہنچے۔ اس ضمن میں کچھ ویب سائٹیں اچھا کام کر رہی ہیں مثلاً بہار اردو یوتھ فورم، کتابستان ڈاٹ کام اور ریختہ ڈاٹ او آر جی دنیا قابل ذکر ہیں، جن کی ستائش اور پذیرائی ہونی چاہیے۔

■

Dr. Khan Mohd Asif
Faculty Dept of Indian Language & Literature
School of Humanities and Social Sciences
Gautam Buddha University
Gautam Buddha Nagar
Greater Noida - 201310 (UP)

قلم کا سپاہی

شاہد رام نگری

ایم رحمت اللہ

شاہد رام نگری اصلی نام سراج الدین انصاری تھا۔ انھوں نے اتر پردیش بنارس کے رام نگر کے علمی، دینی اور مذہبی گھرانے میں 1927 میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد کا نام حافظ ابو محمد امام الدین رام نگری تھا۔ شاہد رام نگری کے والد بزرگوار صرف حافظ قرآن نہیں تھے بلکہ اپنے وقت کے جید عالم دین، مصنف اور شاعر تھے۔

انھوں نے کسی مدرسہ، مکتب یا اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ ان کی ذہانت، محنت لگن اور مطالعہ کتب نے انھیں حافظ، عالم اور شاعر بنا دیا۔ امام الدین کی سات اولاد میں شاہد رام نگری کا تیسرا نمبر تھا۔ معاشی بدحالی کے سبب شاہد کی تعلیم مکتب سے آگے نہ بڑھ سکی۔ لیکن والد کی تربیت اور خود اپنی محنت و لگن، اعلیٰ ذہانت، شوق مطالعہ اور کتب بینی نے شاہد رام نگری کو ملک کے مشہور و معروف صحافیوں کی صف میں شامل کر دیا۔

شاہد کے والد نے جب 1946 میں بنارس میں ساڑیوں کا کاروبار شروع کیا تو اپنے بیٹے شاہد کو بھی اس کاروبار سے منسلک کر لیا۔ لیکن سوءِ قسمت کہیے کہ 1948 میں یہ کاروبار ختم ہو گیا۔ اس کے بعد عبدالخالق سہارنپوری کے دواخانے میں معاون کے طور پر کام کرنے لگے۔ شاہد صاحب 1952 میں پہلی بار اسلامی ساہتیہ سدن کے کام (کتابوں کی توسیع) کے سلسلے میں بہار تشریف لائے۔ مولوی حفیظ اللہ، پھلواری شریف، جو 'مساوات' نکالا کرتے تھے سے ملاقات ہوئی۔ 'مساوات' شاہد صاحب کی صحافتی زندگی کے لیے دلچسپی کا باعث بنا۔ بعدہٗ محمد نور کے اخبار روزنامہ 'ساتھی' سے بحیثیت کاتب اور کاپی پسٹر سے ان کی وابستگی ہوئی۔ اعلیٰ ذہانت و فطانت نے انھیں ہندی اخبارات سے اردو ترجمہ اور اداری نوٹ لکھنے کا سلیقہ سکھا دیا۔ اور ایک وقت وہ بھی آیا جب ان کو 'ساتھی' کی ادارت کی ذمے داری سونپ دی گئی۔ وہ اس امتحان میں کامیاب، کامران ٹھہرے اور وہ اداریہ بھی لکھنے لگے۔

حسب منشا پذیرائی نہ ہونے کے سبب انھوں نے 'الکلام' کا اجرا کیا۔ جلد ہی 'الکلام' کا شمار ریاست کے معیاری پرچوں میں کیا جانے لگا۔ معاشی تنگی کی وجہ سے یہ پرچہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ شاہد صاحب نے ایک بار پھر ہمت جٹائی اور ایک دوسرا اخبار منصۂ شہود آیا۔ جس کا نام 'امروز' تھا۔ 'امروز' کا حشر بھی 'الکلام' جیسا ہی ہوا اور کچھ ہی دنوں کے بعد مالی تنگی کے سبب بند ہو گیا۔

معروف کانگریس لیڈر عبدالقیوم انصاری نے ہفت روزہ اخبار 'مومن دنیا' نکالا تھا۔ اس کی ترتیب و تزئین میں شاہد صاحب نے خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ یہ ہفت روزہ اخبار بھی ایک دو سال کے بعد بند ہو گیا۔ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے امیر شریعت اور مشہور و معروف عالم دین حضرت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مردم و جوہر شناس نگاہوں نے شاہد صاحب کی صحافتی دیانتداری اور بیباکانہ صلاحیت کو پہچان لیا۔ حضرت مولانا نے امارت شرعیہ کے ترجمان ہفت روزہ 'نقیب' کی ادارت کی ذمے داری شاہد صاحب کے سپرد کر دی۔ انھوں نے اپنے فرائض کے تئیں ایماندارانہ اور دیانتدارانہ کردار ادا کرتے ہوئے اس ترجمان کو ایک وقار عطا کیا اور ملک و بیرون ملک میں اس اخبار کو شہرت دوام حاصل ہوئی اور صرف یہی نہیں بلکہ شاہد صاحب کی ایمانداری اور وفاداری ہفت روزہ 'نقیب' کے ساتھ ایسی رہی کہ وہ آخری دم تک اس کے مدیر رہے۔ 'نقیب' میں لکھے گئے شاہد صاحب کے اداریے اور مضامین آج بھی قوم و ملت کے لیے مشعل راہ ہیں۔

عظیم آباد سے اس وقت نکلنے والے مختلف اخبارات 'سنگم'، 'صدائے عام'، 'ایثار' سے شاہد صاحب کے گہرے تعلقات رہے ہیں اور ان کے مضامین اور اداریے ان اخبارات کی زینت بنتے رہے ہیں۔ کثیر الاشاعت معروف روزنامہ 'قومی تنظیم' کی مجلس ادارت سے بھی شاہد صاحب آخری دم تک جڑے رہے۔ قوم و ملت کو ایک نئی سمت عطا کرنے میں ان کی تحریروں نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

شاہد صاحب کبھی کسی مسئلے پر الجھے ہوئے نظر نہیں آئے، اپنے سامنے سخت و ست لہجے میں بولنے والوں کو اپنی شیریں بیانی سے مسخر کر لیتے تھے اور ان سے ملنے والا ہر شخص ان کا گرویدہ اور معترف ہو جاتا تھا۔ مسئلہ چاہے جو ہو، ملی ہو سماجی، سیاسی ہو یا ثقافتی، تعلیمی ہو یا مذہبی جب کبھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے، تو نہ صرف اس کا حق ادا کرتے بلکہ اس کا حل بھی ڈھونڈ نکالتے تھے۔ انھیں زرد صحافت سے سخت ترین نفرت تھی۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے حق بیانی اور صاف گوئی کو ہی منظر عام پر لانا پسند کرتے تھے۔

شاہد رام نگری مزاجاً خاموش پسند اور بے باک صحافی تھے۔ دور اندیش، حق پرست، مستند اور صاحب طرز ادیب تھے۔ انھوں نے سب کچھ قربان کر دیا اس فن کو زندہ رکھنے اور اسے وقار بخشنے کے لیے ان کے پاس دولت تو تھی نہیں لیکن جو کچھ تھا، تن، من، دھن سب نچھاور کر دیا اُردو صحافت کے لیے۔ جس نے خون کو خون نہ سمجھا اور اگر سمجھا تو اسے جلا دیا اردو کے لیے، جنھوں نے قربان کر دیا خود کو وطن کے لیے جنھیں پڑھنے سے آج بھی قوم و ملت کے لیے تڑپ محسوس ہوتی ہے۔

شاہد رام نگری کی ایمانداری، دیانتداری، بیباکی اور حق گوئی نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ کو بھی بے حد متاثر کیا۔ پھلواری شریف کے ایک جلسے میں لالو پرساد نے بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے چیرمین کے عہدۂ جلیلہ کے لیے ان کے نام کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کا پورے مجمع نے تالیوں سے استقبال کیا اور مبارکباد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اتنا ہی نہیں وزیر اعلیٰ موصوف نے شاہد صاحب کو اسٹیج پر بلا کر گورنر سے تعارف بھی کرایا۔

شاہد صاحب کے چیئرمین بنائے جانے کے اعلان نے مدارس اسلامیہ کے اساتذہ وطلبا میں خوشی کی لہر دوڑادی۔ ان کی نامزدگی کے تعلق سے اخبارات نے جلی حروف میں خبریں بھی شائع کیں۔ چیئرمین کا عہدہ پیش کرتے ہوئے وزیراعلیٰ بہار لالو یادو نے کہا تھا۔ ''یہ عہدہ شاہد رام نگری کو اسلامیات کے واقف کار ہونے کے علاوہ ایک سینئر اور تجربہ کار صحافی ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے۔''

بہار قانون ساز کاونسل کے سابق چیئرمین پروفیسر جابر حسین اپنی ڈائری کے مجموعہ 'بے اماں' میں بہ عنوان 'ایک ایماندار آواز کی موت' میں تحریر کرتے ہیں:

''وزیراعلیٰ نے انھیں اس دن جلسہ کے اسٹیج پر بلایا تھا اور گورنر صاحب سے ان کا تعارف کرایا تھا۔ وزیراعلیٰ نے خود قبول کیا تھا کہ شاہد رام نگری کو یہ عہدہ اسلامیات کا واقف کار ہونے کے علاوہ ایک سینئر اور تجربہ کار صحافی ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے۔''

شاہد رام نگری بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے چیئرمین بنائے جانے کے اعلان کے بعد اس عہدہ کو لے کر کافی پریشان تھے کہ جس ادارے کا انھیں چیئرمین بنایا گیا ہے، وہاں اچھے اچھوں کے پائے استقامت میں لغزش آجاتی ہے۔ انھیں صحافتی زندگی سے ایسا لگاؤ تھا کہ وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انھیں یہ اندیشہ تھا کہ وہ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے وابستہ ہو کر اپنی شناخت کھو دیں گے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ زندگی نے انھیں مہلت نہ دی اور وہ اس ذمے داری پر فائز ہونے سے قبل ہی داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

اللہ رب العزت نے ان کے اس اندیشے کی لاج رکھ لی اور وہ ایک بے باک اور ایماندار صحافی کی حیثیت سے امر ہوگئے۔ ہفتہ وار نقیب میں شائع ایک تعزیتی مضمون کے الفاظ ہیں:

''انھیں اندیشہ تھا کہ وہ اس ادارے سے وابستہ ہو کر اپنی شناخت کھو دیں گے۔''

30اکتوبر 1991 کی صبح شاہد صاحب ساڑھے سات بجے چائے اور بسکٹ کا ہلکا ناشتہ لے رہے تھے کہ سینہ میں یکایک درد محسوس کیا اور پونے آٹھ بجے یہ درد ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

شاہد رام نگری کے انتقال کی خبر جب پروفیسر جابر حسین کو دی گئی تو وہ سکتے میں آگئے۔ انھیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ شاہد صاحب گذر گئے۔ پروفیسر حسین نے شاہد صاحب کے انتقال کی خبر اس وقت کے وزیراعلیٰ جناب لالو پرساد کو بذریعہ ٹیلی فون دی۔ پروفیسر جابر حسین کے الفاظ میں:

''آج سویرے ان سے ملنے کی بات تھی۔ ان کا فون آنا تھا۔ امارت شرعیہ سے فون تو آیا لیکن ان کی موت کی خبر لے کر آیا۔ ایک گھڑی کو لگا جیسے اپنے دل کی دھڑکن بھی رک گئی۔ قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحب خود فون پر نہیں ہوتے تو شاید یقین کرنے کو جی نہیں مانتا۔

پھلواری شریف کے راستے میں ایک جگہ رک کر میں نے فون پر ان کی موت کی خبر وزیراعلیٰ لالو پرساد کو دی۔ وہ سن رہ گئے۔ میں نے ان کی آواز سے محسوس کیا، انھیں گہرا دھکا لگا ہے۔ ابھی کل ہی تو انھوں نے شاہد رام نگری کے لیے کابینہ وزیر کا درجہ اور سہولیات منظور کی تھیں۔ اور محکمے کو احکامات جاری کرنے کی ہدایت دی تھی۔ ایک غریب اور پسماندہ طبقے کے قابل آدمی کو عہدہ اور منصب دے کر وہ خود بھی فخر محسوس کر رہے تھے۔''

پروفیسر جابر حسین نے اپنے مضمون میں شاہد رام نگری کو قلم کا سپاہی اور ان کے انتقال کو ایک ایماندار آواز کی موت قرار دیتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''میرے لیے شاہد رام نگری ایک بڑے بھائی سے بھی زیادہ تھے۔ قلم کا ایک ایسا سپاہی جس نے نہ جانے کتنے موقعوں پر روایتی مسلم سیاست سے ہٹ کر سچائی کا ساتھ دیا تھا۔ جب جب مسلم سیاست پر فرقہ پرست موقع شناسوں کا شکنجہ کسنے لگتا، شاہد رام نگری بے خوف وخطر ان شکنجوں کو توڑنے کی مہم میں جٹ جاتے۔

وہ مجھے بے حد عزیز تھے، کیونکہ انھوں نے کبھی اپنے قلم کا، اپنی تحریر کا، اپنے الفاظ اور اپنے عقائد کا سودا نہیں کیا۔ نہ وہ کسی کی آستین کا سانپ تھے، نہ ان کی آستین میں سانپوں کے لیے کوئی جگہ تھی۔

ایک بے حد ایماندار آواز، ایک بے حد پر خلوص عبارت تھے، شاہد رام نگری۔

ان کی موت ایک ایماندار آواز کی موت ہے۔''

میں نے شاہد رام نگری کے متعلق جاننے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ وہ طبعاً خاموش پسند اور سنجیدہ تھے۔ محنت، لگن اور حوصلہ ان کا شعار تھا، کسی بھی مسئلے پر ٹھہر ٹھہر کر اور ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر بولا کرتے تھے۔ وہ ایک بیباک انسان، دوراندیش، محبِ وطن، ایماندار، دیانتدار، حق گو اور قناعت پسند صحافی تھے۔ گرچہ ان کے تعلقات ریاست کے بڑے بڑے عہدیداروں سے تھے۔ انھوں نے اس تعلقات سے فائدہ اٹھانے کے بجائے فقر واستغنا کو ترجیح دی۔ یہی ان کا شیوۂ حیات تھا۔ انھوں نے اپنی محنت اور لگن سے ہی اردو صحافت میں اعلیٰ مقام بنایا اور وہ یہی عظیم دولت اپنے پسماندگان کے لیے چھوڑ گئے۔ یہی وہ شاہد رام نگری تھے جو مرتے وقت بھی صحافیوں اور ادیبوں کے لیے عدیم المثال سند چھوڑ گئے۔ غریب اور ایماندار ہونے کی سند، جن کے بینک اکاؤنٹ میں صرف 325 روپے کی رقم ملی۔ اور یہ وہ رقم تھی جو انھیں ایک ریڈیو پروگرام کے عوض میں ملی تھی۔ کسی شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے:

کیا کروں گا میں شاہوں کا مقدر لے کر
ہاتھ خالی گیا دنیا سے سکندر لے کر

شاہد رام نگری بہار اور اردو دونوں کے یکساں طور پر عاشق تھے۔ بہار سے انھیں ایسا لگاؤ ہو گیا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بہار کے ہو کر رہ گئے۔ بہار سے ایسے جڑے کہ اسی سرزمین پر دم توڑ دیا اور یہاں کی زمین نے انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے سینے سے لگا لیا اور اردو صحافت کا یہ مینار اپنی روشنی آج بھی اسی صورت میں بکھیر رہا ہے کہ ان کے ساتھ کام کرنے والوں اور ان کے سیکھنے والوں کی تعداد آج بھی بہار کی صحافت میں اپنی شراکت کا احساس دلا رہی ہے۔ بہار کی صحافت کا جب بھی ذکر ہوگا شاہد رام نگری کا نام فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ انھوں نے صحافت کا جو معیار قائم کیا وہ باقی تو نہیں رہا لیکن ختم بھی نہیں ہوا اس سے لگتا ہے کہ شاہد رام نگری کے مزاج کی پاسداری کرنے والے اور ان کے موقف کو زندہ رکھنے والے صحافی ہنوز باقی ہیں۔

شاهد رام نگری بهار اور اردو دونوں کے یکساں طور پر عاشق تهے۔ بهار سے انهیں ایسا لگانو هو گیا که وه همیشه همیشه کے لیے بهار کے هو کر ره گئے۔ بهار سے ایسے جڑے که اسی سرزمین پر دم توڑ دیا اور یهاں کی زمین نے انهیں همیشه همیشه کے لیے اپنے سینے سے لگا لیااور اردو صحافت کا یه مینار اپنی روشنی آج بهی اسی صورت میں بکهیر رها هے که ان کے ساتھ کام کرنے والوں اور ان کے سیکهنے والوں کی تعداد آج بهی بهار کی صحافت میں اپنی شراکت کا احساس دلا رهی هے ۔ بهار کی صحافت کا جب بهی ذکر هوگا شاهد رام نگری کا نام فراموش نهیں کیا جاسکے گا۔

Dr. M Rahmatullah
Consulting Editor (Urdu)
Doordarshan News, New Delhi 110049
Mob. No.: 9818462389

جدوراج بلی عیش سلطانپوری کے شعری محاسن

صالحہ رشید

یہ ایک خوشگوار حقیقت ہے کہ شمالی ہندوستان کے غیر مسلموں کو اردو زبان و ادب سے اتنی غیر معمولی دلچسپی رہی جس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔ بابو جدوراج بلی عیش اردو کے ایسے ہی شیدائیوں میں سے ایک ہیں۔ آپ کی نسبت اتر پردیش کے ضلع سلطانپور سے ہے۔ سلطانپور ضلع اتر پردیش کا وہ مردم خیز خطہ ہے جسے اودھ کا دل کہا جاتا ہے۔ علم و ادب کے اعتبار سے اسے ہمیشہ مرکزیت حاصل رہی۔ بابا رام لعل، پنڈت رام نریش ترپاٹھی، ترلوچن شاستری، بابو لکھپت رائے محور، سیایۃ الزماں فکری سلطانپوری، نیر سلطانپوری وغیرہ نے اسی سرزمین پر آنکھیں کھولیں۔ مگر سلطانپور میں گذشتہ صدی جن کے نام وقف رہی وہ بابو جدوراج بلی عیش ہیں۔ بعد کی نسلوں میں دو بڑی ہستیاں بین الاقوامی سطح پر ابھر کر سامنے آئیں۔ وہ ہیں مجروح سلطانپوری اور اجمل سلطانپوری۔ مجروح نے فلمی دنیا میں اپنا پرچم لہرایا تو اجمل نے مشاعرے کے اسٹیج کو نئے معنی عطا کیے۔ آج کی نسل میں بھی کئی نام ایسے ہیں جنھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے ان میں پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر سید خالد قادری، حبیب اجملی، جاہل سلطانپوری، ڈاکٹر کمل نین پانڈے نیاز سلطانپوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ عیش سلطانپوری کے سب سے لائق و فائق شاگرد بابو لکھپت رائے 'محور' سلطانپوری ہوئے۔

بابو جدوراج بلی عیش کی ولادت 14 فروری 1898 کو پرتاپ گڑھ کے محلہ بابا گنج میں ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔ آپ کے والد صاحب کا نام اودھ بہاری لعل تھا جو ایک اسکول ٹیچر تھے۔ وہ اردو فارسی کے ساتھ ساتھ علم نجوم سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ عیش نے 1916 میں میٹرک پاس کیا۔ الہ آباد اس وقت علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ لہٰذا آپ کو مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے الہ آباد بھیج دیا گیا۔ آپ نے 1918 میں فزکس، کیمسٹری اور ریاضی سے کائستھ پاٹھ شالہ الہ آباد سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ کائستھ پاٹھ شالہ سے آپ کو خاص لگاؤ تھا جو آپ کے اس شعر سے عیاں ہے۔

گدگدا جاتا ہے اے عیش جو یاد آتا ہے
وہ زمانہ اسی کالج کی ہوا کھانے کا

اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے ریاضی، انگریزی اور اکنامکس سے بی۔ اے کیا۔ ان کی رہائش کائستھ پاٹھ شالہ کے قریب تھی۔ اس وقت آپ کی انگریزی کی کلاس سینیٹ ہال میں، ریاضی کی کلاس میور کالج میں اور اکنامکس کی کلاس کرائسٹ چرچ کالج میں ہوتی تھی۔ کرائسٹ چرچ کالج جمنا پل کے قریب تھا۔ آپ ہر روز ان تینوں جگہوں پر پیدل چل کر جاتے تھے۔ اپنی پڑھائی پوری کرنے کے بعد ایک سال تک سی۔ اے۔ وی۔ انٹر کالج میں مدرس رہے۔ پھر گورنمنٹ ٹریننگ کالج سے ایل۔ ٹی۔ ٹریننگ کی۔ ٹریننگ کرنے کے بعد 8 جولائی 1921 میں ٹیچر ہو گئے۔ ایک سال وہاں مدرسی کرنے کے بعد 1922 میں گورنمنٹ ہائی اسکول سلطانپور میں منتقل ہو گئے۔ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ الہ آباد میں گذرا۔ شعر و سخن کے ذوق کے سبب آپ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس وقت الہ آباد علمی اور سیاسی اہمیت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا مرکز بھی جانا جاتا تھا۔ یہاں شعر گوئی کی روایت تبھی سے شروع ہو گئی تھی جب دہلی کے شاعروں نے ولی کے وہاں پہنچنے پر ایک نئی زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ دہلی میں ہونے والی ہر تبدیلی کا اثر الہ آباد پر بھی پڑتا تھا۔ لہٰذا یہاں کے شاعروں کا بھی کم و بیش وہی مزاج بنا جو دہلی کے شاعروں کا تھا۔ عیش جب الہ آباد تشریف لائے تو یہاں اس وقت استاد شاعر نوح ناروی کا طوطی بول رہا تھا۔ شہر و بیرون شہر کے مسلم و غیر مسلم شعرا نوح ناروی کی شاگردی کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ نوح ناروی کا سفینۂ ادب یہیں قائم تھا۔ عیش کو بھی یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ سفینۂ ادب کے ایک رکن بنے اور ناخدائے سخن نوح کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔

ہم سب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے۔ مگر ایک ماہر فن استاد شاعر کی راہنمائی اور اصلاح، شاگرد کے فن اور اس کے کلام کو سنوارتی اور نکھارتی ہے۔ استاد، شاگرد کی زبان کی، الفاظ کی، اسلوب کی، فصاحت و بلاغت کی، فن عروض و قافیہ کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ شاگرد کو اس قابل بناتا ہے کہ اس کا کلام اغلاط سے پاک ہو۔ اس میں شستگی آئے۔ نقص اور

کیوں کا گرد و غبار دھل جائے اور کلام میں نکھار پیدا ہو۔ عیش شاعر پیدا تو ہوئے تھے لیکن کلام کی اصلاح اور اس میں شستگی اور سلیقہ پیدا کرنے کی خاطر انھوں نے سفینۂ ادب کا رخ کیا۔ استاد شاعر جناب نوح ناروی کی بارگاہ میں زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ نوح خود استاد داغ کے شاگرد رہے اور ایسے شاگرد جو تا حیات نوح کی روش سخن پر قائم رہے۔ عیش نے جا بہ جا نوح ناروی کی شاگردی کا ذکر اپنے کلام میں فخریہ کیا ہے۔ وہ نہ فقط اپنے استاد نوح ناروی کے لیے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں بلکہ خود ان کی شاعری پر نوح کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ نوح صاحب کا نام آتے ہی کسی بڑے طوفان کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ عیش نے اپنے کلام میں جہاں کہیں خود کو نوح صاحب سے نسبت دی وہاں طوفان و سیلاب کا ذکر ضرور کیا۔ وہ طوفان، وہ سیلاب ان کے استاد سے ان کی محبت کا، عقیدت کا اور ان کی درونی کیفیات کا ہے جو شعر بن کر باہر آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عیش خود پوری سنجیدگی سے شعر کہہ رہے تھے اور آپ کا کلام نیر سلطانپوری کی زیرادارت نکلنے والے رسالے شمع ادب میں باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔ آپ اپنے فن میں پوری طرح ماہر ہو چکے تھے اور طوفان غزلیات برپا کرنے کے اہل تھے مگر عاجزی و انکساری کا یہ عالم کہ نوح ناروی جنھیں ناخدائے سخن کا لقب حاصل تھا، ان کے انتقال پر عیش خود کو ناچار پاتے ہیں۔ ان کی کشتی سخن کا ناخدا نہیں رہا۔ ان کی خامیوں کو اب کون دور کرے گا۔ یہ سوال انھیں پریشان کرتا ہے۔ استاد سے محبت و عقیدت کی انتہا تب نظر آتی ہے جب عیش ان کے سانحۂ ارتحال پر خود کو بے یار و مددگار پاتے ہیں۔ یہ درد ان کی برداشت سے باہر ہو کر ان کی زبان پر آجاتا ہے۔

بے ناخدا ہے عیش میری کشتی سخن
ڈوبیں نہ مجھ کو لے کے میری خامیاں کہیں

نوح صاحب کے تلمذ کے فیض سے اے عیش
ہم بھی اب ہو گئے طوفان اٹھانے والے

ہم کوئی داغ نہیں نوح نہیں ہیں اے عیش
کوئی طوفان غزلیات کہاں سے لائیں

رنج کیا سوز غم دل کی فراوانی کا
خوف کیا اشک مسلسل کی طغیانی کا
بحر و برّ میں میرا اے عیش ہے سکہ جاری
پیرو داغ ہوں شاگرد ہوں طوفانی کا

شعر بزم شعر میں پڑھنا پڑھانا چاہیے
قوت فکر سخن کو آزمانا چاہیے
ناخدا ہیں نوح تو اے عیش کیا خوف و خطر
ہر زمیں ہر بحر میں طوفاں اٹھانا چاہیے

بفیض نوح بحر شعر میں طوفاں اٹھاتا ہوں
رواں ہوتا ہے جب اے عیش جوش اشک تر اپنا

عیش صاحب کو اپنے استاد نوح ناروی سے عشق تھا۔ حال ہی میں ان کی غزلیات کا مجموعہ 'طوفان غزلیات' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ مجموعہ کا ٹائٹل بھی استاد نوح کی مناسبت سے طوفان غزلیات رکھا گیا۔ عیش صاحب کے پوتے ڈاکٹر راجیو سریواستوا ہیں جنھیں اپنی وراثت کی حفاظت کی فکر ہے۔ اسی فکر کے تحت انھوں نے اپنے دادا کے ایک شعر کے مطابق ان کا کلام محفوظ کرنا چاہا۔ چونکہ اس وقت ان کے خاندان میں اردو جاننے والا کوئی نہیں لہٰذا ان کے اردو میں لکھے کلام کو دیوناگری میں منتقل کرایا تاکہ ان کی نسلیں اپنے اجداد کے کارنامے سے واقف ہو سکیں۔ اس مشکل اور غیر معمولی کام کو جناب حبیب اجملی سلطانپوری نے انجام دیا۔ ان کے بڑے بھائی جناب محمد قدیر جاہل سلطانپوری عیش صاحب سے مستفید ہونے والے آخری شاعر ہیں۔ پیش ہے عیش کا وہ شعر۔

تو اپنے ماضی کے حالات سے رہے واقف
کہ ہے یہی ترے مستقبلوں کا سرمایہ

عیش نے اپنے استاد کا نام انتہائی ادب و احترام سے لیا ہے اور ان کے نام کو بامعنی طور پر استعمال کیا ہے۔ استاد کے تئیں ان کی عقیدت ذیل کے شعر سے پوری طرح عیاں ہوتی ہے۔

اے عیش تجھے ہے ہمرگی نوح کامل سے بس اتنی
وہ عرش نشین محفل ہے، تو فرش نشین محفل ہے

عیش بہت خوش اخلاق واقع ہوئے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کے درمیان بہت مقبول تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ انھیں کھیلوں میں بھی دلچسپی تھی۔ وہ کرکٹ، والی بال، ٹینس، بیڈمنٹن، کیرم اور شطرنج کے عمدہ کھلاڑی تھے۔ وہ 1940 سے 1942 تک دو سال دیوریا میں اور 1944 سے 1953 تک رائے بریلی میں رہے۔ 1953 میں ایک سال گورنمنٹ نارمل اسکول میں ٹیچر رہے۔ اس وقت کے صوبہ اتر پردیش کے گورنر نے آپ کی ستائش کی تھی۔ 1955 میں رائے بریلی سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور مستقل طور پر سلطانپور میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑے بیٹے ستیش چند سریواستوا، ان سے چھوٹے گریش چند سریواستوا اور تیسرے جگدیش چند سریواستوا تھے۔ بڑے بیٹے ستیش چند سریواستوا محکمہ تعلیم سے ایس۔ ڈی۔ آئی سے ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر فیض آباد ہوئے اور وہاں سے 1991 میں ریٹائر ہوئے۔ ان کے بیٹے راجیو سریواستوا اس وقت سلطانپور کے مشہور کارڈیولاجسٹ ہیں۔ گریش چند سریواستوا ڈی۔ ایف۔ او میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ جگدیش چند الہ آباد میں کمپیوٹر انجینئر رہے۔ ان کا اپنا کاروبار بھی تھا۔ آپ کی دو بیٹیاں تھیں جن کے نام سشیلا دیوی اور سروجنی سریواستوا تھے۔ عیش کا شعری سفر 20 دسمبر 1936 سے شروع ہو کر 27 مارچ 1970 کو ختم ہوا اور 25 اپریل 1975 کو سانسوں کا سفر ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

عیش صاحب جس خانوادے کے چشم و چراغ تھے وہاں فارسی اور اردو زبان و ادب کے چرچے تھے۔ اس وقت سلطانپور اور اس کے قرب و جوار میں مشاعروں کی دھوم تھی۔ جانشین داغ نوح کا شاگرد ہونا باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ نوح صاحب زبان پر زور دیتے تھے۔ لہٰذا وہ اپنے شاگردوں کو زبان کی باریکیاں سمجھایا کرتے تھے۔ عیش نے جب شاعری شروع کی تو ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ جنگ آزادی عروج پر تھی۔ شعرا انقلابی نظمیں کہہ رہے تھے اور ان کے ذریعہ اپنے ہموطنوں میں جوش بھرنے کا کام کر رہے تھے۔ روایتی غزل کا زور تھم گیا تھا۔ مضامین کی ندرت کی جگہ روز مرہ اور تکرار لفظی نے لے لی تھی۔ عیش کے کلام میں یہ تمام عناصر موجود ہیں۔ ان کی نظم محاذ جنگ سے چند اشعار پیش ہیں۔

پھر پاک کے انداز کہن دیکھ رہا ہوں
پھر بغض و عداوت کا چلن دیکھ رہا ہوں
نظریں طرف گنگ و جمن دیکھ رہا ہوں
کشمیر کے ماتھے پہ شکن دیکھ رہا ہوں

تم کو نہ کہیں لے اڑے خود چال تمھاری
دیکھو تو زمانے کی ہوا کیا ہے فضا کیا

عیش صاحب کی شاعری پوری طرح کلاسیکل اور روایتی ہونے کے باوجود نئے آہنگ سے خالی نہیں ہے۔ جدید نقادوں کا اکثر یہ خیال رہا کہ حسن و عشق، گل و بلبل، جام و مینا، بادہ و ساغر، دیر و حرم، بال و پر، شیخ و برہمن، ناصح، ساقی و رند، شمع و پروانہ، وصل و فراق وغیرہ الفاظ جن کا

استعمال کلاسیکی شاعری کا جزو لازم قرار دیا جاتا ہے ان کے ذریعے فقط عاشقانہ جذبات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ عیش صاحب نے اس روایتی فکر کو غلط ثابت کرتے ہوئے انھیں الفاظ کو علامت بنا کر اپنے شعر میں استعمال کیا اور ان علامتوں سے معاشرے کی فلاح و بہبود کا کام لیا۔ ان کے ذریعے بڑے بڑے مسائل کے حل پیش کیے۔ ایک ہی شعر میں ان کلاسیکی الفاظ کو کتنی خوبصورتی سے پرو دیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

ملیں گے ایک سے ایک آج بزم عشرت میں
شراب جام، سبو شیشہ، شمع پروانے

—

یہ ہے میخانہ یہاں فرق مراتب کیسا
سب پئیں چھوٹے بڑے ایک ہی پیمانے سے

عیش نے اپنے کلام میں تہذیبی روایت کا پورا احترام برتا ہے۔ وہ ان قدروں کے قائل ہیں جو آدمیت کو فروغ دیتی ہیں۔ عیش انسان ہیں۔ ایک عدد حساس دل کے مالک بھی ہیں۔ زمانے کے سرد و گرم سے متاثر ہوتے ہیں۔ دنیا کے مکر و فریب انھیں بھاتے نہیں۔ انسان میں خلوص وہ پاتے نہیں۔ اس لیے زمانے سے شکوے شکایت بھی ان کے کلام میں در آئے ہیں۔

اب نام غرض کا الفت ہے، سب دوست نما دشمن دنیا
انسان فقط انساں ہی نہیں، وہ گرگ کا رشتے دار بھی ہے

—

ان سے بچ بچ کے رہ دل نادان
جھک کے کرتے ہیں جو سلام بہت

—

یوں تو ہر آدمی مکمل ہے
آدمیت ہے ناتمام بہت

ایک طرف ان سے راز قدرت کے معمے حل نہیں ہوتے تو دوسری جانب تفکرات زمانہ کی زنجیروں نے بھی انھیں جکڑ رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا جگر تار تار ہے۔ ان کے خزاں رسیدہ دل کو ذکر بہار بھی ناگوار ہے۔ اس شدت احساس کو شعر کا حسین پیراہن یوں عطا کرتے ہیں۔

کوئی بھی دیر و کعبہ میں نہ پہنچا راز قدرت تک
یہ مشکل کب ہوئی آساں کسی ہندو مسلماں سے

—

کعبے میں خدا دیر میں بھی جلوے خدا کے
پھر دونوں گھروں میں رہی جھگڑے کی وجہ کیا

وہ زمانے کی ناسازگاری اور انسان کی خودغرضی پر فقط آنسو نہیں بہاتے، شکوے نہیں کرتے، مسائل میں اپنی شاعری کو الجھا کر چھوڑ نہیں دیتے، بلکہ ان برائیوں سے زمانے کو پاک کرنے کا مناسب حل بھی تلاشتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

عناد و بغض کو چھوڑیں، کدورت دل کی دھو ڈالیں
ملیں ہنس کر گلے، نادار و ساہوکار ہولی میں

—

خزاں خزاں نہ رہے، ہر چمن رہے شاداب
جو ہر بہار سے مل کر ہر ایک بہار چلے

وہ اہم وصف جو انھیں دیگر شعراء سے ممتاز کرتا ہے وہ ان کی سادگی سچائی، انسان دوستی، اور عوامی زندگی سے وابستگی ہے۔ نامساعد حالات کا شکوہ اکثر ان کی زبان پر آ جاتا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کی مروجہ روایت کو برقرار رکھا۔ کہیں وہ سماجی مبصر نظر آتے ہیں تو کبھی شاعرانہ تعلی سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے بے ثباتی دنیا، اخلاقی اقدار کی پامالی، انسان کی ناقدری، موت کی حقیقت، اور مذہبی رسوم پر بے باکانہ اظہار خیال کیا ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور تصوف دونوں موضوعات کی عکاسی کی ہے۔ ان کے ہاں اسلام کا صوفیانہ وجدان ہے تو ہندو مذہب اور بھکتی کا گیان دھیان بھی ہے جو ذیل کے اشعار سے مترشح ہے۔

کبھی تیری جستجو میں کبھی اپنی جستجو میں
نہ گیا کہاں کہاں میں، نہ پھرا کہاں کہاں میں

—

جاتا کشاں کشاں ہوں الٰہی کدھر کہاں
رہبر کہاں ہے اور کوئی ہمسفر کہاں
پیش نظر ہے جلوہ مگر سوجھتا نہیں
پردہ سرائے حسن میں دیوار و در کہاں

—

یہ دھول اڑانے کا ہولی میں صاف مطلب ہے
رہے نہ دل میں کسی کے غبار ہولی میں

عیش صاحب نے نعت کے ایک شعر میں ساڑھے چودہ سو برس کی اسلامی تاریخ سمو دی ہے۔ یہ ان جیسے باکمال شاعر کا ہی خاصہ ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

نفاق باہمی اور خانہ جنگی سے تھے سب نالاں
محمدؐ متحد کرنے مٹانے جنگ و کیں آئے

اردو شاعری عشقیہ جذبات کے اظہار سے عبارت تھی۔ فارسی شاعری کا اثر اس پر نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ عیش کا کلام بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ غزل کا فن ایجاز و اختصار اور اشارے و کنائے سے عبارت ہے۔ انھوں نے غزلوں میں کہیں روایتی تہہ داری اور کہیں ایجاز کے بجائے وضاحت وصراحت سے کام لیا ہے۔ ان کی بعض غزلیں ایسی ہیں جنھیں قافیہ بند اشعار کے بطور پیش کیا جا سکتا ہے۔ بعض غزلیں جزئیات نگاری، سراپا نگاری کی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ غزل کے تنگ دامن میں محبوب کا سراپا بیان کرنا انتہائی مشکل ہے۔ وہ کام عیش نے کر دکھایا۔ ایک جگہ مشہور فارسی شاعر حافظ کے خیال کو باندھا ہے۔ بقول حافظ ان کی زندگی کا دفتر تو روز ازل سے ہی بے معنی ہو گیا تھا۔ عیش کے یہاں بھی آتش عشق ان کے خمیر میں ملا دی گئی تھی۔ فرماتے ہیں۔

شامل تھی آتش غم تعمیر آب و گل میں
یہ آگ لگ چکی تھی دل کی لگی سے پہلے

مشہور فارسی شاعر خیام کی طرح عیش بھی زندگی کے رازہائے سربستہ کو جاننے کی جستجو میں ہیں۔ معاملات حیات پر غور و فکر میں غرق ہیں۔ عقل ساتھ نہیں دیتی تو کہہ اٹھتے ہیں۔

کھلتی ہی نہیں عقدۂ ہستی کی یہ حقیقت
جو راز ہے راز میں، وہ راز یہی ہے

واردات عشق کی جزئیات اور روداد اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ہنسایا رلایا جلایا ستایا
مجھے عشق نے کھیل کیا کیا کھلائے

یہ تو معاملات حیات تھے، اس کے بعد کا معاملہ دیکھیے۔

نرالے ہیں آداب بزم خموشاں
جو آئے یہاں، جان سے پہلے جائے

صنعت حسن تعلیل کا التزام ملاحظہ ہو

چھالے ہمارے پاؤں کے روئے جو اشک خوں
صحرا میں گل کھلا کے گلستاں بنا دیا

فارسی تراکیب کا استعمال کرتے ہوئے ایک انتہائی عمدہ شعر ملاحظہ ہو

سوز الفت میں اثر آئے کچھ ایسا یارب
داغ دل جل کے چراغ شب تنہائی ہو

منجملہ جدوراج بلی عیش کا کلام اپنے عہد کی بھرپور عکاسی تو کرتا ہی ہے ساتھ ہی تہذیبی اقدار کو بھی ہمراہ لے کر چلتا ہے۔ اس طرح یہ اردو شعر و ادب کی بیش بہا خدمت ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں بیش قیمت اضافہ بھی ہے۔

مآخذ و منابع: (1) طوفان غزلیات، عیش سلطانپوری، 2016۔
(2) نیگ تیور، اپریل تا جون 2015، سلطانپور

■

Dr. Saliha Rasheed
Head Dept of Arabi & Farsi
Allahabad University (UP)

فلسفہ خیر و شر

شرجیل احمد خان

یہ مشت خاک، یہ صرصر یہ وسعت افلاک
کرم ہے یا کہ ستم تیری لذت ایجاد
(اقبال)

یہ کائنات جو ہم پر مسلط کی گئی ہے، باعثِ کرم ہے کہ ستم، مشاہدہ بتاتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق 'خیر' اور 'شر' دونوں عناصر سے ہوئی ہے۔ شاید 'شر' کا 'خیر' پر غلبہ ہے لیکن سوال اٹھتا ہے کہ اگر اس کائنات کو کسی قادر مطلق ہستی نے کسی اعلیٰ مقصد، کسی ڈیزائن اور نقشہ کے تحت استوار کیا ہے تو پھر 'شر' کا کیا جواز ہے۔ ہم کیوں غم والم کے شکار ہوں؟ کیوں درد و دُکھ جھیلیں۔ میر کا ایک شعر ہے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں تو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

آیئے ہم 'خیر و شر' کے مسئلے کو تاریخی پس منظر میں دیکھیں، یہ قدیم مسئلہ ہے۔ بیشتر فلاسفہ نے اس مسئلے پر معروضی (Objective) نگاہ ڈالی۔ انسان اپنی نجی زندگی میں دُکھ درد، غم والم سے کس طرح نبرد آزما ہوتا ہے، اُس پر ان کی نگاہ نہیں گئی۔ انھوں نے اس کو مابعدالطبیعاتی (Meta Physical) مسئلہ بنا دیا۔ مغربی فکریات کے ہر دور میں یہ رویہ رائج رہا۔

یونانی مفکروں کی توجہ اس بات پر مرکوز رہی کہ کن عناصر سے کائنات کی تخلیق ہوئی ہے؟ اس کے پس پشت کس ذہن کی کارفرمائی ہے یا پھر یہ فقط میکانکیل اعمال کی آماجگاہ ہے؟ کیا اس کائنات کا کوئی نصب العین، کوئی مقصد ہے؟ وہ ان ہی مابعدالطبیعاتی باتوں پر غور و فکر کرتے رہے۔ بعد میں مغربی فلاسفہ نے بھی یہی رویہ قائم رکھا۔ انسان اپنی نجی زندگی میں جو غم والم، دکھ درد سے گزرتا ہے، اس پر کسی نے غور نہیں کیا۔ انھوں نے ان مسائل کا کوئی حل نہیں بتایا۔ ایسا لگتا ہے کہ مغربی فلاسفہ نے جان بوجھ کر انسان کو ان مابعدالطبیعاتی سوالوں میں الجھائے رکھا تاکہ وہ دکھ درد کو اپنا مقدر سمجھ بیٹھیں اور ان کے عادی ہوجائیں۔

شوپن ہار، نطشے اور وجودیت والوں نے اس مابعدالطبیعاتی رویے کی سختی سے مخالفت کی۔ ان کا موقف ہے کہ کائنات کے متعلق دورِ حاضر تک جتنے مفروضے قائم ہوئے سب کے سب A-Priori خیالات پر مبنی ہیں۔ فلاسفہ نے کائنات کا براہِ راست مشاہدہ نہیں کیا اور نہ تو انسانی تجربات ہی کو اہمیت بخشی۔ چنانچہ ان کے تمام مفروضے غیر حقیقی ہیں۔ شوپن ہار اور وجودیت والوں کا خیال ہے کہ ایسی استخراجی (Deductive) فکر جو محض A-Prion اصولوں پر قائم ہوں کائنات کی تعبیر میں کارآمد ثابت نہیں ہوسکتی۔ کائنات کی صحیح تعبیر اسی شرط پر ممکن ہے جب ہم انسان کے داخلی اور خارجی تجربات کو مدنظر رکھیں۔ شوپن ہار رقم طراز ہیں:

''میرے خیال میں کائنات کی اسراریت کا حل اس وقت ممکن ہے جب ہم کائنات کو براہِ راست سمجھنے کی کوشش کریں۔ مابعدالطبیعات کا کام یہ نہیں ہے کہ جو تجربات حاصل ہوں ان کو نظرانداز کردیں۔''

شوپن ہار کا خیال تھا کہ خارجی اور داخلی تجربات ہی علم کے اصل منبع ہیں۔

اسی لیے شوپن ہار کسی نظریہ، کسی مکتبِ فکر پر یقین

> ’’اہل یونان اچھی طرح واقف تھے کہ زندگی غم و الم کی آماجگاہ ہے۔ زندہ رہنا ایک جوکھم ہے۔ انسان کسی وقت بھی موت کا شکار بن سکتا ہے۔ پھر بھی یونانیوں نے زندگی کا اثبات کیا، قنوطیت کو راہ نہیں دی بلکہ فن کو بروئے کار لاکر زندگی کی الم ناکی کا قلب ماہیت کردیا۔ انہوں نے اعلان کردیا کہ کائنات ایک جمالیاتی مظہر ہے۔ ہم فن کے ذریعے موت پر فتح پاسکتے ہیں۔‘‘

نہیں رکھتا تھا۔ وہ Hegel کے مطلقیت (Absolution) کا سخت مخالف تھا۔ شوپن ہار کے مطابق فلسفہ ’خیر و شر‘ کے مسئلے کا حل ڈھونڈنے میں بری طرح ناکام رہا۔ شوپن ہار ناکامی کی وجہ بھی بتاتا ہے:

’’اس کے خیال میں فلسفہ کی یہ کوشش رہی کہ ایک ہی جست میں کائنات کے تمام مضمرات معلوم کرلیں جو ممکن نہیں تھا۔ فلاسفہ مظاہرات کے ماورا اشیا کے اصل اور اس کے آپس کے رشتے کے انکشاف میں لگے رہے جو سعی لاحاصل ثابت ہوا۔‘‘

کانٹ نے بھی کہا ہے:

’’انسان مظاہرات Phenomena کے آگے دنیا تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔ اشیا کی پہچان کرسکتا ہے لیکن اشیا بذات خود (things in itself) کو جاننے سے قاصر ہے۔ انسانی ذہن کی معلومات Phenomena تک محدود ہے وہ Nuemona کی خبر نہیں رکھتا۔‘‘

آیئے ہم اب معلوم کریں کہ ’خیر و شر‘ کے تعلق سے نطشے، شوپن ہار اور لبنیز اور دوسرے مفکرین کی کیا آرا ہیں۔

نطشے: نطشے کی خود اپنی زندگی درد و تکلیف میں گزری۔ وہ طویل عرصے تک مہلک امراض کا شکار رہا۔ اس کو ذہنی طمانیت کبھی نہیں ملی۔ اس کے ذہن میں سوال اٹھا۔ انسانی زندگی میں درد و الم، ذہنی اذیت کا کیا جواز ہے۔ کیا اس کا کوئی حل ہے؟ نطشے اقرار کرتا ہے کہ دنیا غم والم سے بھری ہے لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ کائنات میں ’خیر‘ پر ’شر‘ کا غلبہ ہے اور یہ کہ رہبانیت ہی نجات کا واحد راستہ ہے۔

نطشے زندگی کی نفی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی ہمارے لیے ایک نعمت ہے اور یہی زندہ رہنے کا جواز بھی ہے۔ نطشے اپنی معرکہ آرا کتاب Birth of Tragedy میں لکھتا ہے:

’’اہلِ یونان اچھی طرح واقف تھے کہ زندگی غم والم کی آماجگاہ ہے۔ زندہ رہنا ایک جوکھم ہے۔ انسان کسی وقت بھی موت کا شکار بن سکتا ہے۔ پھر بھی یونانیوں نے زندگی کا اثبات کیا، قنوطیت کو راہ نہیں دی بلکہ فن کو بروئے کار لاکر زندگی کی الم ناکی کا قلب ماہیت کردیا۔ انھوں نے اعلان کردیا کہ کائنات ایک جمالیاتی مظہر ہے۔ ہم فن کے ذریعے موت پر فتح پاسکتے ہیں۔‘‘

فن کے متعلق نطشے لکھتا ہے:

’’جب قوتِ ارادی (Will) کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے تو فن ایک ساحرہ کی طرح جلوہ افروز ہوتا ہے اور اپنی ساحری سے دکھ درد، غم والم وحشت و تنہائی سے ہمیں نجات دلاتا ہے۔ یہ فن کا اعجاز ہے۔‘‘

نطشے کے نزدیک ہم دو طریقوں سے زندگی کی الم ناکی سے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔ پہلا طریقہ Apollion ہے۔ یہ طریق کار یونانی دیوتا Apollo سے منسوب ہے۔ اس طریقۂ عمل سے ہم حقیقت پر جمالیاتی پردہ ڈال دیتے ہیں اور ایسی مثالی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں جو حقیقی دنیا سے زیادہ حسین و جمیل ہے۔ دوسرا طریقہ Dinocyean عمل ہے۔ یہ طریقۂ کار شراب کے دیوتا Denocyia کے نام سے منسوب ہے۔ اس کی فنی شکل المیہ اور موسیقی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ المیہ زیست کو جمالیات کے مظہر میں قلب ماہیت کردیتا ہے۔ ارسطو نے اسی طریقۂ عمل کو Catharsis کا نام دیا ہے جس سے ہماری جمالیاتی حس کو تسکین ہوتی ہے اور ہم خود کو وجد کے عالم میں پاتے ہیں۔

Denocyia شراب کا دیوتا تھا۔ اس پر اور اس کے حامیوں پر ہمہ وقت وجد کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ یہ طرزِ عمل ہمیں زیست کے ابدی انبساط سے متعارف کراتا ہے۔ اس طرح فنی یا تخلیقی مواد کی الم ناکی کے باوجود قابل قبول ہوجاتی ہے جو قدر کا حامل ہے۔

شوپن ھار: نطشے سے پہلے شوپن ہار نے دکھ درد، غم و الم کا علاج راہِ فرار میں ڈھونڈا تھا۔ شوپن ہار کے مطابق انسان کی مادی خواہشیں، لالچ، اپنے جسم سے لگاؤ درد و غم کے منبع ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے جوشِ حیات کو سرد رکھے۔ شوپنہار کے مطابق جینے کی خواہش (Will) ہی سب فساد کی جڑ ہے۔ اگر ہم مادی خواہشات کو ترک کردیں، نفس کشی کریں، زندگی کی اوپری چمک دمک سے منہ موڑ لیں تب ہی ہمیں نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ شوپن ہار کا خیال تھا کہ دنیا کی تعبیر میں ایسی استخراجی فکر جو محض A-priori اصولوں پر قائم ہو کارآمد نہیں ہوسکتا۔

کچھ مفکرین نے شوپن ہار کے اس موقف سے انکار کیا کہ مسرت کا حقیقی وجود نہیں ہے، یہ ایک منفی قدر ہے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ ہر خواہش، ہر تمنا میں درد و تکلیف کے اجزاء پنہاں ہیں پھر بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ خوشی و مسرت اپنی ماہیت میں منفی ہیں اور ہمیں ان سے اجتناب کرنا لازم ہے۔ ارسطو نے کہا ہے کہ:

’’اپنے فرض کی ادائیگی ہی میں انسان کی سچی خوشی پنہاں ہے چاہے فرائض کے انجام دینے میں انسان کو کتنی ہی مشکلات درپیش کیوں نہ ہوں۔ انسان اپنے فرض کی ادائیگی کی خاطر ساری زندگی سرگرم رہتا ہے۔ سرگرمیاں ہمیشہ مثبت ہوتی ہیں اور ان سرگرمیوں سے حاصل مسرت کا احساس مثبت قدر کا حامل ہے۔‘‘

اگر ہم شوپن ہار کی یہ بات مان لیں کہ خوشی و مسرت، درد و تکلیف کی غیر موجودگی کا نام ہے تو ہم اس

> ’’اپنے فرض کی ادائیگی ہی میں انسان کی سچی خوشی پنہاں ہے چاہے فرائض کے انجام دینے میں انسان کو کتنی ہی مشکلات درپیش کیوں نہ ہوں۔ انسان اپنے فرض کی ادائیگی کی خاطر ساری زندگی سرگرم رہتا ہے۔ سرگرمیاں ہمیشہ مثبت ہوتی ہیں اور ان سرگرمیوں سے حاصل مسرت کا احساس مثبت قدر کا حامل ہے۔‘‘

نتیجے پر پہنچنے پر حق بجانب ہوں گے کہ وہ شخص جو کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوا خوشی و مسرت سے بھی محروم رہے گا، اگر خوشی و مسرت منفی قدر ہے اور زندگی درد و تکلیف سے مملو تو مسرت فقط طاق نسیاں کی زینت بن کر رہ جائے گی۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو زندگی میں خوش و خرم ہیں۔ ان کی زندگیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ خوشی و مسرت منفی قدر نہیں ہیں۔

یہ بات درست نہیں ہے کہ شوپن ہار ہمیشہ زندگی

راجر بیکن اور ڈیکارٹ کے وقت سے مغربی دنیا میں یہ خیال رائج ہے کہ مادی زندگی کی ضروریات پوری کرلینا ہی زندگی کا اعلیٰ مقصد ہے۔ مغربی مفکرین کی رائے میں ہم فطرت میں پنہاں وسائل کو سائنس کی مدد سے منکشف کرکے ضروریات زندگی کو پورا کرسکتے ہیں۔ اس کے برعکس نطشے کا خیال تھا کہ ہم دکھ درد سے فرار کی کوشش نہ کریں بلکہ ان سے نبرد آزما ہوں اور فن و ادب میں ان کا قلب ماہیت کردیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مادّی خواہشوں کی تسکین کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

کے تاریک پہلو کی عکاسی کرتا ہے اور یہ کہ وہ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ انسان کارہائے نمایاں انجام دینے میں خوشی و مسرت محسوس نہیں کرتا۔ ملحوظ خاطر رہے کہ شوپن ہار نے اپنے مضمون The Wisdom of Life میں خوش آئند زندگی گزارنے کے اصول و قواعد کی نشان دہی کی ہے اور ان کی پیروی کی پرزور وکالت کی ہے۔ تمام مذاہب نے انسانی زندگی میں دُکھ درد کی موجودگی کا اقرار کیا ہے اور ان سے نجات کے راستے بھی مہیا کیے ہیں۔ لیکن یہ سوال تشنہ رہ جاتا ہے کہ جب قادر مطلق نے اس کائنات کی تخلیق، ایک پلان، نقشہ اور خاص مقصد کے تحت کی ہے تو 'شر' کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔

راجر بیکن اور ڈیکارٹ کے وقت سے مغربی دنیا میں یہ خیال رائج ہے کہ مادی زندگی کی ضروریات پوری کرلینا ہی زندگی کا اعلیٰ مقصد ہے۔ مغربی مفکرین کی رائے میں ہم فطرت میں پنہاں وسائل کو سائنس کی مدد سے منکشف کر کے ضروریاتِ زندگی کو پورا کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس نطشے کا خیال تھا کہ ہم دکھ درد سے فرار کی کوشش نہ کریں بلکہ ان سے نبرد آزما ہوں اور فن و ادب میں ان کا قلب ماہیت کردیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مادّی خواہشوں کی تسکین کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بقول غالب

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

ایک خواہش دوسری خواہش کو جنم دیتی ہے۔ یہ سلسلہ غیر مختتم ہے۔

آج جب سائنس ترقی کے بام عروج پر ہے، انسان پھر بھی دکھی ہے وہ خود کو تنہا محسوس کرتا ہے وہ لایعنیت اور بیگانگت کا شکار ہے۔ مشہور وجودی مفکر Marshal نے کہا ہے کہ:

''آج انسانی زندگی لایعنیت کا شکار ہے انسانی زندگی کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ یہ کسی قدر کا حامل ہے۔''

ہر انسان فقط مادّی ضروریات کی تسکین نہیں چاہتا۔ ان کی نظر میں زندگی کی اور بھی ضروریات ہیں۔ مادّی دنیا سے ماورا روحانی دنیا ہے۔ اس کی ضروریات کچھ اور ہیں۔ روز و شب کے پسِ پشت کچھ اور زمانے بھی ہیں جن کے اپنے زمان و مکان ہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

انسانی زندگی سود و زیاں تک محدود نہیں، زندگی سود و زیاں سے برتر ہے۔ سینٹ آگسٹائن نے 'شر' کے آزادانہ وجود سے انکار کیا ہے۔ ان کے خیال میں 'خیر' میں جب کمیاں یا کجی آجاتی ہے تو 'شر' کی نمو ہوتی ہے۔ ورنہ 'شر' اپنی حیثیت نہیں رکھتا۔ کوئی شے جو اپنے میں درست ہے، اگر اس کی کارکردگی میں خامیاں آجائیں، کام حسن و خوبی سے انجام دیے جاسکتے تو 'شر' کے عناصر کی نمو ہوتی ہے۔ آگسٹائن کا خیال ہے کہ خدا نے 'خیر' کی تخلیق کی ہے 'شر' کی نہیں۔ جو کچھ خدا کی مرضی سے معرضِ وجود میں آیا وہ 'خیر' ہے 'شر' نہیں۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'شر' کہاں سے آگیا؟

آگسٹائن جواب دیتا ہے خدا نے اپنی مخلوق کو آزادی کی صفت سے متصف کیا ہے۔ 'شر' ان کی آزادانہ کارکردگی کی پیداوار ہے۔ یہ فطرت کے اصول کے تحت نہیں ہے بلکہ ان کے انحراف کی پیداوار ہیں۔ چنانچہ حضرت آدم سے پہلا گناہ سرزد ہوا جب انھوں نے خدا کے حکم کی نافرمانی کی۔

دوسرے مفکرین کا خیال ہے کہ 'خیر' اور 'شر' دونوں تخلیق ہیں۔ لیکن 'شر' ایک منفی قدر ہے۔ 'خیر' کا نامکمل رہ جانا 'شر' کو دعوت دیتا ہے۔ یہی بات ذہن نشیں رہے کہ تخلیق کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ یہ دنیا ہر لمحہ تکمیل کی طرف رواں دواں ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید

غالب نے بھی کیا خوب ہے کہا ہے۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یہ مفروضہ کہ کائنات کو وجود میں لانے کا مقصد انسانی ترقی و بہبودی ہے، صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ مفروضہ صحیح ہوتا تو کائنات میں نہ 'شر' ہوتا نہ 'خیر' کا وجود ہوتا۔ خدا ایسی اشیا کی تخلیق کرتا جو 'شر' سے پاک ہوتی ہے لیکن ایسی سادہ زندگی ہمیں منظور نہیں ہوتی۔ بے مرچ روغن سالن ہمارے حلق کے نیچے نہیں اترتا۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہم 'شر' سے خالی دنیا کا تصور کر سکتے ہیں لیکن ایسی دنیا کس کام کی جو عمل پیہم کی متقاضی نہ ہو۔ منزل خود سامنے آجائے ہمیں کوہ پیمائی نہ کرنی پڑے۔

آخر میں لبنیز (Lebniz) کے متعلق چند باتیں۔

لبنیز نے کہا ہے کہ:

''یہ دنیا تمام ممکن دنیاؤں میں، سب سے بہتر دنیا ہے۔''

وہ اپنے اس دعوے کی تشریح یوں کرتا ہے۔ دنیا لاتعداد ذرّوں سے تشکیل پائی ہے۔ ان ذرّوں کو لبنیز مناڈ کہتا ہے۔ یہاں ہمیں Democritice کے ایٹم (Atom) کی یاد آجاتی ہے۔ لبنیز کے مطابق Monad

یہ مفروضہ کہ کائنات کو وجود میں لانے کا مقصد انسانی ترقی و بہبودی ہے، صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ مفروضہ صحیح ہوتا تو کائنات میں نہ 'شر' ہوتا نہ 'خیر' کا وجود ہوتا۔ خدا ایسی اشیا کی تخلیق کرتا جو 'شر' سے پاک ہوتی ہے لیکن ایسی سادہ زندگی ہمیں منظور نہیں ہوتی۔ بے مرچ روغن سالن ہمارے حلق کے نیچے نہیں اترتا۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہم 'شر' سے خالی دنیا کا تصور کرسکتے ہیں لیکن ایسی دنیا کس کام کی جو عمل پیہم کی متقاضی نہ ہو۔ منزل خود سامنے آجائے ہمیں کوہ پیمائی نہ کرنی پڑے۔

ایک دوسرے سے آزادانہ کارفرما ہوتے ہیں۔ ان میں علت اور معلول کا رشتہ نہیں ہوتا۔ سبھی موناڈ (Monad) ایک گھڑی کی طرح ہیں جن میں ازل سے ابد تک کے واقعات بھر دیے گئے ہیں۔ تمام گھڑیاں آپس میں ہم آہنگ ہیں۔ اب غور کیجیے یہ Monad بے شمار طریقوں سے آپس میں اتصال کرسکتے ہیں، جس سے بے شمار دنیاؤں کے معرضِ وجود میں آنے کا امکان ہے۔ Lebniz اس امکان کا اقرار کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہماری موجودہ دنیا میں 'خیر' کے مقابلے میں 'شر' کے مناڈ (Monad) بہت کم ہیں۔

■

Sharjeel Ahmad Khan
3.No. Gomti, Bheekanpur
Bhagalpur - 812001 (Bihar)

'تاریخ فرشتہ' کا تنقیدی مطالعہ

اکبر کے عہد کے حوالے سے

روبینہ تبسم

'تاریخ فرشتہ' محمد قاسم ہندوشاہ فرشتہ استرابادی کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ ان کا تخلص 'فرشتہ' ہے۔ انھوں نے اپنے بارے میں زیادہ کچھ نہیں لکھا بس جو کچھ بھی اور جہاں کہیں سے بھی تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوتی ہے وہ تاریخ فرشتہ ہے۔ ان کے والد مولانا غلام علی ایران سے ہندوستان آئے اور مرتضیٰ نظام شاہی کے دور حکومت میں دکن جا کر سکونت اختیار کر لی۔ اسی بادشاہ کے دور میں فرشتہ نے شاہی ملازمت کی شروعات کی۔ انھوں نے سب سے پہلے 'اختیارات قاسمی' کے نام سے طب سے متعلق ایک کتاب لکھی۔ سب سے پہلے فرشتہ کو ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اسلامی عہد حکومت کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا تھا تاہم اس سے ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسے واقعات لکھنے پڑیں جس سے بادشاہ کی ناراضگی کا خطرہ ہو۔ لہٰذا انھوں نے سب سے پہلے ابراہیم عادل شاہ کے باپ علی عادل شاہ کے کچھ شرمناک واقعات لکھ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ فرشتہ کی اس جرأت پر بادشاہ ان کا قتل کروا سکتا تھا لیکن اس نے ان کی حق گوئی کو سراہا۔

'تاریخ فرشتہ' تاریخ کے موضوع پر ہندوستان میں لکھی جانے والی اہم کتابوں میں شامل ہے۔ اس کتاب کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ اس کو لکھنے کے لیے انھوں نے بعض ایسے مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے جو اب دستیاب نہیں۔ اس کتاب میں صرف بادشاہوں کی تاریخ نہیں بلکہ فضلا، علما، مشائخ، شعرا اور ادبا کے بھی احوال زندگی کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ فرشتہ نے ان کے حالات لکھ کر ہم پر احسان کیا ہے ورنہ آج بہت سے گمنامی کا شکار ہو جاتے اور ہم ان کے علمی کارناموں سے ناواقف رہ جاتے۔ انھوں نے اس کتاب کو لکھنے کے لیے جو کتابیں جمع کیں اس میں سب سے بہتر نسخہ 'تاریخ نظام الدین احمد بخشی' کا تھا۔ لیکن اس میں بھی بہت سے ایسے واقعات درج نہیں تھے جن کا فرشتہ کو بذات خود علم تھا۔ لہٰذا جب انھوں نے یہ دیکھا تو ان کا تصنیف و تالیف کا شوق اور تیز ہو گیا۔

فرشتہ نے یہ تاریخ 1606 میں لکھنی شروع کی تھی اور 1611 میں اسے مکمل کیا۔ انھوں نے 23 تاریخی کتابوں سے استفادہ کر کے اس کتاب کو مکمل کیا۔

انھوں نے اس کتاب میں تقریباً 36 عرفا کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ دیگر تاریخی کتابوں کے بالمقابل اس کتاب میں صوفیاء کے حالات زندگی بہت تفصیل سے لکھے گئے ہے۔ اس میں مشائخ سے منسوب کرامات وغیرہ کا بھی اتنا ذکر نہیں ہے جتنا تصوف کی دوسری کتابوں میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں سب سے پہلے چشتی خاندان تصوف کے بانی خواجہ معین الدین محمد حسن سنجری کے احوال اور ان کی تعلیمات پر بحث کی ہے۔ بعد ازاں قطب الدین بختیار کاکی، شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر، سلطان الاولیاء نظام الدینؒ، شیخ زین الدینؒ، شیخ نظام الدین ابوالموید، امیر خسرو، شیخ سلیم قدس کا ذکر ہے۔ اس کے بعد سہروردیہ خاندان کے سب سے پہلے صوفی شیخ بہاؤ الدین زکریا کا تفصیلی حال لکھا ہے۔ علاوہ ازیں صدرالدین عارف، شیخ رکن الدین، سید جلال بخاری، شیخ حسن افغان، شیخ حسام الدین، علاء الدین، وحید الدین، جلال الدین، صدرالدین، کبیرالدین اسمٰعیل وغیرہ کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

'تاریخ فرشتہ' کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستان کے بہت سے شہروں کے قدیم اور جدید دونوں نام ملتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اب دوسری تاریخی کتابوں کے مطالعے میں شہروں کے پہچاننے میں دقتیں نہیں پیش آتیں۔ انھوں نے مزید اس کتاب میں دہلی کے بادشاہوں کے تعمیر کردہ شہر، مساجد، قلعے، عمارات وغیرہ کے متعلق بہت سی ضروری اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ نیز اس کتاب میں ہمیں ہندوستان کی پوری ایک تہذیب دکھائی دیتی ہے۔ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے رسوم و عقائد، ملک کے معاشی حالات، درباری جشن وغیرہ۔

زیر مطالعہ کتاب کے اہم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعد کے مورخین نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ فرشتہ کو بعد کے مورخین نے معتبر مانا ہے۔ مثلاً امیر حیدر حسینی بلگرامی نے 'سوانح اکبری' لکھنے کے لیے فرشتہ کو اپنا مآخذ بنایا۔ اسی طرح 'تاریخ فرشتہ' کے انگلش، اردو اور مراٹھی میں ترجمے بھی ہوئے ہیں۔

'تاریخ فرشتہ' دیباچہ، مقدمہ، مقالات اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ فرشتہ نے مقدمے کا آغاز اہل ہندوستان کے عقائد سے کیا ہے۔ انسان کی پیدائش کے متعلق مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے عقیدوں کے بارے میں بتایا ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اس دنیا کی گردش چار ادوار پر ختم ہوتی ہے۔ (1) ست یگ

(2) ترتیا یگ (3) دواپر یگ (4) کل یگ اور پھران چاروں ادوار کی مدت کا ذکر کیا ہے۔ نیز ہندوؤں کی مذہبی اور مستند کتاب 'مہابھارت' کا خلاصہ پیش کیا ہے اور ساتھ ہی کوروؤں اور پانڈوؤں کے حالات لکھے ہیں۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت آدمؑ اس دنیا کے سب سے پہلے انسان ہیں اور ہم سب آدم کی اولاد ہیں۔ طوفان نوح کے بعد نوحؑ کے تینوں بیٹوں سام، یافث اور حام کے ذریعے (جو نوح کے حکم کے مطابق دنیا کے چاروں طرف پھیل گئے تھے) اس دنیا کی آبادی بڑھی۔

فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے کشن نے کس طرح حکومت کی۔ باپ کے بعد بیٹے مہاراج نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ پھر اس کے بیٹے کیشو راج اور پھر منیر رائے نے حکومت کی۔ منیر رائے کے بعد اس کا بیٹا بادشاہ نہیں بن سکا کیونکہ منیر رائے کی بدعہدی اور بے وفائی کی وجہ سے پہلوان رستم نے راجہ سورج کو سلطنت سونپی۔ مزید آگے لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں کس طرح بت پرستی کا چلن عام ہوا۔ آگے چل کر لہراج کی حکومت، کیدار برہمن، شنگل، برہٹ، مہاراج کچھواہہ، کیدراج، جے چند، راجہ دہلو، راجہ فور، راجہ سینسار، راجہ جونہ، راجہ کرپان چند، راجہ بکرماجیت، راجہ بھوج، راجہ باسدیو، راجہ رام دیو، پرتاپ چند سیسودیہ، انند دیو، مالدیو کی حکومت کا بیان ملتا ہے۔ اس کے بعد فرشتہ نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا ذکر کیا ہے۔

مقالہ اوّل میں لاہور کے سلاطین کا تذکرہ ہے جس میں الپتگین اور سبکتگین کے ابتدائی حالات و دور حکومت، محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے اور فتوحات، فتح سومنات، محمود کے دربار کے وزرا اور اس کے دور کے مشہور شاعر، عصائری، اسدی، طوسی، منوچہر بلخی، حکم عنصری، عسجدی، فرخی، دقیقی وغیرہ کا ذکر ہے۔ پھر مسعود بن محمود غزنوی کے دور حکومت اور ان کے جانشینوں کا ذکر کرتے ہوئے خسرو ملک بن خسرو شاہ پر یہ مقالہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

مقالہ دوم میں سلاطین دہلی کا بیان ہے۔ ابتدا میں ہندوؤں کے عقائد کا ذکر ملتا ہے۔ دہلی کی بنا، غوریوں کے احوال، شہاب الدین محمد غوری کا دور حکومت، خاندان سادات، سلاطین مغل، افغانوں کی حکومت اور پھر جلال الدین محمد اکبر کے عہد حکومت پر یہ مقالہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔ فرشتہ نے اس مقالے میں غلام خاندان کے بزرگان دین شیخ جالیدہ اور شیخ زین الدین کے بارے میں اہم باتیں بتائی ہیں۔ اکبر کے بعد مقالہ سوم کا آغاز سلاطین بہمیہ سے ہوتا ہے، جس میں سب سے پہلے سلطان علاؤالدین حسن گانگو بہمنی کے دور حکومت کا بیان ہے۔ مقالہ سوم کہاں ختم ہوتا ہے اس کا پتہ لگانا مشکل ہے کیونکہ کتاب میں آگے چل کر مقالہ چہارم کی سرخی دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ علاؤ الدین بن احمد شاہ پر جلد دوم اختتام پذیر ہوتا ہے۔ جلد سوم بیجاپور کے سلاطین اور احمد نگر کے سلاطین نظام شاہی سے متعلق ہے۔ جلد چہارم سلاطین تلنگانہ اور سلاطین گجرات، شاہان مالوہ و مندو، سلاطین خلجیہ، مالوہ کے حالات، برہان پور کے فاروقی سلاطین، سلاطین شرقیہ اور سلاطین پوربیہ کے مکمل حالات، سلاطین سندھ اور ٹھٹھ کے حالات، زمینداران سندھ یعنی قبیلہ سَمّ گان کی حکومت، سلاطین کشمیر اور آخر میں ایک حصے میں خاندان چشتیہ کے مشائخ کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں خاندان سہروردیہ ملتان کے مشائخ کا ذکر ملتا ہے۔

> فرشتہ نے تاریخی واقعات اور مشائخ کے علاوہ ہر دور کے علماء کا بھی ذکر کیا ہے۔ عہد غلامان میں منہاج الدین، عوفی، فخر الملک عصامی کا ذکر ملتا ہے۔ مزید انہوں نے علائو الدین خلجی کے دور کے 46 علماء کی فہرست دی ہے۔ محمد شاہ بہمنی کے دور میں میر فضل اللہ انجو شیرازی اور سلطان ابراہیم شرقی کے عہد میں عظیم عالم فاضل قاضی شہاب الدین جونپوری کا ذکر ملتا ہے۔

فرشتہ نے تاریخی واقعات اور مشائخ کے علاوہ ہر دور کے علماء کا بھی ذکر کیا ہے۔ عہد غلامان میں منہاج الدین، عوفی، فخر الملک عصامی کا ذکر ملتا ہے۔ مزید انھوں نے علاؤ الدین خلجی کے دور کے 46 علماء کی فہرست دی ہے۔ محمد شاہ بہمنی کے دور میں میر فضل اللہ انجو شیرازی اور سلطان ابراہیم شرقی کے عہد میں عظیم عالم فاضل قاضی شہاب الدین جونپوری کا ذکر ملتا ہے۔

چونکہ ہمیں اکبر کے عہد کے حوالے سے بات کرنی ہے لہٰذا فرشتہ نے اکبر کے عہد حکومت، اس کی زندگی کے حالات و واقعات کو جس طرح بیان کیا ہے اس کو مختصراً یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

ہمایوں کی وفات کے بعد اکبر کو 13 سال کی عمر میں دوسری ربیع الثانی 963ھ میں کلانور میں تخت پر بٹھایا گیا اور بیرم خاں جو سپہ سالاری کے عہدے پر فائز تھا اسے وکیل السلطنت بنادیا گیا۔ اکبر نے سب سے پہلے سکندر شاہ سے جنگ کرنے کے لیے کوہ شوالک کی جانب قدم بڑھایا۔ ایک خونریز جنگ کے بعد سکندر شاہ پہاڑوں میں روپوش ہوگیا۔ اسی دوران سلیمان میرزا نے کابل و بدخشاں پر لشکر کشی کی اگرچہ تجربہ کار منعم خاں نے اس قصے کو ختم کردیا لیکن وہیں دوسری جانب سلطان عدلی کے وزیر ہیمو بقال نے آگرے کو اپنے قبضے میں کرلیا اور تردی بیگ جیسے حکمراں نے دشمن سے انتقام لینے کے بجائے دہلی کو خالی کردیا۔

اکبر نے یہ تمام واقعات جالندھر میں سنے اب پنجاب کے علاوہ باقی تمام ہندوستان افغانوں کے قبضے میں آچکا تھا۔ اس ریشہ دوانی کو مدنظر رکھتے ہوئے اکبر نے بیرم خاں کو 'خان بابا' کا خطاب عنایت کرکے تمام ملکی و سیاسی امور اس کے سپرد کردیا۔ بیرم خاں سیاسی مجرم تردی خاں کا قتل کرادیتا ہے۔ پھر اکبر اپنے لشکر کو لے کر دہلی روانہ ہوتا ہے اور تمام افغانیوں کو شکست دے کر ہیمو کا قتل کردیتا ہے۔ وہ ہیمو کے سر پر تلوار مارنے کی وجہ سے 'غازی' کے لقب سے مشہور ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد اکبر سکندر شاہ کے خاتمے کے لیے پنجاب روانہ ہوتا ہے۔ سکندر مان کوٹ کے قلعے میں محصور ہوجاتا ہے۔ چھ ماہ کے محاصرے کے بعد سکندر ہار مان لیتا ہے۔ پھر اسی دوران اکبر علی قلی خاں سے ناراض ہوجاتا ہے۔ مزید بیرم خاں سے بھی بدگمانی ہوجاتی ہے۔ اسی طرح بیرم خاں بعد میں کچھ غلطیاں کرتا ہے جس سے اکبر سے دوری اور بڑھ جاتی ہے۔ وہ اپنے ملازم مصاحب بیگ کا قتل کرادیتا ہے۔ نیز ملا پیر محمد (جو بادشاہ کا استاد اور مقرب خاص تھا) کو خارج البلد کرکے مکہ روانہ کردیتا ہے کیونکہ بیرم کو اس کا اقتدار اور غلبہ پسند نہیں تھا۔ آخر جلد ہی وہ اپنی غلطیوں پر پشیمان ہوکر اکبر سے معافی مانگ لیتا ہے اور پھر مبارک خاں نامی شخص کے ہاتھ اس کا قتل ہوجاتا ہے۔ فرشتہ نے بیرم خاں کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ وہ شعر گوئی اور انشا پردازی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے فارسی اور ترکی زبانوں کے دو دیوان موجود ہیں۔ اس نے ائمہ اہل بیت کی مدح میں قصیدے بھی لکھے۔

فرشتہ نے آگے اکبر کی فتوحات کا بھی ذکر کیا ہے کہ کس طرح اس نے ادہم خاں اتکہ کے ذریعے مالوہ کو فتح کروایا اور میرزا شرف الدین کے توسط سے قلعہ میرٹھ کو فتح کیا۔ اکبر ان فتوحات کے ساتھ ہی تعمیر کا کام بھی انجام دیتا ہوا چلتا ہے مثلاً 972ھ کے سال میں آگرہ کے قلعے کو مسمار کرکے ازسرنو سرخ پتھر سے تعمیر کرواتا ہے۔ یہ عمارت چارسال میں مکمل ہوتی ہے۔ اسی زمانے میں اوزبک بغاوت

کر دیتے ہیں۔ اکبر ان پر فوج کشی کرتا ہے۔

چتوڑ گڑھ کا راجا رانا اودے سنگھ اکبر کا اطاعت گزار نہیں تھا۔ لہٰذا اکبر اس کو راہ راست پر لانے کے لیے نکل پڑتا ہے۔ اس دوران بادشاہ قلعہ شیوپور کو فتح کرتا ہے اور جب تک وہ قلعہ چتوڑ تک پہنچتا ہے، رانا اپنے بچوں کو لے کر محفوظ مقام پر جا چکا ہوتا ہے۔ اکبر قلعے پر حملہ کرتا ہے اور پانچ ہزار سنگتراشوں، لوہاروں، بڑھیوں وغیرہ اور زمین کھودنے والوں کو 'ساباط' تیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہاں پر فرشتہ نے 'ساباط' کی وضاحت کی ہے کہ اس سے مراد وہ ایسی دیواریں ہیں جن میں تفنگ انداز کا فاصلہ ہوتا ہے۔ جب یہ دونوں مکمل ہو جاتی ہیں تو نقب کھودنے والے ان دیواروں کے وسیع راستے سے قلعے کے نیچے آکر نقب کھودتے ہیں اور پھر اس میں بارود بھر کر قلعے کے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔

اس طرح ساباط تیار ہونے کے بعد دو نقبیں کھود کر اس میں آگ لگائی گئی۔ ایک نقب میں آگ جلدی لگ گئی لیکن دوسرے نقب میں نہیں لگی۔ شاہی لشکر کے ایک ہزار سپاہی جب اس راستے سے گئے تو وہاں انھیں کوئی راستہ نظر نہیں آیا اور ابھی سپاہی وہیں موجود ہی تھے کہ نقب میں آگ لگ گئی اور برج ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ سپاہیوں کے جسم پارہ پارہ ہو کر ادھر اُدھر بکھر گئے اس سے اکبری لشکر کا بہت نقصان ہوا۔

پھر ایک دن بادشاہ کو قلعہ کے پاس جمل نظر آیا۔ یہ رانا کا قریبی عزیز اور اہل قلعہ کا سردار تھا۔ بادشاہ نے جمل کو گولی ماری وہ وہیں گر گیا۔ راجپوتوں نے اپنے سردار کی یہ حالت دیکھی تو لڑائی سے ہاتھ اٹھالیا۔ اس طرح قلعہ چتوڑ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ رجب 976 میں اکبر نے رنتھنبور کے قلعے کو بھی فتح کر لیا۔

جب اکبر کے یہاں شہزادہ سلیم کی پیدائش ہوئی تو اس وقت خواجہ حسن ثنائی نے بادشاہ کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا۔ اس کے ہر شعر کے پہلے مصرعے سے اکبر کی تخت نشینی اور دوسرے مصرعے سے شہزادہ سلیم کی تاریخ پیدائش نکلتی ہے۔ اسی زمانے میں قلعہ کالنجر بھی اکبر کے قبضے میں آ گیا۔ اس کے بعد اکبر نے قصبہ سیکری میں ایک بہت بڑے شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام فتح پور رکھا۔

ان تمام تر فتوحات کے بعد اکبر گجرات کی طرف متوجہ ہوا۔ سب سے پہلے اس نے احمد آباد کو فتح کیا۔ اس وقت ابراہیم میرزا بھروچ کے علاقے میں اور محمد حسین میرزا سورت میں مقیم تھے۔ اس نے دونوں کو شکست دی اور قلعہ سورت بھی فتح ہو گیا۔ پھر اس نے پٹنہ کو فتح کیا۔

> **فرشتہ نے اکبر کی پیدائش سے لے کر اس کے مرنے تک کی تمام ضروری باتیں بتادی ھیں لیکن انھوں نے کھیں بھی اکبر کے عھد میں لکھی گئی یا ترجمہ کی ھوئی کسی کتاب کا ذکر نھیں کیا اور نہ ھی انھوں نے کھیں بھی اس بات کا ذکر کیا کہ اکبر کو تاریخ میں اتنی دلچسپی تھی کہ اس نے اپنے ارباب خدمت کو تاریخ لکھنے کا حکم دیا تھا۔**

اکبر نے 991 کے سال میں پراگ پر جو گنگا اور جمنا کے درمیان واقع ہے ایک قلعے کی تعمیر کی اور شہر الہ باس بسانے کا حکم دیا بعد میں یہی شہر الہ آباد کے نام سے مشہور ہوا۔

آگے چل کر فرشتہ نے عبدالرحیم ولد بیرم کے کارنامے کے بارے میں بتایا کہ کس طرح اس نے مظفر شاہ گجراتی (جس نے شیر خاں گجراتی کے ساتھ مل کر گجرات میں فتنہ وفساد برپا کیا اور احمد آباد پر قبضہ کر لیا تھا) کو شکست دی اور اکبر نے اس کے کارنامے سے خوش ہو کر 'خان خاناں' کے خطاب سے سرفراز کیا۔

فرشتہ نے لکھا ہے کہ اکبر اچھی طرح پڑھ لکھ نہیں سکتا تھا لیکن اسے علم سے لگاؤ تھا اور کبھی کبھی شاعری بھی کرتا تھا۔

بہر حال بعد میں کشمیر دوبارہ سے اکبر کی سلطنت میں آ جاتا ہے۔ مزید دکن بھی فتح ہو جاتا ہے۔

فرشتہ نے مختصراً یہ بھی بتا دیا ہے کہ اکبر کے عہد میں 'ڈاک چوکی' کا معقول انتظام تھا۔ اس کے دروازے پر جتنے ہاتھی تھے اتنا کسی بادشاہ کے دروازے پر نہیں تھے۔ فرشتہ نے اکبر کے ترکہ کی بھی تفصیل بیان کر دی ہے۔

13 جمادی الاوّل 1014ھ کو اکبر کا انتقال ہوا۔ اس نے اکاون سال اور چند مہینے تک حکومت کی۔ 'فوت اکبر شاہ' سے بادشاہ کا سال وفات برآمد ہوتا ہے۔

اکبر کا قطعہ تاریخ وفات یہ ہے۔

جلال الدین محمد شاہ اکبر
ز دنیا گشت سوئے خلد راہی
چوں رضواں وید حیراں شد کہ ایں کیست
ندا آمد کہ یک ظل الٰہی

فرشتہ نے اکبر کی پیدائش سے لے کر اس کے مرنے تک کی تمام ضروری باتیں بتا دی ہیں لیکن انھوں نے کہیں بھی اکبر کے عہد میں لکھی گئی یا ترجمہ کی ہوئی کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی انھوں نے کہیں بھی اس بات کا ذکر کیا کہ اکبر کو تاریخ میں اتنی دلچسپی تھی کہ اس نے اپنے ارباب خدمت کو تاریخ لکھنے کا حکم دیا تھا۔

بہر حال ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکبر اگرچہ تعلیم یافتہ نہیں تھا لیکن تصنیف وتالیف وتراجم کے لحاظ سے اس کا دور ایک زریں دور ہے۔ مختلف زبانوں کی کتابیں اس کے دربار میں لائی جاتیں۔ اکبر ان کو غور سے سنتا اور اپنی رائے دیتا۔ کیمیائے سعادت، قابوس نامہ، گلستان، حدیقہ، مثنوی معنوی، جام جم، بوستان، شاہنامہ وغیرہ یہ سب کتابیں دربار میں پڑھی جاتیں۔ اس کے عہد میں بہت سی دوسری زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کیا گیا جس سے اس زبان کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مثلاً مہابھارت اور رامائن کو ہندی سے فارسی، معجم البلدان کو عربی سے فارسی، واقعات حضرت گیتی ستانی کو ترکی سے فارسی، اس کے علاوہ کتاب اثمرین، تاجک، ہربنس، تاریخ کشمیر، قصہ عشق نل ودمن وغیرہ کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اکبر کے کہنے پر ''تاریخ الفی'' کے نام سے تاریخ کی کتاب لکھی گئی۔

اگرچہ فرشتہ نے اکبر کے عہد حکومت کو پیش کرنے کے لیے اکبر نامہ کو سامنے رکھا اور اس کی تلخیص لکھی ہے لیکن اس کے باوجود اگر وہ چاہتے تو اس کے سلسلے میں کچھ ضروری باتیں اپنی معلومات سے بتا سکتے تھے۔ مثلاً اکبر کا عقیدہ 'دین الٰہی' اس کی زندگی کا ایک اہم پہلو رہا ہے جس کے بارے میں فرشتہ نے کچھ نہیں لکھا جبکہ ملا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے اس نئے دین 'دین الٰہی' کے نفاذ کے سلسلے میں تفصیلاً گفتگو کی ہے۔

غرض یہ کہ مغلیہ سلطنت کے زوال تک ساڑھے چھ سو سال فارسی سرکاری زبان رہی اور اس میں خوب ترقی ہوئی۔ اس دور میں بہت سے عالم، فاضل اور مورخ پیدا ہوئے جنھوں نے فارسی زبان کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ اسی لیے اس دور میں فارسی زبان میں مختلف النوع موضوعات پر کتابیں سامنے آئیں۔ تاہم اس دور کے علمانے جس چیز پر اپنی خصوصی توجہ صرف کی وہ تاریخ نگاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی تاریخ اگر کسی زبان میں مکمل طور پر ملتی ہے تو وہ فارسی ہے۔ 'تاریخ فرشتہ' بھی فارسی زبان میں لکھی ہوئی ایک ایسی ہی تاریخ کی کتاب ہے جو اپنی کم وبیش غلطیوں کے باوجود ایک مستند، معتبر اور ہندوستان کی ایک مکمل تاریخی کتاب ہے۔

■

Rubeena Tabassum
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

محمود فیصل

حفیظ جالندھری
بہ حیثیت افسانہ نگار

بیسویں صدی میں اردو ادب کے اہم معماروں میں حفیظ جالندھری کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے افکار عالیہ نے اردو نظم و نثر کو جو سرمایہ فراہم کیا ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ حفیظ جالندھری آسمان اردو ادب پر ایک شاعر کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں۔ انھوں نے خوبصورت گیت، عمدہ ترانے، بہترین غزلیں اور شاہنامہ اسلام جیسی شاہکار تخلیق پیش کی ہے۔ ان کی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے 1934 میں حکومت برطانیہ نے انھیں 'خان صاحب' کے خطاب سے نوازا۔ 1936 میں نواب ٹونک نے 'ملک الشعرا' کا خطاب عطا کیا۔ 1937 میں مہاراجہ سرکشن پرساد صدر اعظم دولت آصفیہ نے 'حسان الملک بہادر' کا خطاب دیا۔ 1945 میں حکومت برطانیہ نے جنگ عظیم میں وفاداری کے صلے میں 'خان بہادر' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ 1956 میں حفیظ جالندھری کو ملی جذبات و خدمات کے اعتراف میں 'ہلال امتیاز' کا تمغہ عطا کیا گیا اور 6 جولائی 1968 میں پاکستانی قومی ترانے کے خالق کے طور پر ایک خصوصی اعزاز 'نقرئی قلمدان' پیش کیا گیا۔

حفیظ جالندھری نے مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی اور اہل نقد و نظر سے داد و تحسین وصول کی۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی ادیب ایک سے زائد اصناف کو اپنے تخلیقی دائرے میں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے لیے ان اصناف کے ہر جز کا حق ادا کرنا تقریباً ناممکن سا ہوتا ہے، کیونکہ کسی ادیب کا ایک صنف پر عبور حاصل کرنا تو آسان عمل ہے، مگر ہر صنف کا ماہر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ جیسے میر اور غالب کی عظمت کا ہر کوئی قائل ہے۔ دونوں کی غزلیں اردو ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔ لیکن میر کی مثنوی میر حسن کی مثنوی کا مقابلہ نہ کر سکی اور غالب کا قصیدہ ذوق یا سودا کے قصیدوں کا مقام حاصل نہ کر سکا۔

حفیظ جالندھری جتنے اچھے شاعر اتنے ہی عمدہ نثر نگار بھی تھے۔ ان کے مجموعہ کلام کے تعارف یا دیباچے کی تحریریں اور عمدہ زبان اس کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کے یہاں باقاعدہ نثر لکھنے کا رجحان موجود ہے۔ ان کی نثری خدمات میں 'نثرانے' (مضامین کا مجموعہ ہے)، 'چیونٹی نامہ' (اس میں مختلف طرح کے مضامین شامل ہیں، جس میں اکثر مضامین چیونٹی سے متعلق ہیں)، 'بدر شہزادہ۔ جواہر شہزادی'، 'بدرالدین حسن کی خوابی دلہن'، 'عمرو عیار (حصہ اول)'، 'انتخاب دیوان حالی' اور 'حفیظ تاشقند میں (سفرنامہ)' شامل ہیں۔

حفیظ جالندھری کی حیثیت شاعری میں ایک مسلم الثبوت استاد کی ہے۔ بطور افسانہ نگار ان کی شناخت کسی دور میں نہیں رہی۔ مگر حفیظ جالندھری نے افسانہ لکھتے وقت افسانوں کے تمام فنی لوازم کو پیش نظر رکھا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ایسے افسانہ نگاروں کی صف میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ جنھوں نے معاشرتی مسائل کو موضوع بنا کر انسانوں کے اضطراب اور بے چینی کو سمجھنے اور اس کی مکمل ترجمانی کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ کردار کے جذبوں اور اس کے داخلی پہلوؤں سے بھی غافل نہیں رہے، بلکہ افسانہ لکھتے لکھتے حفیظ جالندھری جدید افسانہ نگاری کی حدود کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔

حفیظ جالندھری کی افسانہ نگاری کی شروعات بھی ضرورت کے پیش نظر ہوئی تھی۔ 1924 میں انھیں معروف ادبی رسائل 'نونہال'، 'ادب اطفال' اور 'ہزار داستان' کی ادارت کی پیش کش کی گئی۔ 'ہزار داستان' میں طبع زاد افسانوں کے بالمقابل انگریزی ادب سے ماخوذ افسانوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا تھا، رسالے میں مدیر کا افسانہ شامل ہونا اس کی لیاقت و صلاحیت کی دلیل ہوتی تھی۔ حفیظ جالندھری بطور مدیر ان افسانوں کی نوک پلک تو سنوارتے تھے، لیکن اس وقت تک حفیظ جالندھری نے کوئی افسانہ نہیں لکھا تھا، ان کے ادبی حریفوں کو طعن و تشنیع کا ایک موقع ہاتھ آ گیا، تب حفیظ جالندھری کو انگریزی زبان سے عدم واقفیت کا شدت سے احساس ہوا۔ اس مشکل کا حل تلاش کرنے اور حریفوں کو لاجواب کرنے کے لیے حفیظ جالندھری نے طبع زاد افسانہ لکھنے کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا افسانہ رسالہ 'ہزار داستان' مارچ 1924 میں 'احساس آوارگی' کے نام

سے شائع ہوا، لاہور کے ادبی حلقوں میں اس افسانے کی بہت پذیرائی ہوئی، اس حوصلہ افزائی سے حفیظ جالندھری کی ہمت بندھی اور انھوں نے اس کے علاوہ کئی افسانے تحریر کیے۔ حریفوں کا یہ احسان ہے کہ ان کے طعن وتشنیع نے حفیظ جالندھری کو افسانہ نگار بنادیا اور اس کی وجہ سے اردو دنیا دو افسانوی مجموعے 'ہفت پیکر' اور 'معیاری افسانے' سے مالا مال ہوگئی۔

حفیظ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'ہفت پیکر' کے نام سے 1929 میں منظر عام پر آیا۔ کتاب کا انتساب معروف افسانہ نگار 'سجاد حیدر یلدرم' کے نام ہے۔ سید امتیاز علی تاج نے 'ہفت پیکر' کا بہت طویل مقدمہ تحریر کیا ہے۔ سید امتیاز علی تاج نے مقدمے میں لکھا ہے کہ حفیظ جالندھری ایک اچھے افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی شاعری کی شہرت وعظمت نے ان کے افسانوں کے حقیقی معیار و مرتبے کو سامنے آنے نہیں دیا۔ اس سلسلے میں سید امتیاز علی تاج رقمطراز ہیں:

''اردو ادب میں حفیظ صاحب کو جو شہرت اور ناموری حاصل ہوئی ہے وہ تمام تر ان کی شاعری کی ممنون احسان ہے اور اس میں ان کے مختصر افسانوں کو ذرا بھی دخل نہیں۔ جو لوگ انھیں بحیثیت شاعر کے جانتے ہیں ان میں سے اکثر کو علم نہ ہوگا کہ وہ مختصر افسانہ لکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان سے کہا بھی جائے کہ حفیظ کے افسانے ان کی شاعری سے کم قابل قدر نہیں تو فی الحال کوئی اس پر غور کرنے کو آمادہ نہ ہوگا۔ لوگ حفیظ کی شاعری سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ اب انھیں کسی دوسری حیثیت میں دیکھ کر داد دینے کی مطلق گنجائش نہیں رہی۔''[1]

'ہفت پیکر' کے مقدمے میں ہی سید امتیاز علی تاج نے حفیظ جالندھری کی افسانہ نگاری پر بھی بحث کی ہے اور افسانوں کے اقتباسات پیش کر کے ان کی فنی حیثیت پر رائے بھی قائم کی ہے۔ حفیظ کے افسانوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''حفیظ خصوصیت سے ایسے تاثر کو محسوس کرتا ہے جو مختصر افسانہ کے لیے مناسب وموزوں ہوتے ہیں اور پھر یہ بھول کر کہ مخلوط و منتشر زندگی کے کن واقعات یا خیالات نے ان تاثرات کا احساس دلایا تھا وہ اپنے مختصر افسانے کے لیے از سر نو ایسے واقعات تعمیر کرتا ہے جو نہایت واضح طور پر بغیر کسی قسم کی الجھن پیدا کرنے کے نہایت باقاعدگی اور خوبصورتی سے مطلوبہ اثر پڑھنے والے پر وارد کر دیتے ہیں۔''[2]

حفیظ جالندھری کے اس افسانوی مجموعے کی فنی و فکری حیثیت ضمنی ہی سہی، لیکن ایک بات تو واضح ہے کہ حفیظ جالندھری نے ان افسانوں کے ذریعے جہاں معاشرتی مسائل کو سلیقے سے اجاگر کیا ہے وہاں دوسری جانب ان کی ذہنی وفکری صلاحیتوں کے کئی افق روشن ہوئے ہیں۔ یہ افسانے بنیادی طور پر ہمارے معاشرے کے معاشی، جنسی، معاشرتی اور نفسیاتی حقائق کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان افسانوں کی زبان صاف، سادہ اور دلنشیں ہے۔ ہفت پیکر کو اردو افسانے میں ہمیشہ اس لیے اہمیت حاصل رہے گی کہ وہ حفیظ جالندھری کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں سہاگ کی رات، ہوشیار دیوانہ، خودکشی، احساس آوارگی، ملمع، حیات تازہ اور افسانہ در افسانہ شامل ہیں۔

> ”
> انسانی فطرت کی منظر کشی حفیظ نے بہت ہی عمدہ انداز میں کی ہے۔ کہ شادی کے بعد آدمی شب زفاف کے لیے کیا کیا خواب سجاتا ہے۔مگر ایک خواب کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ایسے بھی 'سہاگ کی رات' ہو سکتی ہے۔البتہ اس افسانے میں ایک بات اور ہے کہ کس طرح شادی کے بعد آدمی (شوہر) کی ذمے داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ ہر حال میں اس کے دکھ سکھ کا خیال رکھے۔
> “

افسانہ 'سہاگ کی رات' میں حفیظ جالندھری نے کسی نئے موضوع کا انتخاب نہیں کیا ہے، لیکن فن کے اعتبار سے وہ مکمل افسانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ حفیظ جالندھری نے مخصوص حالات کے پیش نظر انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے وسوسوں اور اندیشوں کو خواب کی شکل میں بیان کیا ہے، واقعات کو بالکل سیدھے سادے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں ٹرین کے سفر کی روداد بیان کی گئی۔ حفیظ کے زمانے میں ٹرین سے سفر کرنا ایک دشوار ترین مرحلہ تھا اور شادی بیاہ کے موقع پر تو لوٹ مار کے واردات ہوتے ہی رہتے تھے۔ خواب کا تعلق یہ ہے کہ آدمی جو سوچتا ہے یا جو وسوسے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، نیند میں بھی اس کو اسی طرح کے خیالات یا اس سے ملتی جلتی چیزیں نظر آتی ہیں۔ اس افسانے میں ایک دلہن کی رخصتی کے منظر کو پیش کرنے کے بعد راستے میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل ہے، کہ کس طرح ڈاکو ٹرین میں گھس کر دلہن کا سامان اور زیورز بردستی لوٹ لیتے ہیں اور اس کا شوہر اس کی حفاظت میں ڈاکوؤں سے دست وگریباں رہتا ہے، مگر اس درمیان ایک ڈاکو اس کی بیوی کو ٹرین سے نیچے پھینک دیتا ہے، اپنی دلہن کی حفاظت کی خاطر دولہا بھی ٹرین سے کود کر اس کی تلاش میں مصروف ہو جاتا ہے، دولہن بے ہوشی کی حالت میں اس کو ملتی ہے۔ موسم بھی بادو باراں کا ہو رہا ہے۔ بارش بھی اولے کے ساتھ شروع ہو جاتی ہے۔ اسی بارش میں وہ اس کو کندھے پر لادے بڑی مشقت کے بعد ایک محفوظ مقام پر پہنچتا ہے، بہت جتن کرنے کے بعد جب دولہن کو ہوش آتا ہے تو دولہا اس کی مزاج پرسی میں لگ جاتا ہے، ابھی اطمینان کا سانس بھی نہیں لے پاتا ہے کہ اتنے میں آسمانی بجلی اس کی بیوی کی زندگی کو ختم کر دیتی ہے۔ جب دولہے کو ہوش آتا ہے تو الٹے لوگ اس سے سوال کرتے ہیں کہ کہاں سے بھگا کے لایا ہے، اوپر والے نے تجھے تیری غلطی کی سزا دے دی۔ مگر جب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی مر چکی ہے تو خود بھی ٹرین کے آگے کود کر جان دے دیتا ہے۔

انسانی فطرت کی منظر کشی حفیظ نے بہت ہی عمدہ انداز میں کی ہے۔ کہ شادی کے بعد آدمی شب زفاف کے لیے کیا کیا خواب سجاتا ہے۔ مگر ایک خواب کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ایسے بھی 'سہاگ کی رات' ہو سکتی ہے۔ البتہ اس افسانے میں ایک بات اور ہے کہ کس طرح شادی کے بعد آدمی (شوہر) کی ذمے داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ ہر حال میں اس کے دکھ سکھ کا خیال رکھے۔

اس افسانے کا اختتام حفیظ نے مثبت انداز میں کیا ہے کہ قاری کو اندازہ ہو جائے کہ یہ تو ایک خواب تھا جو ہمارے تجسس کو ہوا کے ہمرکاب کیے ہوئے تھا۔ افسانے کا اختتام اس طرح ہوتا ہے۔

''میں نے یکا یک بیدار ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ والد میرا شانہ ہلا ہلا کر مجھے جگا رہے تھے۔

''اٹھو اٹھو۔ اپنے شہر کا اسٹیشن آ گیا۔''

اتنے میں گاڑی پلیٹ فارم پر رکی میرے رشتے دار اور دوست دلہا دلہن کے خیر مقدم کے لیے کھڑے تھے۔ باجہ سے مبارکباد کی سریں نکل رہی تھیں۔ ہر طرف صبح صادق کا نور پھیلا ہوا تھا۔

میں نے تشویش سے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ والدہ دولہن کو برقع اوڑھا رہی تھیں۔ دولہن کے زیوروں کی چھنکار اور ہنسی قہقہوں کے درمیان میں اٹھ بیٹھا۔

واقعی میں نے خوفناک خواب دیکھا تھا۔[3]

'ہوشیار دیوانہ' معاشرے اور انسانی فطرت اور اس کے باہمی رویوں کا ترجمان ہے۔ افسانے میں شوہر کا کردار بیوفا بیوی سے انتقام لینے کی کہانی بیان کرتا ہے۔ شوہر انتقام میں اتنا اندھا ہو جاتا ہے کی اپنی حاملہ بیوی کو قتل کر دیتا ہے، اس کی بیوی کے ساتھ اس کا بچہ بھی اس انتقام کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے، لیکن قتل کے بعد احساس جرم اس کو بے چین کیے رہتا ہے اور کسی بھی پل چین نہیں لینے دیتا ہے، اس کی بیوی اور زمین پر قدم رکھنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیے جانے والے بچے کی یادیں اس کو مسلسل عذاب میں مبتلا رکھتی ہیں۔ افسانے کے آغاز کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں نے گناہ کیا، یہ صدائے خاموش میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ یہ ایک احساس ہے جو مدت سے میری زندگی پر محیط ہے۔ اتنی مدت سے جس کو میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔[4]

اس افسانے میں حفیظ جالندھری نے آدمی کو ضمیر کی عدالت میں مجرم گردانا ہے اور 'میں نے گناہ کیا' یہ صرف ایک جملہ نہیں ہے بلکہ ایک سزا ہے جو ضمیر کی عدالت کے ذریعے دی گئی ہے۔ سزا کی نوعیت یہ ہے کہ مجرم مسلسل ایک عذاب میں مبتلا ہے، جس کی وجہ سے اس کو سکون کی سانس نصیب نہیں ہوتی ہے۔

افسانہ 'خودکشی' میں ایک اہم سماجی المیے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ مڈل کلاس خاندانوں کی پریشانیاں، خونی وجذباتی رشتوں کی رسہ کشی، سوتیلے پن اور اس کے رویوں کے مکروفریب کی کہانی ہے، جس میں ہر کوئی اپنا ہے مگر اپنوں کی خوشی سے خوش نہیں ہے۔ اپنوں کی ترقی کو اپنی تذلیل سمجھتا ہے۔ ان کی خوشحالی ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے۔ ان کے سکھ سے اتنا دکھی ہے جتنا کہ اپنے دکھ سے بھی نہیں ہے۔

افسانہ 'احساس آوارگی' موجودہ معاشرتی مسائل کا بہترین ترجمان ہے۔ حفیظ نے اس مسئلے کو موضوع بنایا ہے جس سے نوجوان نسل برباد ہو رہی ہے۔ جب والدین اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت پر اپنی ساری پونجی یہ سوچ کر قربان کرتے ہیں کہ آنے والا کل ہمارے بیٹے کا شاندار ہوگا اور اس کے ساتھ ہمیں بھی سکون ملے گا، لیکن جب نئی نسل یا اولاد اس کا فائدہ نہیں اٹھا پاتی ہے اور اس موقع کو ضائع کر دیتی ہے، تو آنے والا کل جب ذمے داریوں کے ساتھ ان کے مقابل آ کھڑا ہوتا ہے تو وہ اس سے بھاگنے لگتے ہیں اور فرار حاصل کرنے کے چکر میں اپنے بوڑھے والدین اور بیوی بچوں سے بھی لاتعلق ہو جاتے

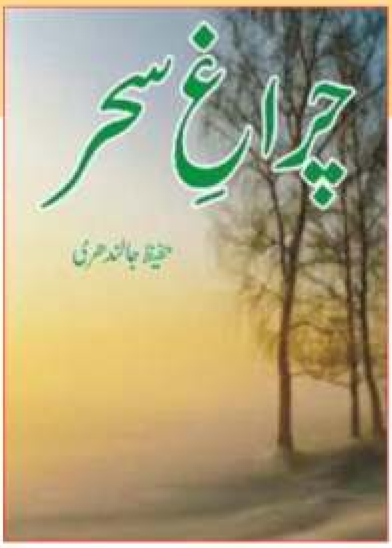

ہیں۔ یہ تاثر ایک خاص طرح کی صورت حال میں افسانہ نگار کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ حفیظ نے افسانے کی شروعات ایک اچھے ماحول میں کی ہے اور مطلوبہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب بھی رہے ہیں یعنی وہ کردار کو احساس آوارگی دلانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور یہ افسانہ آج کے ماحول و کردار کی بھی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔ حفیظ جالندھری کا یہ افسانہ جدید افسانہ نگاری کی حدود کے بہت قریب ہے۔

افسانہ 'ملمع' میں ایک بہت ہی عام موضوع کو زینت بخشی گئی ہے۔ 'ملمع' کے معنی ہیں، روشن کیا ہوا، چمکیلا، ظاہری ٹیپ ٹاپ، دکھاوا، 'اس افسانے کے موضوع کے لحاظ سے حفیظ جالندھری نے اس کا نام بھی رکھا ہے کیونکہ اس میں ملمع سازی کی کاریگری ہی نظر آتی ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ہر کوئی اس سے باخبر بھی ہے مگر پھر بھی جان بوجھ کر اس کا شکار بنتا رہتا ہے۔ حفیظ جالندھری نے ایک جذباتی اور کریہہ واقعہ کو خوبصورت کرداروں کے ذریعے اسلوب کے سہارے زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ حفیظ نے ایک اندھے دیوتا کی پرکشش فریب کاریوں کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ مافی الضمیر بھی ادا ہو گیا اور دل کو ٹھیس بھی نہیں لگی۔ اس افسانے میں فن بدرجہ اتم موجود ہے اور بہت ہی عمدہ اور کامیاب طریقے سے انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی کی گئی ہے۔ جذبات کو پیکر عطا کرنا ہی حفیظ جالندھری کا کارنامہ ہے۔

افسانہ 'حیات تازہ' میں حفیظ جالندھری موضوع کی مناسبت سے سجاد حیدر یلدرم سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس افسانے میں حفیظ جالندھری نے سماج کی بالکل صحیح تصویر پیش کی ہے، جس میں سماج کی عیاریاں و مکاریاں اور فریب کاریاں ظاہر ہوتی ہیں۔ گھر کے سرغنہ کے

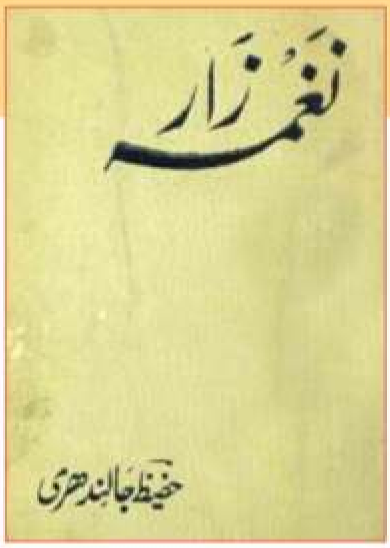

انتقال کے بعد رشتے داروں اور پڑوسیوں کے معاملات کرنے کے انداز کس طرح بدل جاتے ہیں، اس افسانے میں اس کی مکمل تصویر موجود ہے۔ ہر آدمی صرف تعزیت کو ہی اولین فرض سمجھتا ہے اور اس کے بعد اپنی ذمے داری سے آزاد ہو جاتا ہے۔ افسانے کے ہیرو کو دنیا کی ظاہری رسمیں صرف دکھاوا نظر آتی ہیں۔ اس کو سماج اور اس کی رسموں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ والدین اور بیوی کے انتقال کے بعد وہ اپنے کمرے میں اکیلے قید رہتا ہے، اس تنہائی سے وہ وحشت زدہ ہو جاتا ہے کہ کیا والدین کے ساتھ سارے رشتے دفن ہو گئے، مجھ سے کسی کا کوئی رشتہ نہیں رہا۔ آخر اس سے کوئی ملنے کیوں نہیں آتا ہے۔ کوئی اس کی پرواہ کیوں نہیں کرتا ہے، اسی وجہ سے دنیا اور دنیا والوں سے اس کو نفرت ہو جاتی ہے۔

'افسانہ در افسانہ' میں حفیظ جالندھری پریم چند سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس افسانے میں حفیظ نے دیہات کی منظر کشی کی ہے اور عورت کی اس تصویر میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ اپنے خون کے آخری قطرے کو نچھاور کرنے کے بعد بھی مکمل نہ کر سکی۔ حفیظ نے سماج کے سب سے حساس موضوع 'آنر کلنگ' پر قلم اٹھایا ہے، جس کو ہمیشہ سماج نے مکروہ اور گھناؤنا سمجھا ہے لیکن اس کے باوجود اس بوجھ کو ڈھویا ہے اور آج بھی ڈھو رہی ہے۔ حفیظ نے سماج میں رائج اس جھوٹے اور کھوکھلے رسم و رواج پر طنز کیا ہے کہ کس طرح سماج میں بدنامی کے ڈر یا جھوٹی عزت کی خاطر لوگ جنونی اور پاگل پن کے شکار ہو جاتے ہیں اور درندگی پر آمادہ ہو کر اپنوں کے خون کی ہی ہولی کھیلتے ہیں، جب اپنوں کو انھیں ہاتھوں سے قتل کرتے ہیں جن سے ان کی پرورش کی ہے اور انھیں اپنی آنکھوں سے تڑپ تڑپ کر جان دیتے ہوئے دیکھتے ہیں تب ان کی جھوٹی عزت نفس کو سکون ملتا ہے۔ افسانے میں فن بدرجہ اتم موجود ہے۔ تحیر اور تجسس پورے

افسانے میں شروع سے آخر تک موجود ہے۔ حفیظ پورے افسانے میں قاری کو باندھ کر رکھتے ہیں اور اضطراب اور کشمکش آخر تک برقرار رہتا ہے۔ افسانے کا انجام مثبت ہے جو کہ حفیظ جالندھری کا خاص انداز ہے جو آخر میں قاری کے اعصاب کے تناؤ کو یک لخت کم کر دیتا ہے۔

ہفت پیکر کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو افسانے کے ابتدائی دور میں حفیظ جالندھری کے افسانوں میں جدید افسانے کی بیشتر خصوصیات جلوہ گر ہیں، وحدت تاثر اور اختصار ان افسانوں کو مختصر افسانے کی صف میں شامل کرتا ہے۔ حفیظ بے جا طوالت سے گریز کرتے ہیں اور کسی جگہ بھی فنی جھول کا شکار نہیں ہوتے۔ جس دور میں یہ افسانے لکھے گئے وہ سیاسی اعتبار سے ایک ہنگامہ خیز دور تھا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی تین عشروں میں سیاسی اعتبار سے بے شمار واقعات رونما ہوئے۔ جنگ عظیم اول اور جلیانوالہ باغ کا سانحہ اس دور کے اضطراب اور بے چینی کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن حفیظ نے اپنے کسی افسانے میں ان حالات کو موضوع نہیں بنایا ہے۔

تکنیکی اعتبار سے حفیظ ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ پلاٹ کے سلسلے میں بھی وہ جملہ تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور قاری کے ذہن کو ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیتے ہیں۔ پلاٹ قاری کو ایک ہی سمت میں محو سفر رکھتا ہے۔ البتہ اس میں ارتقا اور وسعت بھی موجود ہے۔

جدید افسانے میں واقعہ کردار کے ردعمل سے پیدا ہوتا ہے اور کردار یا کرداروں کی داخلی کشمکش نقطہ عروج تک پہنچ کر منطقی انجام سے آشنا ہوتی ہے۔ حفیظ نے اپنے افسانوں میں کردار کی داخلی کشمکش کو نہایت کامیابی کے ساتھ نقطہ عروج تک پہنچایا ہے۔

حفیظ کے یہاں کردارنگاری کی عمدہ تصویر نظر آتی ہے۔ یہ کردار اپنے زندہ ہونے کا مکمل ثبوت دیتے ہیں اور فطری تقاضوں اور محسوسات کے حوالے سے زندہ و جاوید اور فعال نظر آتے ہیں، البتہ کچھ افسانوں میں ان کے کردار غیر معمولی انداز میں متحرک نظر آتے ہیں۔ حفیظ کے مکالمے فطری اور کرداروں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں اسی وجہ سے یہ مکمل طور پر فطری اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔

حفیظ جالندھری کو زبان پر عبور حاصل تھا، انھوں نے کہیں کہیں اتنے اچھے جملے استعمال کیے ہیں کہ جملوں کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ واہ! الفاظ میں کیا جادو بھر دیا ہے؟ جیسے 'اس کا سفر عظیم الشان اور اس کی ہمت کے لحاظ سے پرشکوہ تھا'، 'چڑیاں درختوں کو لوریاں دے رہی تھیں'، 'چاند کی سفید روشنی میں اس کا سفید چہرہ نور کی قندیل تھا'، 'اس کی نیندیں دلآویز اور لطیف خوابوں سے پھر آباد ہو گئیں'، 'آفتاب مشرق کے پہاڑوں سے ابھرتا اور وادی میں مسرت اور شادمانی بکھیرتا ہوا چلا جاتا۔ چاند نکلتا اور ان کی جھونپڑی کے ارد گرد راحت ہی راحت پھیلا دیتا'، 'چاند کے چہرے سے بادلوں کا نقاب سرک گیا تھا'۔ 'میں اپنے حسین بوجھ کو اٹھائے ریل کی پٹری پر چلا جا رہا تھا'، 'آہ یہ خیال خوفناک تھا۔ دنیا پھر میرے لیے مرجھا رہی تھی'، 'میں ہمہ تن چشم بن کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا' وغیرہ وغیرہ بہت سے جملے ہیں جو اپنے الفاظ کے انتخاب کے اعتبار سے بہت خوبصورت حسین اور دلکش ہیں۔

> ”
> **حفیظ کے یہاں کردارنگاری کی عمدہ تصویر نظر آتی ہے. یہ کردار اپنے زندہ ہونے کامکمل ثبوت دیتے ہیں اور فطری تقاضوں اور محسوسات کے حوالے سے زندہ و جلوید اور فعال نظر آتے ہیں. البتہ کچھ افسانوں میں ان کے کردار غیر معمولی انداز میں متحرک نظر آتے ہیں. حفیظ کے مکالمے فطری اور کرداروں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں اسی وجہ سے یہ مکمل طور پرفطری اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں.**
> “

'معیاری افسانے' یہ حفیظ جالندھری کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جو 1933 میں منظر عام پر آیا۔ یہ حفیظ جالندھری کے طبع زاد افسانے نہیں ہیں، بلکہ مختلف افسانہ نگاروں کے افسانوں کو حذف و اضافہ اور ترمیم کے بعد شائع کیا گیا ہے، اس لیے حفیظ جالندھری نے اپنے نام کے اوپر 'منتخبہ، مہذبہ و مبدلہ' تحریر کیا ہے۔ اس کا دیباچہ حفیظ جالندھری نے خود مرتب کیا ہے، دیباچے میں حفیظ جالندھری نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ دور جدید میں اخبارات و رسائل میں افسانوں کی اشاعت کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا، تاہم طبع زاد افسانے لکھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی لہٰذا رسالہ 'ہزار داستان' (1924) اور 'مخزن' (1927) کی ادارت میں موصول ہونے والے اہم اور معیاری افسانوں کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا دیا اور انھیں معیاری افسانوں کے نام سے شائع کر دیا۔ اس کے بارے میں حفیظ جالندھری خود ہی لکھتے ہیں:

"......'معیاری افسانے' مجموعہ ہے ان سب افسانوں میں سے انتخاب کا جو میری فرمائش پر احباب نے مہیا کیے تھے ان میں سے ایک دو کا ترجمہ مشہور افسانہ نگاروں نے کیا تھا چند ایسے ہیں جن کا ترجمہ میں نے ازسرتاپا اصلاح سے مزین کیا۔ باقی وہ ہیں جن کو میں نے فضا اور ماحول بدل کر نئے سانچوں میں ڈھال دیا۔ مجھے یقین ہے اس مجموعے کو پسند کیا جائے گا۔"[5]

'معیاری افسانے' میں کل اٹھارہ افسانے عورت یا شیر، مرد کی خواہش، جواہرات، اندھی دنیا، داستان چنگیز خان اور اس کے پوتے کی، شہزادی کا معمہ، پتھر کا دل، زندگی کا سانس، جاں نثار دوست، شکستہ پر، شکست کی فتح، شرط، وہ بدمعاش مرن، محتاج کا دل، لخت جگر، انوکھا انتقام، بربطی مغنی اور 'مسافر کی کہانی' شامل ہیں۔ حفیظ جالندھری نے اس کتاب کے دیباچے میں اس بات کی وضاحت تو کی ہے کہ یہ ان کے اپنے طبع زاد افسانے نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کسی بھی افسانہ نگار کا نام درج نہیں کیا ہے۔

ان افسانوں کے بارے میں حفیظ نے خود ہی اعتراف کیا ہے کہ ان افسانوں کے صرف نوک پلک سنوارے گئے ہیں اصل میں یہ کسی اور کے تراجم اور تخلیق ہیں۔ لہٰذا اس کو حفیظ کے افسانوں میں شامل کرنا مناسب نہیں، ہے، اسی لیے ان کے تجزیے اور فنی پہلوؤں پر بھی بات کرنا مناسب نہیں، کیونکہ یہ اندازہ لگانا ناممکن ہے کہ اس میں حفیظ کی کاوش کس حد تک ہے۔ اردو افسانے کی تاریخ میں شاید یہ پہلا اتفاق ہے۔

حواشی

1۔ سید امتیاز علی تاج مقدمہ 'ہفت پیکر' حفیظ جالندھری، مجلس اردو، لاہور 1929، ص9

2۔ سید امتیاز علی تاج، مقدمہ ہفت پیکر، حفیظ جالندھری، مجلس اردو، لاہور 1929، ص14-15

3۔ حفیظ جالندھری، 'سہاگ کی رات'، ہفت پیکر، مجلس اردو، لاہور 1929، ص45

4۔ حفیظ جالندھری، 'ہوشیار دیوانہ'، ہفت پیکر، مجلس اردو، لاہور 1929، ص46

5۔ حفیظ جالندھری دیباچہ 'شاہنامہ اسلام'، جلد چہارم، مجلس اردو، لاہور 1973 ص18

■

Mahmood Faisal
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi - 110007

آزادی کے بعد اردو خودنوشت

تعارفی جائزہ

شاہدہ نواز

انسانی زندگی کے کچھ واقعات ولمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں انسان عمر بھر بھلا نہیں سکتا۔ ایسے کئی دلچسپ واقعات وہ اپنے دوستوں اور عزیز واقارب کے درمیان بیان کرتا رہتا ہے۔ ان میں سے کچھ واقعات کو زیرِ تحریر بھی لاتا ہے مثلاً زندگی کے تلخ وشیریں واقعات، مختلف نشیب وفراز، خوشی وغم کے لمحات قلم بند کرتا ہے جسے خودنوشت (سوانح عمری) کہا جاسکتا ہے۔

خودنوشت میں مصنف اپنی زندگی کے واقعات خود بیان کرتا ہے۔ خودنوشت کے ذریعے نہ صرف کسی مخصوص شخصیت کی زندگی کے واقعات منظرِ عام پر آتے ہیں بلکہ اس دور کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی، تمدنی اور ثقافتی، پہلو بھی اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کس قسم کے ماحول میں مصنف کی پیدائش و پرورش ہوئی ہے۔ ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ خودنوشت کے ذریعے صرف ایک فرد کی زندگی کے گوشے ہی نہیں بلکہ اس دور کے متعلق بہت سی جانکاری ملتی ہے جسے اس دور کی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس کا مصنف خود ہی مجرم و گواہ اور جج ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امانت داری، دیانت داری، سچائی اور صداقت پسندی اس صنف کے خاص جوہر ہیں۔ بہترین خودنوشت وہی ہوتی ہے جس میں امانت داری اور سچائی سے کام لیا جائے۔

اس صنف نے بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ارتقائی منازل طے کیں۔ خاص طور پر اس صنف کو آزادی کے بعد ترقی ملی۔ اگر آزادی سے پہلے کے دور پر نظر ڈالی جائے تو اس صنف کے چند عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں جیسے مولانا جعفر تھانیسری کی خودنوشت 'تواریخ عجائب' (کالا پانی) جو 1885 میں منظرِ عام پر آئی۔ اس خودنوشت میں انھوں نے اپنی جلاوطنی کا مکمل نقشہ پیش کیا ہے۔ جعفر کو 'انڈمان' میں جلاوطن کیا گیا تھا جہاں پر وہ 20 برس رہے۔ اس کتاب میں 'انڈمان' کے رہن سہن، رسم ورواج، طرزِ زندگی اور عادات واطوار کا بہترین نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس خودنوشت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قید کے دوران بھی اپنے کاموں میں مصروف رہے۔ کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوئے حالانکہ ان کو ناگوار تجربات و حادثات سے بھی گزرنا پڑا۔

ظہیر دہلوی نے اپنی زندگی کی داستان کو 'داستانِ غدر' کے عنوان سے لکھا۔ اس میں 1857 کے ہولناک واقعات کا ذکر ہے۔ خواجہ حسن نظامی جو اردو ادب میں انشاپرداز کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہیں۔ 'آپ بیتی' کے عنوان سے داستانِ حیات لکھی۔ حسرت موہانی نے 'قیدِ فرنگ' اور وزیر سلطان جہاں نے 'نیرنگیِ بخت' کے

خودنوشت میں مصنف اپنی زندگی کے واقعات خود بیان کرتا ہے۔ خودنوشت کے ذریعے نہ صرف کسی مخصوص شخصیت کی زندگی کے واقعات منظرعام پر آتے ہیں بلکہ اس دور کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی، تمدنی اور ثقافتی، پہلو بھی اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کس قسم کے ماحول میں مصنف کی پیدائش و پرورش ہوئی ہے۔ ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ خودنوشت کے ذریعے صرف ایک فرد کی زندگی کے گوشے ہی نہیں بلکہ اس دور کے متعلق بہت سی جانکاری ملتی ہے جسے اس دور کی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس کا مصنف خود ہی مجرم و گواہ اور جج ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امانت داری، دیانت داری، سچائی اور صداقت پسندی اس صنف کے خاص جوہر ہیں۔ بہترین خودنوشت وہی ہوتی ہے جس میں امانت داری اور سچائی سے کام لیا جائے۔

عنوان سے بپتی زندگی کی داستانیں قلم بند کیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سارے ادیب و مصنف تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو ابدی حیثیت دینے کے لیے خودنوشتیں قلم بند کیں۔

آزادی کے بعد بھی اردو ادب میں بہت سی خودنوشتیں لکھی گئیں۔ اس سلسلے میں ایک قابل ذکر خودنوشت چھتاری محمد احمد سعید خان کی 'یاد ایام' ہے جو 1949 میں شائع ہوئی۔ چھتاری اپنی زندگی میں بہت سارے عہدوں پر فائز رہے۔ حیدرآباد اور سلطنت برطانیہ کے زیر نگیں علاقوں میں ملازمت کی۔ انھوں نے اس خودنوشت میں برطانیہ حکومت کا ذکر بھی کیا ہے۔ چھتاری نے اپنی داستان حیات کو سپاٹ اور بے کیف داستان کی صورت میں پیش کیا ہے۔

عبدالمجید سالک نے اپنی داستان حیات 'سرگذشت' کے عنوان سے قلم بند کی۔ سالک اردو ادب میں نامور ادیب مترجم، صحافی، شاعر، نقاد اور مزاح نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انھوں نے اس خودنوشت میں اپنی زندگی کے اکیاون برس کے واقعات و تجربات کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ خودنوشت کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں سوانحی حالات دوسرے حصے میں قید و بند کی تکالیف اور آخر میں اہم شخصیات کے خاکے قلم بند کیے گئے ہیں۔ ابتدا میں آبا واجداد کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں انھوں نے نہ صرف حالات و واقعات کو بیان کیا ہے بلکہ ہندوستان و پاکستان اور خاص کر سرزمین پنجاب کی سیاسی، سماجی، علمی و ادبی اور تہذیبی رجحانات و تحریکات کے متعلق بھی جانکاری پیش کی ہے۔ اپنے عہد کی بہت سی اہم ہستیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایسے تذکروں میں اپنی خاکہ نگاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔

رشید احمد صدیقی جو کہ اردو ادب میں طنز و مزاح نگاری کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اپنے بیتے دنوں کی کہانی 'آشفتہ بیانی میری' کے عنوان سے تحریر کی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم اور استاد بھی رہے ہیں۔ اسی لیے علی گڑھ سے والہانہ عشق ان کی تحریروں سے عیاں ہے۔ بچپن سے لے کر خاندانی تفصیل کا ذکر مختصراً کیا ہے۔ سرسید سے ان کو کافی لگاؤ تھا۔ انھوں نے سرسید کو رول ماڈل بتایا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ بھی والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ اردو خودنوشت کی خاص خوبیاں جیسے حق گوئی، شگفتگی اور روانی اہم ہیں۔ ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین اردو ادب کی اہم شخصیت ہیں۔ آپ ایک بہترین استاد اور زندہ جاوید ادیب کی حیثیت سے اردو دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کی روداد 'میری دنیا' کے عنوان سے لکھی جو 1965 میں شائع ہوئی۔ اس خودنوشت میں انھوں نے اپنے احباب اور اساتذہ کا بطور خاص ذکر کیا ہے لیکن روداد محبت بیان نہیں کی ہے کہ ان کے بقول آئین محبت کا احترام ایک لمحہ کے لیے بھی مجھ سے الگ نہ ہوا کہ تفصیل بتا کر داستان کو پر لطف بنا سکتا۔

1958 میں شاد عظیم آبادی کی خودنوشت 'شاد کی کہانی شاد کی زبانی' منظر عام پر آئی۔ یہ خودنوشت 281 صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے نظم ونثر کی خوبیاں بھی بیان کی ہیں۔ اساتذہ کا ذکر پرخلوص انداز میں کیا ہے۔ خودنوشت کی اہم خوبی یہ ہے کہ انھوں نے داستان حیات کو واحد متکلم میں نہیں بلکہ واحد غائب کے صیغے میں لکھا ہے۔ یعنی کتاب میں 'میں' نہیں 'وہ' حاوی رہتا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے خودنوشت عام فہم سادہ اور بہترین ہے۔ اگرچہ یہ خودنوشت خامیوں سے یکسر پاک نہیں پھر بھی اس کی خوبیاں، خامیوں پر حاوی ہیں۔ اس خودنوشت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مصنف نے اس کا عنوان 'کمال عمر' رکھا تھا اور اسے وہ کسی اور نام سے شائع کرانا چاہتے تھے۔ اس خودنوشت میں اس عہد کی تہذیب و ثقافت کے نقوش روشن ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان کی خودنوشت 'یادوں کی دنیا' 1965 میں منظر عام پر آئی۔ مصنف اردو ادب میں مورخ و ادیب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ یہ خودنوشت مصنف کی شخصیت اور نفسیات سے پردہ اٹھاتی ہے۔ کتاب آٹھ ابواب اور 472 صفحات پر مشتمل ہے۔ تاریخ نگار ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ بیتی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کو فخر خاندان کے نام سے یاد کیا ہے۔ پہلے دو ابواب میں خاندانی تاریخ اور دوسرے اہم واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے بچپن کی یادوں کا ذکر مختصر ہے۔ ہندوستان میں پٹھانوں کی آمد کا سلسلہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں بھائیوں کے متعلق جانکاری دی گئی ہے۔ چوتھے باب میں فخر خاندان کے عنوان سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے میں جانکاری ملتی ہے۔ ان کی شخصیت کے ہر پہلو پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔ یہ تفصیل 70 صفحات پر مشتمل ہے۔ پانچویں باب میں طالب علمی کے زمانے کی یادوں کو تازہ کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں فرانس کے سیاسی، سماجی، ادبی اور معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اردو ادب کے مشہور و معروف شاعر جوش ملیح آبادی جو شاعر انقلاب، شاعر شباب اور شاعر فطرت کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کی داستان کو 'یادوں کی برات' کے عنوان سے لکھا۔ یہ خودنوشت اردو ادب کی خودنوشتوں میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس خودنوشت کو 5 حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ زندگی کے بنیادی چار عناصر کا ذکر بھی کیا گیا ہے جیسے شعر گوئی، عشق بازی، حصول علم اور انسان دوستی وغیرہ ابتدائی حصے میں 'چند ابتدائی باتیں' کے عنوان سے اپنی بپتی زندگی کے ابتدائی دنوں کو پر جوش انداز میں بیان کیا ہے۔ دوسرے حصے میں آبا واجداد کا ذکر کیا ہے۔ خاص کر اپنے پردادا کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ان کے پردادا فقیر محمد خان گویا اردو ادب کے اہم شاعر تھے۔ اسی حصے میں والدین، بھائی اور بہنوں کا ذکر بھی ملتا ہے تیسرے حصے میں دوستوں اور عزیز واقارب کا بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنی 75 سالہ زندگی کے کیف وکم کو بہت ہی شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے اور کہیں کہیں مبالغے کا سہارا بھی لیا ہے۔ 'یادوں کی برات' میں جوش ملیح آبادی کی شخصیت، نظریات اور عقائد کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

خواجہ غلام السیدین اردو ادب کے مشہور ادیب ہیں۔ انھوں نے اپنی خودنوشت 'مجھے کہنا ہے اپنی زبان میں' کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا تھا لیکن بے وقت موت نے انھیں کتاب کو مکمل کرنے کی اجازت نہیں دی وہ صرف تین ابواب مکمل کر پائے۔ یہ کتاب 260 صفحات پر مشتمل ہے۔ شاید مصنف زندہ رہتے تو اس کتاب کے صفحات کی تعداد ہزاروں سے بھی زیادہ ہوتی۔ اس کا پہلا

اپنے بیتے دنوں کی کہانی 'آشفتہ بیانی میری' کے عنوان سے تحریر کی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم اور استاد بھی رہے ہیں۔ اسی لیے علی گڑھ سے والہانہ عشق ان کی تحریروں سے عیاں ہے۔ بچپن سے لے کر خاندانی تفصیل کا ذکر مختصراً کیا ہے۔ سرسید سے ان کو کافی لگاؤ تھا۔ انھوں نے سرسید کو رول ماڈل بنایا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ بھی والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ اردو خودنوشت کی خاص خوبیاں جیسے حق گوئی، شگفتگی اور روانی اہم ہیں۔ ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

باب 'خواب ہے جو کچھ بھی دیکھا' کے عنوان سے درج ہے۔ اس باب میں سنی سنائی باتوں پر بچپن کے حالات واواقعات قلم بند کیے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی طرح انھیں بھی علی گڑھ سے محبت تھی شاید یہی وجہ ہے کہ جب وہ علی گڑھ کا ذکر کرتے ہیں تو جذباتی ہوجاتے ہیں۔

اردو ادب کے مشہور ومعروف ادیب ونقاد کلیم الدین احمد نے 'اپنی تلاش میں' کے عنوان سے خودنوشت لکھی جو 1975 میں شائع ہوئی۔ یہ داستان حیات تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ خودنوشت کی ابتدا میں خاندانی حالات پر بحث کرتے ہوئے پٹنہ کے علمی تہذیبی اور معاشرتی حالات کا ذکر کافی تفصیل سے کیا ہے۔ ساتھ ساتھ بچپن کے کھیلوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مشاعروں کی روداد قلم بند کرتے ہوئے اپنے نانا عبدالحمید اور شاد عظیم آبادی کی معاصرانہ کشمکش کا ذکر بہترین طریقے سے کیا ہے۔ اس خودنوشت سے وہابی تحریک اور کلیم الدین احمد کے معاصرین سے متعلق بہت قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ اس خودنوشت میں اگرچہ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کے متعلق کم جانکاری پیش کی ہے لیکن پھر بھی اس کا شمار اردو ادب کی اہم خودنوشتوں میں ہوتا ہے۔

مسعود حسین خان اردو ادب کی بے نظیر ہستی ہیں وہ بیک وقت شاعر، ادیب، نقاد، محقق، سوانح نگار، ماہر دکنیات، ماہر لسانیات اور بہترین استاد کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انھوں نے زندگی کی روداد کو 'ورود مسعود' کے عنوان سے تحریر کیا۔ داستان حیات کو بیان کرنے کے سلسلے میں امانت داری اور دیانت داری سے کام لیا ہے۔

آل احمد سرور نے اپنی بیتی زندگی کو 'خواب باقی ہیں' کے عنوان سے لکھا ہے۔ آپ بیک وقت ادیب، نقاد، عالم اور استاد کی حیثیت سے اردو ادب میں مشہور ومقبول ہیں۔ انھوں نے زندگی کے نشیب وفراز کو اجاگر کرنے کے لیے خودنوشت کا سہارا لیا۔ یہ کتاب 1991 میں شائع ہوئی ۔ بے باکی، صفائی، سچائی، اور امانت داری اس کتاب کی خاص خوبیاں ہیں۔ یہ کتاب 6 دہائیوں کے حالات و واقعات پر مبنی ہے۔ انھوں نے عبارت آرائی سے پرہیز کیا ہے۔ بدایوں جو کہ ان کا آبائی وطن تھا اس کا ذکر نہایت خلوص کے ساتھ کیا ہے۔ اس کتاب میں ہندوستان کے مختلف شہروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ علی گڑھ میں دور طالب علمی میں وہاں کے مشاعروں اور مباحثوں وغیرہ کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ ساتھ ساتھ اساتذہ کرام کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں خواجہ منظور حسین کا نام کافی اہم

اخترالایمان نے اپنی زندگی کے سبھی پہلوؤں کو امانت داری اور دیانت داری سے واضح کیا ہے۔ ازدواجی زندگی کی نقاب کشائی بھی کی ہے پتہ چلتا ہے کہ پہلی بیوی سے ان کے اچھے تعلقات نہیں تھے۔ انھوں نے بہت ساری فلمیں بھی لکھیں جیسے 'وقت' جس کو کافی مقبولیت ملی اس فلم کا ایک مکالمہ کافی مشہور ہے "جن کے گھر شیشے کے ہوں وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکتے"، مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس خودنوشت کو اردو ادب کی بہترین خودنوشتوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

ہے۔ انھوں نے ملازمت کے دوران اہم ہستیوں سے ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے۔ سر ضیاء الدین جو اس وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے ان کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کے علمی و ادبی اور معاشرتی حالات وواقعات پر بھی بحث کی ہے۔ لکھنؤ کا ذکر بہت محبت سے کیا ہے۔ لکھنؤ سے ان کو کافی لگاؤ تھا۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں بحیثیت ریڈر 8 سال کام کیا تھا۔ پھر علی گڑھ چلے گئے مگر لکھنؤ کو کبھی بھول نہیں پائے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ خودنوشت مبالغہ آرائی سے یکسر پاک ہے۔ اس کا شمار اردو ادب کی بہترین خودنوشتوں میں ہوتا ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنی داستان حیات کو 'کاغذی ہے پیرہن' کے عنوان سے لکھا۔ عصمت چغتائی اردو ادب میں ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ یہ کتاب 14 ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں رسالہ ''آجکل' میں مارچ 1979 سے لے کر 1980 تک سلسلہ وار شائع ہوتی رہی۔ 1994 میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ اس خودنوشت کو مکمل خودنوشت نہیں کہا جاسکتا کیونکہ مکمل خودنوشت میں بچپن سے لے کر وفات تک کے سارے حالات وواقعات تفصیل کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں لیکن اس میں یہ سب دیکھنے کو نہیں ملتا۔ البتہ عصمت کی زندگی کے بہت سارے گوشے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس میں گریجویٹ، ملازمت اور لحاف پر مقدمہ تک کے زمانے کے واقعات درج کیے گئے ہیں۔ پہلا عنوان 'غبار کارواں' کے نام سے شامل ہے۔ اس عنوان کے تحت انھوں نے بچپن کے بارے میں جانکاری فراہم کی ہے۔ عصمت کی شخصیت کی تعمیر باغی حالات کے زیر اثر ہوئی۔ شاید اسی وجہ سے باغیانہ پن ان کی رگوں میں رچ بس گیا تھا۔ ان کو باغی قلم کار بھی کہا جاتا ہے۔

اس خودنوشت میں علی گڑھ، لکھنؤ، دہلی اور راجستھانی تہذیب کا ذکر بھی ملتا ہے۔ راجستھان کی یادوں کا بہانہ کرکے وہاں کی جاگیردارانہ زندگی پر طنز کیا ہے۔

اخترالایمان نے اپنی داستان حیات کو 'اس آباد خرابے میں' کے عنوان سے لکھا۔ وہ مشہور شاعر، مکالمہ نویس اور فلمی دنیا سے وابستہ شخصیت کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ یہ کتاب 1996 میں منظر عام پر آئی۔ ابتدا میں 'سوغات' میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ انھوں نے اس کتاب میں بچپن کے حالات، ابتدائی تعلیم، ہل چلانا، جنگلوں میں گھومنا پھرنا، فصلیں کاٹنا، باغوں میں ٹہلنا، گائے اور بھینس چرانا اور دودھ بیچنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں اپنے والد کے ساتھ بہت سی جگہوں کی سیر کی۔ انھوں نے یتیم خانے میں بھی زندگی گزاری تھی جس کا ذکر دلکش انداز میں کیا ہے۔ طالب علمی کے زمانے پر بھی بحث کی ہے جیسے علی گڑھ کی طالب علمی کا زمانہ، تلاش معاش کے سلسلے میں پونے اور بمبئی کا سفر اور زندگی کی ناکامیوں کا ذکر اس طریقے سے کیا ہے کہ پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے ابتدائی زندگی سے لے کر آخری وقت تک کے مشاہدات، تجربات، حالات و واقعات کو بڑی بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے سبھی پہلوؤں کو امانت داری اور دیانت داری سے واضح کیا ہے۔ ازدواجی زندگی کی نقاب کشائی بھی کی ہے پتہ چلتا ہے کہ پہلی بیوی سے ان کے اچھے تعلقات نہیں تھے۔ انھوں نے بہت ساری فلمیں بھی لکھیں جیسے 'وقت' جس کو کافی مقبولیت ملی اس فلم کا ایک مکالمہ کافی مشہور ہے ''جن کے گھر شیشے کے ہوں وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکتے''، مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس خودنوشت کو اردو ادب کی بہترین خودنوشتوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی خودنوشتیں ہیں جو اس اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہیں کہ ان سے ہمارے عہد کی مکمل تہذیبی، تاریخی، سماجی، سیاسی تصویر سامنے آتی ہے اور کچھ ایسی شخصیات ذہن میں روشن ہوجاتی ہیں جنھیں ہم فراموش کرتے جارہے ہیں۔ میں نے خودنوشتوں کا صرف اجمالی جائزہ لیا ہے کہ تفصیل کے لیے ایک سفینہ درکار ہے۔

■

Shahida Nawaz D/o Muneer Husain
Room No 114, Srojni Naidu Girls Hostel
University of Jammu - 180006 (J&K)

مقصود احمد

بڑودہ کی ادبی سرگرمیاں
(اردو کے حوالے سے)

بڑودہ میں اردو شعر و ادب کی تاریخ بہت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس کے نقطۂ آغاز کی نشان دہی ممکن نہیں۔ البتہ، یہاں بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) سے اردو شاعری کے وجود کا سراغ ضرور ملتا ہے۔ محمد شفیع نے 1130ھ میں بی بی ارواح کے عنوان سے ایک مثنوی کہی، جسے لوگوں نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ پھر انیسویں صدی کے نصف اوّل میں خواجہ سعید شیدا نے بھی اردو شاعری کی آبیاری میں مقدور بھر کوشش کی۔ بڑودہ میں ان کی ملاقات محمد مصطفیٰ شیفتہ (م 1869) سے اس وقت ہوئی تھی جب انھوں نے سفرِ حج کے دوران یہاں قیام فرمایا تھا۔ اس موقعے پر شیدا نے ایک غزل بھی کہی تھی، جسے شیفتہ نے بہت پسند کیا تھا۔ شیدا کے علاوہ، سید محمد احسان اور غلام قادر بلیغ نے بھی اردو شاعری کے گیسو کو سنوارنے میں قابلِ ذکر کردار ادا کیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے تذکرۂ سخن وران بڑودہ از ظہیر صبا قادری، دہلی، 2014، ص 20، 34، 36، 44، 45، 60)

1857 کے بعد بڑودہ میں یوپی اور دیگر علاقوں سے شعرا کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس وقت یہاں مہاراجہ کھنڈے راو (م 1870) حکمراں تھے۔ چونکہ انھوں نے 1857 کی جنگ آزادی کے دوران اپنی قلم رو میں بغاوت رونما نہیں ہونے دی تھی، اس لیے انگریزوں نے ان سے تعرض نہیں کیا جس کے سبب بڑودہ اور دیگر علاقوں میں امن وامان برقرار رہا۔ یہی پر امن اور پر سکون صورتِ حال بڑودہ میں بیرونی شعرا کی تشریف آوری کا باعث ہوئی۔ ان میں سے بیشتر کو یہاں کا رنگا رنگ اور راحت افزا ماحول اتنا پسند آیا کہ وہ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ ان میں سے ایک نمایاں ہستی جناب سید احمد حسن فدا (شاگردِ غالب دہلوی م 1869) کی تھی۔ یہاں گاہے بہ گاہے نشستوں اور مشاعروں کا انعقاد بھی عمل میں آتا رہا، جن کے ذریعے اردو شاعری کی نشو ونما ہوتی رہی۔ انیسویں صدی کے نصف ثانی سے تعلق رکھنے والے جن سربرآوردہ شعرانے اردو شعروسخن کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں سے بعض کے نام نامی یہ ہیں: سید احمد حسن فدا (شاگردِ غالب دہلوی)، میر ابراہیم علی خاں وفا (شاگردِ غالب)، میر عالم علی خاں مائل (شاگردِ غالب)، سید شریف الدین شریف، سید حاجی میاں غالب، شیخ عبداللہ طالب، نور رفاعی، ناظم، نواب میر امین الدین نصیری، یاسین خاں یاسین، یعقوب علی خاں یعقوب، محمد یونس، دوست محمد پنہاں، احمد میاں احمد، بدرالدین بدر، سید برہان الدین خوشتر اور نواب صدرالدین صدر۔

بڑودہ کی اردو شاعری کی تاریخ میں اہم دور کو اولین دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس دور کے شعرانے حمد، نعت، منقبت، غزل اور قصیدہ میں طبع آزمائی کرکے اردو شاعری کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔ مذکورۂ بالا اربابِ فن میں سے بعض کے کلام کے نمونے پیشِ خدمت ہیں۔ امید ہے کہ ان سے ان کی افتادِ طبع اور شاعرانہ صلاحیت و لیاقت کا قدرے اندازہ ہوجائے گا۔

ہمیں دونوں جہاں میں ایک خواہش ہے فقط تیری
نہ غم دوزخ کا رکھتے ہیں، نہ ہم کو شوق جنت ہے
(فدا م 1894)

ارمان کچھ ارم کے نہ باغِ جناں کے ہیں
ہم تو نثار سیدِ کون و مکاں کے ہیں
(وفا م 1890)

ظالم کدورتوں کی تیری انتہا ہے کچھ
ہم خاک ہوگئے ترے دل میں غبار ہے
(مائل م 1890)

ہم نے قاتل کی تیغ ابرو دیکھ
پہلے ہی سر سے ہے کفن باندھا
(خوشتر)

ہزاروں انبیا آئے ہیں اس دنیا میں اے احمد
مگر میرے نبیؐ کی شان ہی سب سے نرالی ہے
(احمد)

بھروسہ نہ تو عمرِ فانی پہ کر
نہ ہو وقت کے مکر سے بے خبر
(شریف)

جناب شریف کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شیخ سعدی (م 1292) کی 'کریما' کا فارسی سے اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا، جسے مطبع منبع الانوار، آگرہ نے 1912 میں بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔

یہاں ذکرِ خدا ہوتا ہے آئے جس کا جی چاہے
کھلا دروازۂ جنت ہے جائے جس کا جی چاہے
اس کے نور کا اے نور ہے یہ عکس ہر شے میں
زمیں میں، چرخ میں، خورشید میں اور ماہِ تاباں میں
(نوررفاعی)

نعتِ احمد میں جو اے صدر غزل تو نے لکھی
منہ ترا چومنے اللہ کی رحمت آئی
تیری الفت میں اگر جان نکل جائے مری
میں یہ سمجھوں مرے حصے میں شہادت آئی
(صدر)

نواب صدرالدین صدر مولانا حالی (م 1914) سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ، ان کے تتبع میں موصوف نے متعدد اصلاحی نظمیں قلم بند کیں، جنھیں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ نواب صاحب زود گو اور بسیار نویس تھے۔ ان کی شعری ونثری تصانیف کی تعداد 35 تا 40 بتائی جاتی ہے۔

نواب صاحب قبلہ نے بڑودہ کے مسلمانوں کے اندر علمی و ادبی ذوق بیدار کرنے کی غرض سے یہاں کی جامع مسجد میں 1901 میں ایک لائبریری قائم کی تھی۔ اس لائبریری کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی (م 1914)، مولانا حالی، حکیم اجمل خاں (م 1927) اور خواجہ حسن نظامی (م 1900) جیسے ادبا و فضلا نے اس کی تعریف کی ہے اور اسے ایک گراں قدر علمی ذخیرہ قرار دیا ہے۔ افسوس کہ یہ کتب خانہ اہالیان بڑودہ کی لاپروائی اور بے اعتنائی کی وجہ سے ابتری کا شکار ہوگیا۔

بڑودہ میں اردو شاعری کے دورِ ثانی کی شروعات بیسویں صدی کے آغاز سے ہوتی ہے۔ اردو شاعری کے حوالے سے اس دور کو سنہرا دور قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے اوائل میں یہاں کچھ مدت تک مولانا محمد علی جوہر (م 1931) کا بھی قیام رہا ہے۔ 1906 میں علامہ شبلی کی تشریف آوری کے موقعے پر وہ یہاں موجود تھے۔ علامہ موصوف انھیں کے ہاں ٹھہرے تھے۔ مولانا جوہر مہاراجہ سیاجی راؤ ثالث (م 1939) کے دربار سے وابستہ تھے۔ انھیں ولی عہد کی اتالیقی کا شرف بھی حاصل رہا۔ اسی زمانے میں یہاں ثاقب بدایونی (شاگردِ داغ) اور اظہر سہوانی (شاگردِ امیر مینائی) اور پروفیسر نواب علی (بڑودہ کالج موجودہ بڑودہ یونیورسٹی) کی بھی آمد ہوئی۔ مقامی شعرا میں غالب بھاؤنگری نظامی (شاگردِ نوح ناروی)، افسر مودودی بڑودوی (شاگردِ یاس لکھنوی)، سید احتشام علی جادو (شاگردِ ظہیر دہلوی)، سید قطب الدین نیر (شاگردِ ثاقب بدایونی)، سید احمد میاں قادری احمد، ضیا ندوی (سلیمانی جماعت کے مذہبی رہنما)، شفق سالیری، سرفراز سالیری، انور بڑودوی، اثر سالیری (بانی بزمِ محبانِ ادب)، سالک رام خوشدل، مانک لال مانک، احمد میاں خلیل، اکبر افسری، آسی بڑودوی (م 1956)، بسمل بڑودوی افسری، جمیل افسری، پرواز بڑودوی (م 1935)، عباس بڑودوی (شاگردِ غالب غالب نظامی)، عیش بڑودوی (شاگردِ قطب الدین نیر)، عبد افسری، ناچیز بڑودوی (شاگردِ غالب نظامی) وغیرہ نے اپنی مساعی جمیلہ اور فنکارانہ مہارت کی بدولت اردو شاعری کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ اس دور میں بھی نشستوں اور مشاعروں کا سلسلہ حسبِ سابق برقرار رہا، جن میں نامور بیرونی شعرا کو مدعو کیا جاتا رہا۔ اس ضمن میں سید احتشام حسین جادو اور حکیم حبشی میاں نے خاصی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ دونوں حضرات نے اپنے دولت خانے پر متعدد مشاعروں کا اہتمام کر کے بڑودہ میں اردو شاعری کی پیش رفت میں ناقابلِ فراموش رول ادا کیا۔ دوسری طرف اسر مودودی صاحب نے اپنی استادانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نوجوان اور نوآموز شاعروں کی خوب خوب حوصلہ افزائی کی، جنھوں نے ترقی کر کے اردو شعر وسخن کی ترویج واشاعت کے لیے خود کو وقف کردیا۔ ثاقب بدایونی، قطب الدین نیر، غالب نظامی اور ان کے لائق شاگردوں نے بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس دور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ نشستوں اور نجی ملاقاتوں میں شعرا کے مابین اکثر نوک جھونک بھی ہوجایا کرتی تھی، جس کی وجہ سے محفلیں اور جم گھٹے زعفران زار بن جاتے تھے۔ اس قسم کا ایک پرلطف واقعہ یاد آرہا ہے، جسے یہاں نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک موقعے پر مولانا محمد علی جوہر نے اپنی بذلہ سنجی اور ظرافتِ طبع کا مظاہرہ کرتے ہوئے جناب افسر بڑودوی سے مخاطب ہوکر کہا:

تو شمر کے لشکر کا ہے بھاگا ہوا افسر

یہ سنتے ہی افسر صاحب کی رگِ شاعری پھڑک اٹھی اور اس طنز آمیز مصرعے کا برجستہ جواب یوں دیا:

تو شمر کے خنجر کا ہے اترا ہوا جوہر

افسر بڑودوی کی اس بے باکانہ جرأت اور شاعرانہ و فنکارانہ برجستگی اور حاضر جوابی نے حضرت جوہر جیسے قادرالکلام شاعر کا ناطقہ بند کردیا۔

> ”
> **بڑودہ میں مغربی تہذیب کی آمد کے باوجود دورِ اوّل میں ہندوستانی تہذیب و تمدن اور روایتی اقدار میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے اس زمانے میں یہاں ہوٹلوں اور چائے خانوں کا رواج یا تو بالکل نہیں تھا یا برائے نام تھا۔ چنانچہ، شعر و سخن کی محفلیں اور نشستیں عموماً بیٹھکوں، ہال نما کشادہ کمروں اور کھلے میدانوں میں منعقد ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی نوابوں اور جاگیرداروں کی حویلیوں میں بھی مشاعروں کا انعقاد عمل میں آجاتا تھا۔**
> “

بڑودہ میں مغربی تہذیب کی آمد کے باوجود دورِ اوّل میں ہندوستانی تہذیب وتمدن اور روایتی اقدار میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے اس زمانے میں یہاں ہوٹلوں اور چائے خانوں کا رواج یا تو بالکل نہیں تھا یا برائے نام تھا۔ چنانچہ، شعر وسخن کی محفلیں اور نشستیں عموماً بیٹھکوں، ہال نما کشادہ کمروں اور کھلے میدانوں میں منعقد ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی نوابوں اور جاگیرداروں کی حویلیوں میں بھی مشاعروں کا انعقاد عمل میں آجاتا تھا۔ عام ملاقاتوں میں بھی تبادلۂ کلام کی راہ ہموار ہوجاتی تھی لیکن دوسرے دور میں صورتِ حال پہلے جیسی نہیں رہی۔ اب قدیم اقدار اور پارینہ طرزِ حیات میں کافی بدلاؤ آیا۔ جدید تہذیب کے زیرِ اثر من جملہ دیگر تمدنی عناصر کے ہوٹلوں اور چائے خانوں کے کلچر کو بھی فروغ حاصل ہوا، جن میں شہر کے ہر طبقے کے افراد کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ شعرائے کرام نے بھی موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں شعر وسخن کا بازار گرم کر کے

لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی سعی کی۔ اسی طرح آنے والے اشخاص کی غذائی ضرورت بھی پوری ہوئی، تبدیلی ذائقہ کا سامان بھی فراہم ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ تفریح طبع کی سبیل بھی پیدا ہوئی۔ آہستہ آہستہ ہوٹلوں اور چائے خانوں کے مالکان کو بھی شاعروں کی اہمیت اور ان کے کلام کی اثرانگیزی کا احساس ہونے لگا۔ چنانچہ، انھوں نے بھی ان کا کھلے دل سے استقبال کرنا شروع کیا، جس سے ان کی خاصی حوصلہ افزائی ہوئی۔ مرور ایام کے ساتھ ہوٹل اور چائے خانوں نے ادبی اڈوں کا روپ اختیار کرلیا، جہاں شام ہوتے ہیں شعرا جمع ہوکر شعر و شاعری کی وقتی اور عارضی محافل سجا کر ادبی خدمات انجام دیتے۔ ان محافل میں حاضرین کو گونا گوں اور متنوع کلام سننے کے مواقع ملتے اور اچھے اشعار کا چرچہ عوام میں ہوجاتا۔ ایسے ہوٹلوں میں غلام محمد چینی والا صاحب کے ہوٹل واقع نزدنیائے مندر، لہری پورہ، بڑودہ، کا اپنا ایک مقام تھا۔ چینی والا صاحب شاعر تو نہیں تھے، لیکن انھیں شعر و شاعری سے خاصی دلچسپی ضرور تھی اور اس کے ساتھ شعرا کے تئیں بھی ان کا رویہ ہمدردانہ اور خیرخواہانہ تھا۔ ان کے ہوٹل پر روزانہ مقامی شاعروں کی محفل بے صدر تو سجتی ہی، اکثر و بیشتر بیرونی شعرا بھی اس میں شریک ہوکر اس کی رونق کو دوبالا کردیتے۔ اس محفل میں شرکت کرنے والے مقامی شعرا میں سید محمود حسین افسر بڑودوی (م 1948)، سلیمان رومی، شفق سالیری، اثر سالیری اور خنداں لکھنوی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس ضمن میں ڈبھوئی والا ہوٹل واقع راؤپورہ ٹاور، بڑودہ، کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے ضروری کام کاج سے فارغ ہوکر یہاں بھی شاعر اکٹھے ہوکر شعر و ادب کی قابل قدر خدمت کرتے۔ اس ادبی جمگھٹے میں مستقل طور پر شرکت کرنے والے شاعروں کے نام یہ ہیں— قاضی صاحب، جناب جمیل الدین جمیل، جناب افسر بڑودوی، جناب منشی کریم الدین، جناب امیر علی سید اور ان کے رفقائے سخن سنج۔

مانڈوی کے پاس ایک عطر فروش کی دوکان تھی۔ وہاں بھی ثاقب بدایونی، حسن میاں منصور میاں اور دیگر کہنہ مشق شعرا تشریف لاتے تھے اور جہاں شعرا اکٹھے ہوں غیر ممکن ہے کہ وہاں شعر و سخن کا بازار گرم نہ ہو۔ اس بزم بے صدر میں اچھے اشعار پر کھل کر داد دی جاتی اور صبح ہوتے ہی وہ زبان زد خاص و عام ہوجاتے۔

ان اڈوں اور جمگھٹوں کے علاوہ بیٹھکوں، ہال نما کمروں، حویلیوں جن میں نواب فخرالدین صاحب (م 1965) کی حویلی کا دربار ہال خاصی اہمیت کا حامل تھا اور میدانوں میں بھی محافل کا اہتمام بہ دستور ہوتا رہا۔ تہذیب و تمدن میں ترقی کے ساتھ ان میں ایک اور عنصر کا اضافہ ہوا۔ وہ یہ کہ شہر بڑودہ میں دو ایک ہال بھی وجود میں آئے جن میں وقتاً فوقتاً بڑے مشاعروں کا انعقاد عمل میں آیا۔ ان میں سے ایک اہم ہال بڑودہ کالج (موجودہ فیکلٹی آف آرٹس، بڑودہ یونیورسٹی) کا بڑا ہال تھا، جو اب پریمانند ہال کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرا ہال نیائے مندر (کورٹ) کا ہال تھا جو اب بھی موجود ہے۔ ان دونوں ہالوں کی تعمیر اگرچہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہوئی تھی، تاہم ان میں شعری محافل کے باقاعدہ انعقاد کا سلسلہ بیسویں صدی سے شروع ہوا۔

دوسرے دور سے تعلق رکھنے والے چند شعرا کے نام اوپر مذکور ہوئے ہیں۔ ذیل میں ان کے نمونہ ہائے کلام درج کیے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کے مطالعے سے مذکورہ فنکاروں کے فکری رجحان اور فنی کمال سے خاصی حد تک واقفیت ہوجائے گا:

جب کوئی آئی تازہ مصیبت جہان میں
اس کو غریب خانہ فلک نے بتا دیا
گھر کی یہاں کمی نہیں کچھ آپ کے لیے
آنکھوں میں رہیے حسرت دیدار کی طرح

(افسر بڑودوی م1948)

جب ہوا ثاقب سے محشر میں شمار نیک و بد
رکھ دیا اس نے حساب حمد و نعت و منقبت

(ثاقب م1945)

داغ عصیاں بھی ہے خورشید قیامت گویا
نام روشن نہ ہو کیوں ہم سے گنہ گاروں کا

(احتشام علی جادو)

پرتو حضرت مینائی ہے اظہر یہ سب
مہر انور کی طرح نام ہے روشن میرا

(اظہر م1938)

مجھ سا دنیا میں نہ ہوگا کوئی شیدا تیرا
قیس کیا چیز ہے فرہاد کا درجہ کیا ہے

(عاجز بڑودوی م1935)

لگتا نظر آتا نہیں دل خلد بریں میں
آنکھوں میں لیے جاتا ہوں تصویر مدینہ

(میش بڑودوی م1936)

پرتو ماہ عرب کا ہے یہ صدقہ نیر
قبر پر چادر مہتاب تنی رہتی ہے

(نیر بڑودوی)

برق نومیدی جاوید سے جلتا ہوں میں
پھر بھی اس راہ میں امید کی دنیا ہوں میں

(غالب نظامی)

یہ سب کچھ ہیں قیاس آرائیاں جذبات انساں کی
حقیقت میں یہاں غم ہے نہ کوئی شادمانی ہے

(احمد میاں احمد)

کوئی بدلا تجھے لینا ہے کیا اے آسماں ہم سے!!!
ملیں گے پھر بڑی مشکل سے حق کے پاسباں ہم سے

(ضیا ندوی م1393ھ)

آہ آتش ناک میں پوشیدہ کوئی راز تھا
نغمۂ پرسوز کا ہر شعلہ بے آواز تھا

(شفق سالیری م1991)

گل کی ہنسی سے رہتا ہے دھڑکا لگا ہوا
ایسا نہ ہو چمن پہ گریں بجلیاں کہیں

(خلیل بڑودوی م1951)

قیامت کی روانی ہے مری رنگیں طبیعت میں
قلم رکتا نہیں میرا زمیں ہو سخت کیسی بھی

(انور بڑودوی م1946)

کروں کیا سخت جاں ہوں اور نازک دست قاتل ہے
مری مشکل کا اب آسان ہونا سخت مشکل ہے

(اثر سالیری م1982)

ہمارا صاف دل ہے ہم تو ملتے ہیں صفائی سے
نہیں معلوم اے ظالم کہ تو کس دل سے ملتا ہے

(ناچیز بڑودوی)

تیسرے دور کا آغاز 1940 یا اس کے بعد سے ہوتا ہے۔ اس دور کے شعرا (بہ استثنائے چند) کا خاص وصف یہ ہے کہ ایک طرف تو انھوں نے فرسودہ اور ازکار رفتہ روایت کو خیرباد کہہ دیا، مگر دوسری جانب صحت مند، تعمیری اور کلاسیکی شعری روایات کو سینے سے لگائے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تغزل، سلاست و روانی اور نغمگی کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے اور عصری آگہی، تازگی، جدت پسندی، ندرت بیان اور بلند آہنگی جیسے پسندیدہ اوصاف بھی جا بہ جا پائے جاتے ہیں۔ اس خوش گوار جدید رجحان کے آغاز کا سہرا درد بڑودوی صاحب (م 1975) کے سر جاتا ہے۔ بعد میں ان کے ہم عصروں اور شاگردوں نے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی شعوری کوشش کی، جس کے باعث گلشن شعر و سخن میں حیات آفریں بہار آگئی۔ اس دور کے چند نمایاں اور باصلاحیت شاعروں کے اسمائے گرامی یہ ہیں: جناب زاہد رفاقی، جناب عبدالستار خاں درد بڑودوی (شاگرد

قطب الدین نیر)، جناب ملنگ افسری، جناب غنی رتلامی، جناب عاشق بڑودوی (شاگردِ افسر بڑودوی)، جناب اختر رضوی (شعبۂ جغرافیہ، بڑودہ یونیورسٹی)، جناب پروفیسر منصور قریشی (بڑودہ یونیورسٹی م 1997)، جناب خلش بڑودوی (شاگردِ درد بڑودوی)، جناب شرر بڑودوی (شاگردِ درد بڑودوی)، جناب کشش بڑودوی (شاگردِ درد بڑودوی)، جناب عزیز قادری (شاگردِ درد بڑودوی)، جناب اختر انصاری (شاگردِ درد بڑودوی)، جناب منشی شوہر لکھنوی (شاعر طنز و مزاح)، جناب سرخاب اکولوی (مزاحیہ شاعری)، جناب شمیم دردی بڑودوی، جناب نسیم القادری، جناب قمر دردی، جناب قیصر دردی، جناب نشاط صابری دردی، جناب امین قریشی، جناب آزاد نیری، جناب وہاب انوری، جناب منیر مداحی، جناب گھائل بڑودوی، جناب پریم چند پریم، جناب عادل بڑودوی، جناب کریم خاں ساز، جناب ضیا کھمباتی (شاگردِ قمر پیٹ لادی)، جناب زخمی بڑودوی، جناب خنداں رائے بریلوی اور جناب ناز قادری۔

اس عہد کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تین شاعرات بھی افقِ شاعری پر نمودار ہوئیں جن کے نام یہ ہیں: محترمہ قمر صاحبہ (بنت عبدالحق جج)، محترمہ نرگس اقبال اور محترمہ اختر بڑودوی۔ اول الذکر مشاعرے وغیرہ میں شرکت نہیں کرتی تھیں۔ بس احباب و اعزہ کو اپنا کلام سنا کر اپنا شوق پورا کر لیتی تھیں۔ باقی دونوں شاعرات کبھی کبھی مشاعرے میں شریک ہوتی تھیں۔

مذکورہ بالا تمام شعرا کے کلام کے نمونے پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان میں سے چند ایک کے چیدہ اشعار حسبِ ذیل ہیں۔ ان کے توسط سے ان کی ذہنی اپج اور میلانِ طبع کو سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی۔

ان آبلوں کا مزا ہائے کوئی کیا جانے
جو رہروی میں کبھی نوکِ خارِ تک پہنچے

(زاہد رفاعی)

جس کے سائے میں بیٹھتے تھے لوگ
کٹ گیا وہ درخت کیا کہیے

(درد بڑودوی)

بلندی زیرِ پائے انس و جاں ہے ان دنوں
زمیں بھی ہم کلامِ آسماں ہے ان دنوں

(غنی رتلامی)

گل کے بدلے خار طیبہ رکھ گئے
قبر پہ میری وہ احساں کر گئے

(ملنگ افسری)

درد صاحب کے شاگردوں میں خلش بڑودوی اور عزیز قادری نے خاصی شہرت حاصل کی۔ خلش بڑودوی کا امتیاز یہ ہے کہ ان کا کلام ملک کے معیاری جرائد و رسائل میں برابر چھپتا رہا، جس کی وجہ سے ادبی حلقے میں انھیں اعتبار حاصل ہوگیا تھا۔ انھوں نے 'لڑکیاں جلتی ہیں' کے عنوان سے ایک مجموعہ شائع کیا جو زائد از 300 قطعات پر مشتمل تھا، جن میں لڑکیوں کی زبوں حالی اور جہیز کی لعنت کو طشت از بام کیا گیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے قومی یکجہتی اور شراب کی مذمت میں بھی متعدد قطعات قلم بند کیے، جو کتابی شکل میں علیحدہ علیحدہ شائع ہوئے۔ قومی یکجہتی سے متعلق قطعات 'ایک آواز' کے عنوان سے ہندی رسم الخط میں اشاعت پذیر ہوئے۔

واقف ہیں ہم جہاں کے نشیب و فراز سے
رکھتے ہیں پانو وقت کی رفتار دیکھ کر

(عاشق بڑودوی)

تنہائی کے حصار میں کچھ ایسا قید تھا
میں اپنے آپ سے بھی کئی دن نہ مل سکا

(خلش بڑودوی م 1992)

سر پہ چلتی ہوئی تلوار دیکھی جاتی ہے!!
دل میں چبھتے ہوئے پیکاں نہیں دیکھے جاتے

(شرر بڑودوی)

وہ رہبروں کی بھیڑ تھی راہِ حیات میں
چلنا بھی دو قدم مجھے دشوار ہوگیا

(کشش بڑودوی م 1988)

اٹھو یہاں سے یہ کیسا نگر ہے فنکارو
جہاں پہ سر نہیں جلاو انگلیاں کاٹے
صبح تک اخبار کچھ بھوکے تو رہ سکتے نہیں
رات تو ہونے دو کوئی حادثہ ہوجائے گا

(عزیز قادری پ 1933)

دستِ دعا اٹھایا نہیں اس خیال سے
شاید عمل سے ہاتھ اٹھا لوں دعا کے بعد

(اختر انصاری م 2011)

پیسہ چھوٹا ہوتے ہوتے اتنا چھوٹا ہوگیا
جس کو بچے بھی نگل جاتے ہیں آسانی کے ساتھ

(شوہر لکھنوی)

نظر اس شوخ کی بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے
مجھے خطرے میں اپنی کھوپڑی معلوم ہوتی ہے

(سرخاب اکولوی)

لٹ گیا سارا گلستاں، جل گیا ہے آشیاں
اب کے کچھ شان سے فصلِ بہار آئی کہ بس

(شمیم دردی)

جن سے حاصل نہ ہو تسکین کی لذت دل کو
سرخیاں کیوں وہ کتابوں کے حوالوں میں ہیں

(نسیم القادری م 1978)

آئینہ توڑو ہوا میں بانٹ دو
میرے چہرے کو خلا میں بانٹ دو

(کریم خاں ساز م 1996)

مذکورہ شاعروں میں درد صاحب کا ایک خاص مقام تھا۔ موصوف ایک کہنہ مشق، پختہ قلم اور بلند مرتبہ شاعر تھے۔ شاگردوں کے کلام پر بڑی عمدہ اصلاح دیتے تھے۔ ان کے شاگرد عزیز قادری نے ایک شعر کچھ یوں موزوں کیا تھا:

چمن میں آج ہر اک گل کا دامن کس لیے نم ہے
یہ آنسو ہیں کسی ناشاد بلبل کے کہ شبنم ہے

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں 'کے کہ' کے اجتماع سے تنافر کا عیب پیدا ہوگیا تھا۔ لہٰذا استاد درد بڑودوی نے انتہائی چابک دستی سے اس عیب کو دور کرکے اسے یوں کردیا "کسی ناشاد بلبل کے یہ آنسو ہیں کہ شبنم ہے۔" کمال یہ ہے کہ استاد درد نے محض تقدیم و تاخیر سے کام لے کر غبار آلود مطلع کو صاف کردیا۔

درد صاحب کے شاگردوں میں خلش بڑودوی اور عزیز قادری نے خاصی شہرت حاصل کی۔ خلش بڑودوی کا امتیاز یہ ہے کہ ان کا کلام ملک کے معیاری جرائد و رسائل میں برابر چھپتا رہا، جس کی وجہ سے ادبی حلقے میں انھیں اعتبار حاصل ہوگیا تھا۔ انھوں نے 'لڑکیاں جلتی ہیں' کے عنوان سے ایک مجموعہ شائع کیا جو زائد از 300 قطعات پر مشتمل تھا، جن میں لڑکیوں کی زبوں حالی اور جہیز کی لعنت کو طشت از بام کیا گیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے قومی یکجہتی اور شراب کی مذمت میں بھی متعدد قطعات قلم بند کیے، جو کتابی شکل میں علیحدہ علیحدہ شائع ہوئے۔ قومی یکجہتی سے متعلق قطعات 'ایک آواز' کے عنوان سے ہندی رسم الخط میں اشاعت پذیر ہوئے۔ اس مجموعے کا اجرا دہلی میں سابق وزیر اعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی کے ہاتھوں سے ہوا۔ جہاں تک مذمت شراب سے متعلق مجموعے کا تعلق ہے، وہ گجراتی رسم الخط میں منظر عام پر آیا۔

موصوف نے ایک اور اہم اور قابلِ تحسین کارنامہ

انجام دیا۔ وہ یہ کہ انھوں نے بڑودہ میں بزمِ محبانِ ادب کا احیا کیا اور اس کے ذریعے اردو شعر و ادب کی سنجیدہ اور قابلِ قدر خدمت انجام دی، جس کا اعتراف ماہر القادری (م 1978)، ساغر نظامی (م 1983)، اعجاز صدیقی (م 1978)، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، مخمور سعیدی، وارث علوی (م 2014) اور دیویندر اسر (م 2012) جیسے فنکاروں اور دانش وروں نے کھلے بندوں کیا۔ اہل بڑودہ کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے۔ خلش صاحب گجرات اردو اکادمی، گاندھی نگر، گجرات کے ممبر بھی رہے۔ ان کے دو مجموعہ ہائے غزل قطار شیشہ اور شب نم۔ ان کی قیمتی یادگار ہیں۔

ان کے استاد بھائی جناب عزیزؔ قادری (پ 1933) نے بھی اردو شعر و سخن کی ترویج و ترقی میں بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں، جنھیں محبانِ اردو نے کافی سراہا ہے۔ ان کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں: سفر، نئی قندیل، چراغ عقیدت (گجراتی رسم الخط میں) اور دوہے (ہندی رسم الخط میں)۔ ان کی شعر گوئی کا سلسلہ تا حال جاری و ساری ہے اور فی الحال ان کے تین مجموعہ ہائے کلام زیر ترتیب ہیں، جو نعت، غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہیں۔

عزیزؔ قادری کا نمایاں ترین وصف یہ ہے کہ آپ علم عروض اور فن تاریخ گوئی سے کما حقہ واقف ہیں اور آپ نے اردو کے ساتھ ساتھ گجراتی، فارسی اور انگریزی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ موصوف نے غزل کے علاوہ حمد، نعت، سلام بہ حضور شہید کربلا منقبت، نظم، قطعات، رباعیات، تاریخ گوئی اور دوہے میں بھی اپنے فنی کمال کا شان دار مظاہرہ کیا ہے۔ عصر حاضر میں جناب والا کا شمار بڑودہ بلکہ گجرات کے بزرگ اور کہنہ مشق و توانا قلم شعرا میں ہوتا ہے۔ حضرت گرامی کی گونا گوں ادبی خدمات، فضل و کمال اور قابل رشک تخلیقی زرخیزی کے پیش نظر راقم الحروف نے انھیں غالبِ گجرات کے لقب سے ملقب کیا ہے۔

ضمنی طور پر شعرائے بڑودہ کی انفرادی کارگزاریوں کا ذکر نکل آیا، تو اس کا سلسلہ قدرے دراز ہو گیا اور اصل موضوع دب سا گیا۔ لہٰذا اس کی جانب دوبارہ مراجعت کی جاتی ہے تا کہ اس کا حق ادا ہو سکے۔

سطور بالا میں غلام محمد چینی والا صاحب کے ہوٹل کا ذکر آیا ہے۔ ان کے بعد اس کے انتظام و انصرام کی ذمے داری ان کے صاحب زادے جناب غلام رسول چینی والا اور ان کے بھائیوں کے کاندھوں پر عائد ہوئی۔ حسن اتفاق غلام رسول صاحب متخلص بہ معصوم بڑودوی کو شعر و شاعری سے اچھا خاصا شغف تھا اور وہ اکثر و بیشتر شررؔ قادری کی رہنمائی میں طبع آزمائی بھی کرتے تھے۔ اس تعلق سے شررؔ صاحب ان کے ہوٹل پر تقریباً روزانہ تشریف لاتے تھے۔ ان کی تشریف آوری سے فائدہ اٹھانے اور ان سے تبادلۂ خیال کرنے کی غرض سے ان کے دیگر استاد بھائی اور نو آموز شعرا بھی وہاں شام کو برابر حاضری دیتے تھے۔ اس طرح شام ہوتے ہی وہاں شعر و شاعری کا آفتاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو جاتا، جس کی ضیا بار کرنوں سے خاص و عام یکساں طور پر مستفیض ہوتے۔ شررؔ صاحب بڑے زود گو تھے اور برجستہ اصلاح دیتے تھے۔ ان کا کلام جدت، ندرت، سلاست و فصاحت، تغزل و موسیقیت اور پرکاری و مرصع کاری کا عمدہ نمونہ تھا مگر افسوس کہ دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ان کی فقط چند غزلیں ہی دستیاب ہیں جنھوں نے ان کے نام کو اب تک، بہرحال، زندہ و تابندہ رکھا ہے۔

رفتہ رفتہ معصوم صاحب (م 1995) کے تعلقات بیرونی شعرا سے بھی استوار ہوئے۔ ان حضرات کی تشریف آوری کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ معصوم صاحب اپنے اخلاق کریمانہ اور مخلصانہ برتاؤ سے ان کا دل موہ لیتے تھے اور ذرہ برابر اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس کی وجہ سے بڑودہ اور گجرات کے باہر بھی ایک مہمان نواز شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت ہو گئی۔ چونکہ ان کا ہوٹل وسطِ شہر میں واقع تھا، جہاں شہر کے ہر گوشے سے بہ آسانی پہنچا جا سکتا تھا، اس لیے باہر سے آنے والے شعرا و ادبا بلا کسی دشواری کے رکشے یا بس کے ذریعے وہاں فروکش ہو جاتے تھے۔ معصوم صاحب فراخ دلی سے ان کی خاطر و مدارات کرتے اور اس کے بعد باسے لاج (واقع لہری پورہ) یا کسی دیگر مناسب مقام پر ان کے قیام کا انتظام کر دیا جاتا۔ سید ظہیر احمد مدنی (م 1993)، سید مظہر الحق علوی (م 2013) اور بشیر بدر سے راقم الحروف کی ملاقات اسی ہوٹل میں ہوئی۔ مقامی شعرا میں آفتاب سحر ردولوی، ممتاز بڑودوی (م 2005)، سید علی ندیم، خلیل دھن تیجوی، عباس دانا، خلش بڑودوی، انور بڑودوی اور خود معصوم صاحب سے بھی یہیں تعارف ہوا۔ الغرض معصوم صاحب کے خلوص اور پیار نیز ہوٹل کے پرکشش محلِ وقوع کی بہ دولت اسے خاطر خواہ شہرت اور مرکزیت حاصل ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں مذکورۂ بالا دیگر ہوٹل اور دوکان کی رونق شعر و ادب کے حوالے سے ماند پڑ گئی اور دھیرے دھیرے وہاں شعرا کی آمد و رفت کا سلسلہ یکسر موقوف ہو گیا۔

اس دور میں راج محل کے بارونق اور شان دار دربار ہال میں بھی مشاعرے منعقد ہونے لگے جن میں بالخصوص سماج کے ذی فہم اور سنجیدہ حضرات شرکت کر کے اردو شاعری سے محظوظ ہوتے تھے۔ اس سے شعر و سخن کے وقار میں خاصا اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ بھائی لال امین میڈیکل ہال واقع ناگر واڑہ میں بھی انعقاد مشاعرہ کا سلسلہ شروع ہوا، جس کے بڑے اچھے نتائج برآمد ہوئے، کیونکہ اردو کے عام شیدائی یہاں بہ آسانی آ سکتے تھے۔ بزمِ محبانِ ادب نے بھی کافی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے زیر اہتمام بھی کئی یادگار مشاعرے اور نشستوں کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کے ناظم معصوم بڑودوی تھے۔ اسی عہد میں بزمِ توفیق، بزمِ اقبال اور گوہر علی حکیم اردو اکادمی کی بھی تشکیل ہوئی۔ بزمِ توفیق کے روحِ رواں عبد افسری (م 1959) تھے جن کا تعلق مہدوی جماعت سے تھا۔ اس کے قیام میں ان کو مولانا نجم الدین مہدوی کا تعاون حاصل تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگردوں نے اس کی سابقہ سرگرمیوں کو برقرار رکھا اور کئی کامیاب مشاعرے منعقد کر کے یادگار ادبی کارنامہ انجام دیا۔ ان کے فعال شاگردوں میں جمال مہدوی، رحمت مہدوی، راز مہدوی اور ابراہیم انجم کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کا باقاعدہ تعلق چوتھے دور سے ہے، جس کا تفصیلی ذکر آگے آ رہا ہے۔ بزمِ توفیق (قائم شدہ بہ یادِ توفیق حیدرآبادی) نے مشاعروں اور نشستوں کے انعقاد کے ساتھ ساتھ اشاعت کتب کی جانب بھی توجہ مبذول کی۔ خلش بڑودوی کی غزلوں کے مجموعہ 'قطار شیشہ' اور بڑودہ کے چھ شاعروں کے منتخب کلام کو 'سورج کے تماشائی' کے عنوان سے اسی بزم نے شائع کیا۔ بزمِ اقبال بھی مہدوی جماعت کے حوصلہ مند شاعروں کی کوششوں کے نتیجے میں قائم ہوئی۔ اس نے بھی شعر و ادب کی قابل تعریف خدمت انجام دی۔

گوہر علی حکیم اردو اکادمی کا تعلق سلیمانی جماعت سے ہے۔ بڑودہ میں اردو شعر و شاعری کی ترقی کے سلسلے میں اس نے بھی گراں قدر اور ناقابل فراموش رول ادا کیا۔ یہ آج بھی سرگرم ہے اور مختلف النوع ادبی پروگرام منعقد کرتی رہتی ہے۔

اس دور میں فروغ شعر و سخن کے حوالے سے جناب غنی رتلامی کی مخلصانہ اور ادیبانہ کارگزاری کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موصوف ہر ماہ اپنے دولت خانے پر طرحی نشست کا اہتمام کرتے تھے، جس میں

بڑودہ کے تقریباً تمام شعرا بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتے۔ ہر شاعر مصرعِ طرح پر غزل کہہ کر لاتا اور اسے سامعین کے سامنے پیش کرتا۔ اشعار میں موجود خوبیوں کو سراہا جاتا اور اسقام کی نشان دہی کر کے ان کی اصلاح کی جاتی۔ طرحی نشستوں کا یہ سلسلہ بہت ہی مفید اور کارآمد تھا، لیکن افسوس کہ جلد ہی خلفشار کا شکار ہو گیا۔

بڑودہ میں مشاعروں اور نشستوں کے علاوہ، مسالمے کی محفلیں بھی مسلم محلوں مثلاً یاقوت پورہ، فتح پورہ، نیاپورہ اور باوامان پورہ میں ماہِ محرم میں انعقاد پذیر ہوتی رہی ہیں، جن میں حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حضور عقیدت مندانہ سلام پیش کیا جاتا رہا ہے۔

زیرِ بحث دور میں فروغِ شعر وادب کے تعلق سے مزدور ساہتیہ سبھا کی خدمات اور کارگزاریوں سے بھی اغماض نہیں برتا جا سکتا۔ مذکورہ سبھا کا دفتر کھاری واو روڈ پر بالمقابل پولیس پریڈ گراؤنڈ واقع تھا۔ اس کے زیرِ اہتمام کئی شعری نشستیں اور کل ہند مشاعرے انعقاد پذیر ہوئے، جن میں مقامی شعرا کے علاوہ ملک کے کئی بیرونی نامور شاعروں نے شرکت کر کے مشاعراتی کلچر اور ادبی ذوق کی ترویج میں قابلِ قدر کردار ادا کیا۔ ان میں حسن کمال اور ندا فاضلی کے نام بہ طور خاص لائقِ ذکر ہیں۔

1975 یا اس کے بعد سے شروع ہونے والے چوتھے دور کے شعرا میں کچھ تو وہی ہیں جنھوں نے اگرچہ تیسرے دور میں شاعری کا آغاز کیا تھا، تاہم ان کو مقبولیت اس دور میں ملی یا ان کی شاعری میں شباب اور نکھار اب آیا۔ ان میں سے بعض تو آج بھی بہ قیدِ حیات اور فعال ہیں۔ یا پھر وہ شعرا ہیں جو ہیں تو عمر رسیدہ، مگر ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد یہاں مستقل طور پر مقیم ہو گئے ہیں۔ باحوصلہ نوجوان شاعروں کا شمار بھی اسی عہد کے قلم کاروں اور فن کاروں میں ہوتا ہے۔ مذکورہ تمام طبقات کے اربابِ سخن نے شعر وادب کی شمع کو سوسو جتن سے فروزاں کر رکھا ہے اور اپنے اپنے نادر خیالات اور نئے نئے تجربات ومشاہدات کی بنا پر اردو شاعری میں نوع بہ نوع گل بوٹے کھلا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کے اسما یہ ہیں: پروفیسر سید وحید اشرف، جناب ابراہیم انجم بڑودوی، جناب انور توفیقی، جناب جمال مہدوی، جناب نجم الدین مہدوی، جناب رحمت مہدوی، جناب راز مہدوی، جناب آفتاب سحر ردولوی، جناب معصوم بڑودوی، جناب عباس دانا، جناب خلیل دھن تیجوی، جناب صادق دردی، جناب ظہیر صبا قادری، ممتاز بڑودوی، جناب مظہر رفاعی، جناب انور بڑودوی، جناب

بڑودہ میں مشاعروں اور نشستوں کے علاوہ، مسالمے کی محفلیں بھی مسلم محلوں مثلاً یاقوت پورہ، فتح پورہ، نیاپورہ اور باوامان پورہ میں ماہ محرم میں انعقاد پذیر ہوتی رہی ھیں، جن میں حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حضور عقیدت مندانہ سلام پیش کیا جاتا رہا ھے۔

مرتضیٰ، جناب سید علی ندیم، جناب شکیل قادری، جناب محمود راز، جناب عباس ناشاد، جناب مشیر سنبھلی، جناب عارف شیخ، جناب عطیف انور، جناب جسبیر سنگھ داور، جناب صدف بڑودوی اور راقم الحروف مقصود احمد مقصود۔ اس فہرست میں ان باحیات شعرا کے نام شامل نہیں ہیں، جن کا باقاعدہ ذکر تیسرے عہد کے تحت آچکا ہے۔ سرِدست مذکورۂ بالا شعرا میں سے کچھ کے کلام کے نمونے ملاحظہ فرمائیے تاکہ ان کی فکری بالیدگی اور بوقلمونی سے آگاہی حاصل ہو سکے۔

یارب ترے بندے پہ قیامت کا ہے راج
حیوان سے بدتر ہے اب انساں کا مزاج
عدو بھی دوست ہو جائے سخن میں وہ حلاوت دے
کروں مخلوق کی خدمت وہ توفیقِ عبادت دے

(سید وحید اشرف)

ہم نے خود آگ لگائی ہے چمن میں ورنہ
بجلیوں سے تو گلستاں نہ جلایا جاتا

(معصوم بڑودوی)

اور بھی بڑھ جائے کچھ دردِ محبت کم نہ ہو
ضبط کا خوگر ہے دل تو آنکھ تک بھی نم نہ ہو

(ابراہیم انجم)

رہ گزارِ زیست میں اب کیجیے تلاش
گم ہو کے کوئی اپنا پتہ دے گیا مجھے

(انور توفیقی)

چاند تاروں کی حدوں تک ہی نہ محدود رکھو
اور جاتی ہے جہاں تک بھی نظر جانے دو

(جمال مہدوی پ 1938)

کیا زندگی ہے ڈوبنے والے سے پوچھیے
تنکا بھی مل گیا تو اسے ناخدا لگا

(آفتاب سحر پ 1938)

فن میں فنکار کا جلتا ہے لہو یوں جیسے
موم کے جسم میں دھاگے کا جگر جلتا ہے

(عباس دانا پ 1944)

اب میں راشن کی قطاروں میں نظر آتا ہوں
اپنے کھیتوں سے بچھڑنے کی سزا پاتا ہوں

(خلیل دھن تیجوی)

بے غرض کون ملا کرتا ہے اب اے یارو
اب ملاقات ضرورت کے سوا کچھ بھی نہیں

(صادق سالیری پ 1940)

یہ کیسا انقلاب آیا ہے یارو بزمِ امکاں میں
کہ لوگ اپنا جنازہ خود اٹھا کے ساتھ چلتے ہیں

(انور بڑودوی 2015)

ہم اپنا راستہ ہموار خود ہی کرتے ہیں
کسی کے نقشِ قدم پر چلا نہیں کرتے

(صبا قادری پ 1941)

تیری سوغات ہے یہ دردِ جگر
کیوں پریشاں رہوں دوا کے لیے

(سید مظہر رفاعی پ 1943)

کرونیں خاک کے ذرّوں پہ بدلتے سائے!!!
میں نے دیکھے ہیں کڑی دھوپ میں جلتے سائے

(ممتاز بڑودوی م 2005)

دیکھتا رہتا تھا تجھ کو ہر گھڑی
جب تلک میں نے تجھے دیکھا نہ تھا

(مرتضیٰ م 2014)

سبز پتے آندھیوں کے سامنے ٹھہرے رہے
ڈالیوں کے خشک پتے سر بہ سجدہ ہو گئے

(شکیل قادری پ 1961)

نئے دور کا کرشمہ ہے
قتل کرنا بھی اک ہنر نکلا

(سید ندیم پ 1953)

دونوں جانب انا کی دیواریں
دونوں آپس میں بدگمان نکلے

(مشیر سنبھلی)

دعاؤں کے پیچھے بھروسہ کھڑا تھا
دعاؤں کے آگے خدا ہی خدا تھا

(عباس ناشاد پ 1949)

میری بربادی پہ آمادہ تھی دنیا لیکن
مجھ کو آباد مری ماں کی دعا نے رکھا

(عارف پ 1964)

ذرا سی بات پر یہاں ضمیر بکتے ہو تم
میں غربتوں کی زد میں بھی انا کا سر بچا گیا

(لطیف انور پ 1975)

جس کے سائے میں دھوپ سو جائے
پیڑ ایسا کوئی لگاتے چلو
ماہِ شہرت کے اجالے ہمیں ڈس لیں نہ کہیں
آؤ گمنامی کے بے خوف اندھیرے میں چلیں
جو بسترِ مرگ پہ اچانک شفیع محشر کی یاد آئی
تو یاس کی شام پرخطر میں امید افزا سویرا جاگا

(مقصود پ 1952)

اشعارِ بالا جدید رجحانات کے امین ہیں اور اس کے ساتھ یہ جمال و شائستگی، برجستگی، سلاست و روانی، جاذبیت، سادگی، ندرتِ خیال اور سہلِ ممتنع جیسے دل آویز محاسن اور خوبیوں سے بھی مزین ہیں۔ ان میں عوام وخواص دونوں کے لیے حظ و تسکین کا سامان موجود ہے۔ بڑودہ جیسے دور افتادہ علاقے میں بود و باش اختیار کرنے والے سخنوروں کا تازہ و دل کش لب و لہجے اور منفرد اسلوب میں Quotable شعر کہنا تعجب انگیز بھی ہے اور لائق تحسین و آفرین بھی۔

گذشتہ تینوں ادوار کے مقابلے میں دورِ حاضر میں جدید تکنالوجی اور تسہیلات سے آراستہ کچھ ہال وجود میں آئے۔ ان میں بڑے پیمانے کے کل ہند مشاعرے ہوئے۔ ان میں Gandhi Nagar Gruh (گاندھی نگر ہال واقع نزد جوبلی باغ Grih کو گجرات میں Gruh کہتے ہیں) کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ اس میں شکیل بدایونی (م 1970 / پ 1935)، مجروح سلطان پوری (م 2000)، عرشی بھوپالی، منشاء الرحمٰن منشا، بشیر بدر، (پ 1935) اور ندا فاضلی (م 2016) جیسے نامی گرامی شعرا تشریف لا چکے ہیں۔ علاوہ ازیں، کچھ ایسی تنظیموں اور ٹرسٹوں کی تشکیل بھی عمل میں آئی جو معاشرے کے نئے تقاضوں اور ضروریات سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے اپنے وسائل کو بہ روئے کار لاتے ہوئے اردو شعر و ادب کے فروغ کے لیے بہت کچھ کیا۔ مشاعروں کے انعقاد کے ساتھ ساتھ شاعروں کی دل جوئی اور پذیرائی بھی کی۔ ان میں NICA (North India Cultural Association)، خدیجہ بیگم محمود حسین افسر ٹرسٹ اور سلیمانی فرینڈ سرکل کا رول ناقابلِ فراموش ہے۔ بڑے

گذشتہ تینوں ادوار کے مقابلے میں دورِ حاضر میں جدید تکنالوجی اور تسہیلات سے آراستہ کچھ ہال وجود میں آئے۔ ان میں بڑے پیمانے کے کل ہند مشاعرے ہوئے۔ ان میں Gandhi Nagar Gruh (گاندھی نگر ہال واقع نزد جوبلی باغ Grih کو گجرات میں Gruh کہتے ہیں) کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ اس میں شکیل بدایونی (م 1970/ پ 1935)، مجروح سلطان پوری (م 2000)، عرشی بھوپالی، منشاء الرحمن منشا، بشیر بدر، (پ 1935) اور ندا فاضلی (م 2016) جیسے نامی گرامی شعرا تشریف لاچکے ہیں۔

ہال اور دیگر مقامات کے علاوہ، جماعت خانوں میں بھی چھوٹے پیمانے پر مشاعرے ہوئے، جن میں میمن جماعت خانہ (مانڈوی) کو قلبِ شہر میں واقع ہونے کی وجہ سے خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اسے مخمور سعیدی، افتخار امام اور شین کاف نظام جیسے مشہور و معروف شعرا زینت بخش چکے ہیں۔ سلیمانی جماعت خانہ واقع مغل واڑہ اور شرفی ہال واقع پرتاپ نگر بھی شعری و ادبی سرگرمیوں کے مرکز رہے ہیں۔

قدیم اور جدید دونوں تنظیموں کی سرگرمیوں کی بہ دولت شعری نشستوں اور مشاعروں کا سلسلہ نئے اور خاص شہر سے دور واقع محلوں تک دراز ہوگیا ہے اور اب وہاں بھی شعر و سخن کے بازار میں خاصی گرمی پیدا ہوگئی ہے۔ ایسے محلوں میں میمن کالونی، بہار کالونی، اکوٹا، نوا یارڈ، فتح گنج، تاندل جا وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

معصوم بڑودوی صاحب کے انتقال کے بعد بزمِ محبانِ ادب کی سرگرمیوں میں جمود طاری ہوگیا تھا۔ چنانچہ، سید منظور سالیری صادق صاحب اور دیگر دل دادگانِ اردو کی سعیِ مشکور کے طفیل اس کا احیا عمل میں آیا اور نئے سرے سے اس کی تشکیل ہوئی۔ منظور سالیری صاحب اس کے صدر منتخب ہوئے اور راقم الحروف کو نائب صدر مقرر کیا گیا۔ اس احیا شدہ بزم کے زیرِ اہتمام کئی نشستیں اور مشاعرے منعقد ہوئے، جس سے شاعروں کے حوصلے بلند ہوئے۔ ان سرگرمیوں اور اہتمامات کے پہلو بہ پہلو، حنیف مستری مرحوم، ظہیر صبا قادری، سید مظہر رفاعی اور شکیل قادری نے بھی انفرادی طور پر مختلف مقامات پر نشستوں کا انتظام کیا، جن میں شعرا نے انتہائی جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ مرحوم حنیف صاحب ادب نواز بھی تھے اور شاعر نواز بھی۔ انھوں نے شاعروں کی حوصلہ افزائی کے لیے کئی قابلِ تعریف اقدامات کیے۔ خدا انھیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین!

اس ضمن میں آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس اور (Vadodara News Magazine) کی کارگزاریوں سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ اول الذکر نے شعر و سخن سے متعلق وقتے وقتے سے کئی پروگرام پیش کیے، جن کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ ایک پروگرام تو ایسا تھا کہ جس میں کئی شاعروں کو ایک ساتھ مدعو کر کے ایک مصرعِ طرح دے دیا جاتا اور اس کے ساتھ وقت کا تعین بھی کر دیا جاتا۔ اسی معینہ مدت میں برجستہ غزل کہنے کی فرمائش کی جاتی۔ اس کے مابعد تمام شعرا کے کلام کو انھی کی آواز میں ریکارڈ کیا جاتا۔ پھر اسے ہفتے عشرے میں آل انڈیا ریڈیو سے باقاعدہ نشر کر دیا جاتا۔ اس طرح کھرے کھوٹے کی پہچان بھی ہوجاتی اور شاعروں کو مشق و مزاولت کا موقع بھی مل جاتا۔

چند سال قبل وجود میں آنے والے VNM TV Channel نے بھی اپنے اسٹوڈیو میں دو ایک مشاعرے کر کے شاعروں کے وقار میں اضافہ کیا ہے اور شال وغیرہ پیش کر کے ان کی حوصلہ افزائی کا سامان بھی فراہم کیا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اسٹوڈیو کے باہر ہونے والی چند نشستوں اور مشاعروں کو ریکارڈ کر کے مناسب موقعوں پر انھیں Telecast بھی کیا گیا ہے۔

مذکورہ سرگرمیوں کے پہلو بہ پہلو، کئی مقامی شاعروں کے شاندار جشن بھی منائے گئے جن میں جشن شرر، جشن کشش، جشن خلش، جشن پروفیسر منصور الدین منصور قریشی اور جشن معصوم کو خاطر خواہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

(اس مضمون کی تیاری میں ظہیر صبا قادری کی تالیف 'تذکرۂ سخن ورانِ بڑودہ' مطبوعہ 2014 سے مدد لی گئی ہے)

■

Prof. Maqsood Ahmad
203, Shifa Complex, Tandalja Road
Vadodara - 390020 (Gujarat)
Mob.:9824033710

رسالہ 'شاہراہ' کا ناولٹ نمبر

نوشاد منظر

رسالہ 'شاہراہ' میں ادب کے تمام اصناف شائع ہوا کرتے تھے، مگر اس کی انفرادیت یہ ہے کہ دوسرے رسالوں میں جہاں مضامین، شاعری اور افسانے وغیرہ ہی شائع ہوتے ہیں وہیں شاہراہ نے اپنے صفحات پر ناولوں کو بھی زینت بخشا۔ رسالوں میں ناول شائع نہ کرنے کی وجہ اس کی طوالت ہے اگر کسی رسالے نے ناول کو شائع کیا بھی تو قسطوں میں اور اس کی وجہ رسالوں کی محدود ضخامت اور اس کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ شاہراہ اس اعتبار سے دوسرے رسالوں سے مختلف ہے کہ اس نے جہاں کچھ ناولوں کو قسطوں میں شائع کیا وہیں چند ناولوں کو مکمل شائع بھی کیا۔ شاہراہ کا ناولٹ نمبر دو جلدوں میں شائع ہوا۔ حالانکہ مجھے ناولٹ نمبر حصہ ایک ہی مل سکا۔ شاہراہ کا 'ناولٹ نمبر حصہ 1' فروری 1958 میں منظر عام پر آیا۔ شاہراہ کے ناولوں کی ایک خاص بات یہ بھی رہی کہ اس نے غیر ہندوستانی زبانوں کے ناولوں کا ترجمہ شائع کیا ان ناولوں میں تورگنیف، چیخوف، ماؤتون، میکسم گورکی، نکولائی گوگل اور دستو وسکی کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ناولوں کے تراجم بھی شائع ہوئے۔ جس وقت شاہراہ کی اشاعت عمل میں آئی تب تک اردو ناول نے ادب میں اپنا مقام مستحکم کرلیا تھا، کئی اچھے ناول منظر عام پر آچکے تھے۔ محمد یوسف ناولٹ نمبر حصہ اول کے اداریے میں لکھتے ہیں:

''اردو ادب میں آج نظم وافسانہ کو وہ فروغ حاصل نہیں جو ناول کو ہے۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے یہاں ناول پر ابھی کمسنی کا عالم ہے۔ ناول نگاری ابھی گھٹنوں چل رہی ہے۔ یوں تو اردو میں سماجی، سیاسی اور تاریخی ناول کثرت سے لکھے جارہے ہیں لیکن ابھی تک ایسا ناول تخلیق نہیں کیا گیا جسے ہم دوسری زبانوں کے مقابلے میں اپنی فخریہ پیش کش کہہ سکیں۔''

(محمد یوسف، اداریہ، ناولٹ نمبر، حصہ اول، فروری 1958)

یوسف جامعی نے اپنے اداریے میں ناولٹ نمبر کو شائع کرنے کا جواز پیش کیا ہے۔ محمد یوسف کے مذکورہ اداریے سے اختلاف ممکن ہے کیونکہ انھوں نے جس وقت یہ اداریہ تحریر کیا اس وقت تک اردو میں 'امراؤ جان ادا'، 'گئودان' اور 'آگ کا دریا' وغیرہ جیسے اردو کے بڑے ناول منظر عام پر آچکے تھے۔ ان ناولوں کو ہم دنیا کے بڑے اور اہم ناولوں کے مدمقابل بھی رکھ سکتے ہیں۔ اب ایسے میں اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر محمد یوسف نے یہ کیوں کہا کہ اردو میں ایسے ناول نہیں جو دنیا کے دوسرے ناولوں سے مقابلہ کرسکیں؟ ممکن ہے محمد یوسف کا اشارہ ترقی پسند ناولوں کے فقدان کی طرف ہو، کیونکہ محمد یوسف خود ترقی پسند ادب کے حامی تھے اور شاہراہ ایک ترقی پسند رسالہ۔ یوسف جامعی نے گرچہ اپنے اداریے میں اس بات کی وضاحت تونہیں کی کہ آخر اردو میں اچھے ناول کی کمی سے ان کی مراد کیا ہے؟ یا وہ ترقی پسند ناول کی کمی کی طرف اشارہ کررہے ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ محمد یوسف نے ہمیشہ اچھے ادب کی اشاعت پر زور دیا۔ شاہراہ کے ناولٹ نمبر کو شائع کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مدیر دوسری زبانوں کے ناولوں کو اردو میں شائع کرکے ایک مثال قائم کرنا چاہتے ہوں یا دوسری زبانوں کی سرگرمیوں سے اپنے قارئین کو واقف کرانا چاہتے ہوں۔

''یوسف جامعی نے اپنے اداریے میں ناولٹ نمبر کو شائع کرنے کا جواز پیش کیا ہے۔ محمد یوسف کے مذکورہ اداریے سے اختلاف ممکن ہے کیونکہ انہوں نے جس وقت یہ اداریہ تحریر کیا اس وقت تک اردو میں 'امراؤ جان ادا'، 'گنو دان' اور 'آگ کا دریا' وغیرہ جیسے اردو کے بڑے ناول منظر عام پر آچکے تھے۔ ان ناولوں کو ہم دنیا کے بڑے اور اہم ناولوں کے مد مقابل بھی رکھ سکتے ہیں۔''

شاہراہ میں شائع ہونے والے بیشتر ناول دوسری زبانوں سے تراجم کیے گئے ہیں۔ یہ میرے لیے انتہائی افسوس کی بات ہے کہ میری تمام کوششوں کے باوجود شاہراہ کا ناولٹ نمبر دو، دستیاب نہیں ہوسکا جس کی وجہ سے شاہراہ میں شائع ہونے والے ناولوں کی صحیح تعداد کا علم نہیں ہوسکا مگر جن شماروں تک میری رسائی ہوئی ان کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے اُنیس ناولیں ملیں (شاہراہ میں یقیناً اس سے زیادہ ناول شائع ہوئے تھے)۔ شاہراہ کے ناولٹ نمبر اول میں محمد یوسف نے ناولٹ نمبر دوم کے بارے میں ان لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے:

''دوسرا حصہ اردو میں طبع زاد ناولٹوں پر مشتمل ہوگا۔ ناولٹ نمبر کا دوسرا حصہ جولائی کے پہلے ہفتہ میں پیش کیا جائے گا۔ ناولٹ نمبر کے دوسرے حصے میں کیونکہ طبع زاد ناولٹ ہوں گے اس لیے ہم اسے مواد اور طباعت کے

اعتبار سے ایک بے مثال صحیفہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں، کم وبیش بیس ناولٹ قارئین کی نذر پیش کیے جائیں گے۔''

(اداریہ، محمد یوسف، فروری 1958)

محمد یوسف کے مذکورہ بالا اداریے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاہراہ میں کم سے کم چالیس ناولٹ شائع ہوئے، ان ناولوں میں کچھ غیر ملکی زبانوں کے ناول کے تراجم تھے اور کچھ طبع زاد ناول۔ یہاں ان ناولوں کا مطالعہ پیش کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی ہے جن تک میری رسائی ہوئی۔ ظاہر ہے تمام ناولوں پر اظہار خیال کرنا ممکن نہیں لہٰذا چند ناولوں کے حوالے سے یہ جاننے کی میری ایک کوشش ہے کہ شاہراہ میں شائع ہونے والے ناولوں کے موضوعات کیا تھے؟

رسالہ شاہراہ کا ناولٹ نمبر اول ان معنوں میں بھی اہم ہے کہ یہ سارے ناولٹ تراجم ہیں، ان میں سات غیر ملکی زبان کے ناولٹ کے تراجم ہیں اور آٹھ ناولٹ ہندوستانی زبان (اردو کے علاوہ) کے ناولٹ ہیں۔ چونکہ مدیر نے اس جانب اشارہ کیا تھا کہ شاہراہ کے ناولٹ نمبر کا دوسرا حصہ تخلیقی ناولوں پر مشتمل ہوگا، غالباً یہی وجہ ہے کہ اس شمارے میں اردو ناولٹ کو شامل نہیں کیا گیا ہو۔ مدیر نے ناولٹ نگار کے ساتھ مترجم کی تصویر بھی لگادی، ساتھ ہی ابتدا میں ناول نگاروں کا مختصر تعارف بھی پیش کیا ہے، جس سے قاری اس تخلیق کار سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ فن کار کے نظریات سے بھی واقف ہوسکے۔ میں نے ان ناولوں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے تاکہ شاہراہ کے ناولٹ نمبر میں شائع ہونے والے ناولٹ کے موضوعات، مصنف کا تعارف اور ناول کی مختصر کہانی قاری کے سامنے آجائے۔

ناولٹ نمبر میں شامل پہلا ناولٹ دستووسکی کا ناول 'غریب لوگ' ہے۔دستووسکی کا تعلق روس کے اس عہد سے ہے جب وہاں جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ اور سرمایہ داری کے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ دستووسکی نے اس پوری تبدیلی کو اپنے آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں اس دور کی ترجمانی نظر آتی ہے۔

ناولٹ نمبر میں شامل پہلا ناولٹ دستووسکی کا ناول 'غریب لوگ' ہے۔ دستووسکی کا تعلق روس کے اس عہد سے ہے جب وہاں جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ اور سرمایہ داری کے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ دستووسکی نے اس پوری تبدیلی کو اپنے آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں اس دور کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ دستووسکی کے کرداروں پر گفتگو کرتے ہوئے مترجم نے لکھا ہے۔

''دستووسکی کے ناولوں میں ہمیں دبے کچلے سرکاری ملازم، چھوٹے دوکاندار، اوباشی کی زندگی بسر کرکے تنگ دست ہوجانے والے جاگیردار، بھٹکے ہوئے نوجوان، امراض سے جھلائے ہوئے انسان اپنے دلوں میں جرائم، نفرت اور غلاظتوں کی پرورش کرتے ہوئے افراد ملتے ہیں۔

دستووسکی کے ناولوں کے ہیرو فرار کے قائل ہیں۔ وہ اپنے سینے پر زخم کھاسکتے ہیں مگر احتجاج نہیں کرسکتے۔ وہ اپنی زندگی کو بدلنے کے لیے انقلابی راستہ اختیار نہیں کرتے۔''

مترجم کے مذکورہ خیالات کا اطلاق دستووسکی کے بیشتر ناولوں پر کیا جاسکتا ہے۔ دراصل دستووسکی کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنے عہد کی سچائیوں اور انسانی مصائب کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور اس کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔

ناولٹ 'غریب لوگ' ایک ایسا ناول ہے جسے خط کے اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ پورے ناول میں ایک شخص اپنے جذبات واحساسات کو پیش کرنے کے لیے خطوط کا سہارا لیتا ہے۔ اس ناول کے تین کردار ہیں، 'ماکارو میوشکن'، 'وارووارا' اور 'تھریسا'۔ حالانکہ پورا ناول 'ماکارو میوکشن' کے ارد گرد ہی گھومتا نظر آتا ہے۔ ناولٹ کا آغاز ان خطوط سے ہوتا ہے جو ماکارومیوکشن اور وارووارا نے ایک دوسرے کو لکھے تھے۔ ان خطوط میں ان دونوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی ملتی ہے اور ساتھ ہی اسے ناولٹ کا ابتدائیہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ ماکارومیوکشن اور وارووارا دونوں دوست ہیں اور ایک دوسرے کے ماضی اور حال سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔ وارووارا کا ماضی ہی اس ناولٹ کا مرکزی واقعہ ہے۔ ناولٹ 'غریب لوگ' میں ماکارومیوکشن اور وارووارا کی محبت اور ان کے ماضی وحال کی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کے کردار بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ انسانی رشتے میں آرہی تبدیلی اور گراوٹ، انسان کی بیماری، ذہنی اور جسمانی الجھنوں کے ساتھ ساتھ سسک سسک کر زندگی جینے پر مجبور ہونے والے انسانوں کی ترجمانی پیش کرتے ہیں۔ دستووسکی کے ناولوں کے بارے میں مترجم نے لکھا ہے کہ چونکہ وہ خود بیماری کا شکار تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ ان کے ناولوں میں

دستووسکی کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ اس کی نگاہ ہمیشہ انسان کی فطری غلاظتوں کو چنتی رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ گھناؤنے اور نفرت انگیز واقعات کی ٹوہ میں رہتا تھا۔ دستووسکی کے ناول پڑھنے سے ہمیں زندگی کے علم پر عبور حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ زندگی کے ہزاروں ڈھکے چھپے پہلو ہم پر بے نقاب ہوتے ہیں اور ہم سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ صدیوں کی لوٹ کھسوٹ اور بربریت نے انسان کے باطن میں کتنی تلخیاں، کتنی غلاظتیں اور کتنی ذلتیں سمو دی ہیں۔

بھی مختلف بیماریاں اور اس کی غلاظتوں کا ذکر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مترجم نے لکھا ہے:

''دستووسکی کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ اس کی نگاہ ہمیشہ انسان کی فطری غلاظتوں کو چنتی رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ گھناؤنے اور نفرت انگیز واقعات کی ٹوہ میں رہتا تھا۔ دستووسکی کے ناول پڑھنے سے ہمیں زندگی کے علم پر عبور حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ زندگی کے ہزاروں ڈھکے چھپے پہلو ہم پر بے نقاب ہوتے ہیں اور ہم سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ صدیوں کی لوٹ کھسوٹ اور بربریت نے انسان کے باطن میں کتنی تلخیاں، کتنی غلاظتیں اور کتنی ذلتیں سمودی ہیں۔''

دستووسکی کے ناولوں کو پڑھتے ہوئے ہمیں اس جانب بھی اشارے ملتے ہیں کہ کس طرح جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے انسانوں کے جذبات واحساسات کے ساتھ ساتھ ان کی خوشیوں کو بھی کچل دیا ہے۔ ناولٹ 'غریب آدمی' کی کہانی دراصل محبت اور اس سے متعلق جذبات واحساسات کو پیش کرتی ہے مگر اس کے پس پردہ ان حقائق کو بھی پیش کرتی ہے جس سے اس وقت کی انسانی زندگی گزر رہی تھی۔

ناولٹ نمبر میں میکسم گورکی کا ناولٹ 'اے غم دوراں' بھی شامل ہے۔ اس ناول کا اردو ترجمہ خلیل احمد نے کیا تھا۔ میکسم گورکی کا تعلق روس کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جس نے اپنی تخلیقات سے حقیقت پسندی بلکہ کمیونسٹ فکر کو فروغ دیا، ان کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ میکسم گورکی نے روسی عوام کے انقلابی شعور کو اور بھی پختہ کیا ہے۔ میکسم گورکی کے تعارف میں مترجم نے لکھا ہے۔

''حقیقت پسندی کی حامل تمام ادبی تخلیقات کی بنیاد زندگی پر ہوتی ہے۔اس اعتبار سے گورکی نہ صرف بڑا حقیقت پسند تھا بلکہ زندگی کا عظیم معلم بھی تھا۔انشا پردازی ایک بہت پیچیدہ عمل ہے۔اس کے لیے ایک ادیب کو اپنے تجربوں، اپنی معلومات، اپنے مشاہدوں ، اخلاقی قدروں، اپنے جمالیاتی ذوق اور زبان و اظہار پر اپنے عبور کی مدد سے حقیقت کی ایک جھالر بنا پڑتی ہے۔میکسم گورکی نے اپنی تمام تخلیقات میں حقائق کو کچھ ایسے ہی رنگ میں پیش کیا ہے۔''

(شاہراہ ناولٹ نمبر حصہ اول، ص 79)

میکسم گورکی کے یہاں مایوسی نہیں، وہ اپنی کہانیوں سے زندگی اور اس کے نشیب و فراز پر کامیابی اور نصرت پانے کا خواہش مند ہے۔خود گورکی کی پوری زندگی دشواریوں میں گزری تھی، مگر اس نے اس پر ہار نہیں مانی۔ گورکی نے اپنے ناولوں سے روسی عوام کے اندر انقلابی شعور پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔ان کے ناولٹ کو پڑھتے ہوئے قاری بقول مترجم''زندگی کی نیرنگیوں پر حیران بھی ہوتا ہے اور زندگی سے محبت بھی کرنے لگتا ہے''۔میکسم گورکی کا یہ ناولٹ 'اے غم دوراں' میں ان کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے فسطائی طاقتوں، بورژواری نظام، سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی زیادتی اور اس کے استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، وہ ان طاقتوں سے دبنے کے بجائے ان سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابی ذہنیت رکھنے والے تخلیق کاروں نے میکسم گورکی کے اسلوب کی نہ صرف پیروی کی بلکہ ان کی تخلیقات کو مشعل راہ بھی بنایا۔

تورگنیف نے اپنے ناولوں میں روس کی عورتوں کے مسائل کو مرکزیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔تورگنیف نے اپنے ناولوں میں وہاں کی عورتوں کے جذبات و احساسات کو بہت خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔ رسالہ شاہراہ میں تورگنیف کے کئی ناولٹ شائع ہوئے۔ شاہراہ کے ناولٹ نمبر میں تورگنیف کا ایک ناولٹ یوسف جامعی نے 'پھرتے ہیں میر خوار' کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔

تورگنیف کی پیدائش جس گھرانے میں ہوئی وہ کئی معنوں میں اچھا اور تعلیم یافتہ تسلیم کیا جاتا تھا اور تورگنیف کی شخصیت پر بھی اس ماحول کا اثر خوب ہوا۔تورگنیف ایک سماجی شخص تھا اس کی تحریروں سے اس زمانے کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔تورگنیف نے اپنے ناول میں حقیقت نگاری پر زور دیا ہے۔ان کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے مسائل کو فوراً سمجھ لیتا تھا، ان کے نزدیک قومیت کے بغیر کوئی بھی فن پارہ اگر تخلیق کیا جائے تو اس کی مثال بے روح انسان کی سی ہوتی ہے۔

حقیقت پسندی کی حامل تمام ادبی تخلیقات کی بنیاد زندگی پر ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے گورکی نہ صرف بڑا حقیقت پسند تھا بلکہ زندگی کا عظیم معلم بھی تھا۔ انشا پردازی ایک بہت پیچیدہ عمل ہے۔ اس کے لیے ایک ادیب کو اپنے تجربوں، اپنی معلومات، اپنے مشاہدوں، اخلاقی قدروں، اپنے جمالیاتی ذوق اور زبان و اظہار پر اپنے عبور کی مدد سے حقیقت کی ایک جھالر بنا پڑتی ہے۔ میکسم گورکی نے اپنی تمام تخلیقات میں حقائق کو کچھ ایسے ہی رنگ میں پیش کیا ہے۔

نکولائی گوگل کا ناول 'نفیسکی پراسپکیٹ' کا اردو ترجمہ 'دیار جاناں' کے عنوان سے دلیپ سنگھ نے کیا تھا، جو رسالہ شاہراہ کے ناولٹ نمبر میں شامل ہے۔۔نکولائی گوگل کا بچپن وسطی یوکرین میں گزرا۔نکولائی کے والد ایک اچھے اداکار ہونے کے ساتھ ساتھ، انھوں نے کچھ عربیہ ناٹک لکھے تھے، نکولائی نے بھی اپنے والد کے اثرات قبول کیے۔مگر اسے کامیابی نہیں ملی، اس نے کئی پیشہ کو اختیار کرنا چاہا مگر ہر جگہ ناکامی کے سبب وہ دل برداشتہ ہوگیا، آخر میں انھوں نے ادب کی طرف توجہ کی اور ناول نگاری کو اپنے اظہار کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔نکولائی گوگل نے طنز و مزاح نگار کے طور پر بھی اپنی ایک شناخت قائم کی۔ جہاں تک ان کے مذکورہ ناولٹ 'دیار جاناں' کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مترجم نے لکھا ہے کہ وہ انسانوں میں مضحکہ خیز باتوں کا خاص طور پر مشاہدہ کرتا، اس نے ان لوگوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے جس نے اس کو تکلیف پہنچائی تھی۔مترجم کا خیال ہے گوگل کا مضحکہ خیز کردار اور عجیب و غریب واقعات ایجاد کرنے میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ناولٹ 'دیار جاناں' کے متعلق مترجم کا خیال ہے۔

''سینٹ پیٹرس برگ میں نکولائی گوگل نے ایک نہایت اندوہناک زندگی بسر کی تھی۔اس نے اپنے اس ناولٹ 'نفیسکی پراسپکیٹ' میں سینٹ پیٹرس سے انتقام لیا ہے۔جن لوگوں نے اسے رنج پہنچایا تھا، اس نے اس ناولٹ میں ان کا مضحکہ اڑایا ہے۔مگر اتنا خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اس نے حقیقت کو کہیں مسخ نہیں ہونے دیا۔''

نکولائی گوگل کی یہی خوبی ہے کہ وہ سچائی اور حقیقت کو طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں پیش تو کرتا ہے مگر فنی اصولوں کی پابندی کچھ اس طرح کرتا ہے کہ نہ فن مجروح ہو اور نہ حقیقت بدلے۔'دیار جاناں' اس کی بہترین مثال ہے اور بقول مترجم'' یہ ناولٹ اس کی جدت و اختراع کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''

شاہراہ کے ناولٹ نمبر میں 'سومرسٹ مام' کے ناول کا ترجمہ 'تسخیر' کے عنوان سے شامل ہے۔یہ ترجمہ اے نصیر خان نے کیا ہے۔مترجم نے سومرسیٹ اور ان کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مام کا مرتبہ آج وہی ہے جو موپاساں اور دیگر انفرادیت پسند ادیبوں کا ہے۔اس کا شمار آج چوٹی کے ادیبوں میں ہے۔ اس نے ادب کے ذریعے لاکھوں روپے کمائے، وہ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی گزارتا ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ وہ اونچے طبقے کا نمائندہ ادیب ہے تو کسی حد تک بے جا نہ ہوگا مگر اس کے لیے ہم اس کی سرزنش نہیں کر سکتے۔ وہ زندگی کے حسن اور قبح کی طرف بے نیاز رویہ رکھتا ہے۔ وہ ٹھوس حقیقتوں کو جوں کا توں اپنی کہانیوں میں سمو دیتا ہے اور پھر تجزیہ و تبصرہ کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں سے بے رحمانہ سلوک کرتا ہے۔ان کے آلام اور مصائب پر نہ روتا ہے اور نہ ہنستا ہے۔مام نے دنیا کو خوب چل پھر کر دیکھا ہے اور سیاحت اس کا محبوب مشغلہ ہے۔مام ادب برائے ادب کا قائل ہے۔مگر اس کے باوجود اس کے ادب میں زندگی کی جھلک ہے۔''

سومرسیٹ مام نے تقریباً دس ناول اور کئی اچھے ڈرامے بھی لکھے۔ان کی تحریروں کی خاصیت یہ ہے کہ ان کے کرداروں میں کسی بھی قسم کی یکسانیت بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔سومرسیٹ کی کہانیوں میں جنس اور نفسیاتی کشمکش بھی دیکھنے کو ملتا ہے، جہاں تک ناولٹ 'تسخیر' کی بات ہے تو اس میں ناول نگار نے عورت اور مرد کے رشتے اور اس سے متعلق کئی دلچسپ پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔

اس کے علاوہ پرل ایس بک کا ناول The God Earth کا اردو ترجمہ محمد قاسم نے 'سفر حیات' سے کیا جب کہ جان اسٹین بیک کے ناول کا ترجمہ عبدالطیف اعظمی

نے 'یہ گلیاں یہ کوچے' کے نام سے کیا ہے جو شاہراہ کے ناولٹ نمبر میں شامل ہے۔

جیسا کہ میں نے مضمون کی ابتدا میں عرض کیا تھا، شاہراہ کا ناولٹ نمبر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ عالمی ادب یا عالمی ناولٹ کے انتخاب اور دوسرا حصہ اردو کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں لکھے گئے ناولٹ کے تراجم پر مبنی ہے۔اس حصے میں شامل پہلا ناولٹ پریمندر متر کا 'مچھل' ہے۔ جسے اردو میں شیام سندر نے 'جلوس' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔

پریمندر مترا کی شناخت کئی حوالوں سے قائم ہوسکتی ہے، وہ فلمی دنیا سے وابستہ رہے، کہانیاں لکھیں، فلمیں بنائی، وہ اچھے صحافی، عمدہ شاعر اور ایک اچھے تخلیق کار تھے، انہوں نے ناول اور افسانہ دونوں ہی اصناف میں زور آزمائی کی۔ان کا شمار بنگال کے اہم ترین تخلیق کاروں میں کیا جاتا ہے۔یہ ناولٹ ان نوجوانوں کی زندگی اور ان کے کارنامے اور جذبے کی کہانی بیان کرتی ہے جس نے حصول آزادی میں اپنا سب کچھ کھو دیا ہے، مگر انہیں کسی قسم کا کوئی افسوس کوئی ملال نہیں ہے۔ناولٹ 'جلوس' میں شچپن اور روین کا کردار کافی متحرک اور جاندار ہے۔ شچپن بنیادی طور پر آزاد خیال بلکہ عاشق مزاج اور زندہ دل اور بہادر نوجوان ہے، جو ہر بات کو ہنسی مذاق میں اُڑادینے اور زندگی کے مسائل پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے اس کو ہلکے پھلکے انداز میں لینے کا عادی ہے۔اس کا خیال ہے کہ جب زندگی ضائع ہی کرنی ہے تو کیوں نہ چالاکیوں کے ساتھ ختم کی جائے۔وہیں اس ناول کا دوسرا کردار روین ہے، جسے ناول کا ہیرو بھی کہا جاسکتا ہے۔ روین نہایت سنجیدہ اور دنیا داری سے بے خبر ہے۔اسے شچپن کی چالاکیاں پسند نہیں، باجود اس کے وہ اس کی دوستی اور اس کے شخصی دباو سے باہر نہیں نکل پاتا۔شیام سندر نے لکھا ہے

ملک کی آزادی کی جنگ میں اپنا سب کچھ قربان کرکے شامل ہونے والے نوجوانوں کی اس جماعت کی داستان جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی سبق آموز ۔آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے جس میس کی داغ بیل ڈالی ہے ملک کی خدمت کو بھول کر اسی کے ہوکر رہ جاتے ہیں‌لیکن لاکھ کوشش کرنے پر بھی میس کو خوبی سے نہیں چلا سکتے۔

''ملک کی آزادی کی جنگ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے شامل ہونے والے نوجوانوں کی اس جماعت کی داستان جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی سبق آموز۔آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے جس میس کی داغ بیل ڈالی ہے ملک کی خدمت کو بھول کر اسی کے ہوکر رہ جاتے ہیں لیکن لاکھ کوشش کرنے پر بھی میس کو خوبی سے نہیں چلا سکتے۔''

اس ناول کا ایک کردار منو کا ہے، جو ایک راہبہ ہے۔منو دراصل ایک ایسے کردار کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے جس نے ہمیشہ لوگوں کی مدد کی ہے کسی سے کبھی کچھ لیا نہیں مگر مترجم نے اسٹیشن ماسٹر کے کردار کو بڑا کردار کہا ہے جو ناول کے اختتام پر سامنے آتا ہے۔

شاہراہ میں جے نیندر کمار جو کہ ہندی کے مشہور ناول نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں ان کے ناولٹ کا ترجمہ 'استعفا' کے نام سے شائع ہوا، یہ ترجمہ شریف احمد نے کیا تھا۔ اس ناول کو ہندی میں خاص طور پر بہت مقبولیت ملی۔ جے نیندر کمار نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب اردو میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ 1929 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'پھانسی' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ پریم چند نے لکھا ہے کہ'' تم گورکی کو ڈھونڈنا چاہتے ہو؟ ہندوستان میں کوئی گورکی ہے یا ہوسکتا ہے تو وہ جے نیندر ہے۔'' جے نیندر کمار کے متعلق مترجم کا خیال ہے:

''جے نیندر کمار ادب میں داخلیت پسندی کے زیادہ قائل ہیں۔آپ ہندی کے صاحب طرز انشا پرداز ہیں اور آپ ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں۔آپ چونکہ ایک غیر ریاستی سماج کے حامی ہیں اس لیے آپ کی تخلیقات میں آپ کے اس نظریے کی نمایاں جھلکیاں ملتی ہیں۔''

جے نیندر کمار کا سیاسی نظریہ گاندھی جی سے ملتا ہے جبکہ ادب میں وہ پریم چند سے متاثر نظر آتے ہیں۔انھوں نے فرقہ پرستی کے خلاف بہت کچھ لکھا یہی نہیں اردو اور ہندی زبانوں کے درمیان پیدا ہورہی خلیج کے خلاف بھی انھوں نے اپنے خیالات پیش کیے۔ان کا خیال ہے کہ سیاست کو ادب کی بلندی عطا کرنی چاہیے۔گویا ادب اور سیاست کے درمیان ایک مضبوط رشتے کے خواہاں تھے۔ حالانکہ وقت کے ساتھ ان کے خیالات ونظریات میں تبدیلی آئی اور مذکورہ ناولٹ اس کی عمدہ مثال ہے۔بقول مترجم ''اس ناولٹ میں خارجیت اور داخلیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔''

پنجابی زبان کے معروف فکشن نگار لوچن بخشی کا ناولٹ 'بھرے میلہ میں' بھی شاہراہ میں شائع ہوا۔ اس

جے نیندر کمار ادب میں داخلیت پسندی کے زیادہ قائل ھیں۔ آپ ھندی کے صاحب طرز انشا پرداز ھیں اور آپ ایک منفرد اسلوب کے مالک ھیں۔ آپ چونکه ایک غیر ریاستی سماج کے حامی ھیں اس لیے آپ کی تخلیقات میں‌آپ کے اس نظریے کی نمایاں جھلکیاں ملتی ھیں۔

ناولٹ کا اردو ترجمہ مخمور جالندھری نے کیا ہے۔لوچن بخشی کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا اور ان کی تخلیقات میں بھی اس کی تصویر کشی ملتی ہے۔مخمور جالندھری لکھتے ہیں:

''لوچن بخشی کا فنی کمال یہی ہے کہ وہ زندگی کے نگار خانے میں بیشتر الٹی ہوئی تصویروں کو نہ صرف سیدھا دیکھتا ہے بلکہ انھیں سیدھا کر کے دوبارہ لٹکا دیتا ہے۔اس کے ناولٹ 'بھرے میلہ میں' بھی بعض تصویریں الٹی لٹکی ہوئی ہیں جنھیں وہ چابکدستی سے آہستہ آہستہ سیدھا کرتا چلا جاتا ہے۔اور آپ کو آخر میں ہر تصویر سیدھی لٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔لوچن بخشی کی سحر نگاری کا ایک پہلو اور بھی ہے وہ ایک توانا زندگی کے کردار چنتا ہے اور ماحول میں کچھ توانائی سرایت کر دیتا ہے کہ کہانی کا ماحول بھی بجائے خود ایک کردار بن جاتا ہے۔ اس کے ناولٹ میں 'بنتو' جس عورت کے روپ میں پیش کی گئی ہے وہ عورت میں چھپی ہوئی عظیم عورت کی ایک انمٹ اور جاوداں شبیہ ہے۔''

لوچن بخشی نے اپنے مشاہدات اور تجربات سے ان موضوعات کو اپنایا جو ہماری زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، پھر اس نے اپنے کمال فن سے اس کو ایک نئی جہت عطا کی۔ گاؤں اور شہر کی زندگی اور اس کے مسائل کا بیان لوچن بخشی کی تخلیقات میں جابجا نظر آتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ اس ناولٹ کو 'بھرے میلہ میں' کا نام دیا گیا۔

سندھی زبان کی ادیبہ 'سندری اُتم چندانی' کے ناولٹ کا اردو ترجمہ 'گرتی دیواریں' کے عنوان سے شاہراہ میں شائع ہوا۔اس کے مترجم درباری لعل اجوانی ہیں۔وہ ترقی پسند نظریے کی حامی تھیں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو، مراٹھی اور بنگالی زبانوں میں لکھے گئے افسانوں کا سندھی ترجمہ کیا۔اس ناولٹ میں وہ ایک خاص نقطہ نظر کو پیش کرتی ہیں۔وہ خود ایک خاتون ہیں مگر عورتوں کے تعلق سے ان کا نظریہ ہے کہ عورتوں کو عیش وعشرت کی زندگی سے زیادہ اپنے شوہر اور گھریلو زندگی پر توجہ دینی چاہیے۔ ناول گرتی دیواریں میں ان کا نظریہ واضح ہوجاتا ہے۔

اس ناول کے دو اہم کردار ہیں ’ ریکھا ‘ ، اور ’ چندن ‘۔ دونوں کے خیالات ایک دوسرے سے بے حد مختلف اور الگ ہیں۔ ریکھا زندگی کو عیش وعشرت میں گزارنا چاہتی ہے مگر چندن اس کے برعکس اپنی زندگی کو سماج اور عوام کی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش میں صرف کیے ہوئے ہے۔ پوری کہانی ان کے متضاد رویے کے ساتھ آگے بڑھتی ہے آخر میں ریکھا کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ سمجھ جاتی ہے کہ زندگی میں خوشیوں کے لیے ضروری ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان محبت اور یقین کا رشتہ قائم ہو، یہی نہیں وہ ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔

ہندی کی ادیبہ رجنی پنکر کا ناولٹ ’ کالی لڑکی ‘ کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس ناولٹ کا اردو ترجمہ پرکاش نگارچ نے کیا ہے۔ رجنی پنکر نے ہندی میں وہی کام کیا جو اردو میں قرۃ العین حیدر نے کیا تھا۔ یعنی اعلی متوسط عوام کی زندگی اور ان کے مسائل کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا۔ وہ چونکہ خود بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہیں لہٰذا ان کے بیان میں ایک قسم کی حقیقت نظر آتی ہے۔ ناولٹ ’ کالی لڑکی ‘ کی کہانی ایک ایسی غم زدہ لڑکی کی کہانی ہے جو سماج میں اپنا مقام اور اپنی حیثیت تلاش کر رہی ہے۔

ادب کی دنیا میں کئی نام ایسے بھی ہیں جنھوں نے بہت کم لکھا باوجود اس کے ان کی حیثیت ایسی ہے کہ ان کے بغیر ادب کی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ مراٹھی زبان کے ادیب شری پات شیودایا چوگلے کا شمار بھی انہی ادیبوں میں کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے محض ایک ناولٹ ’ پاٹلاچی ایک ‘ تصنیف کیا، مگر مراٹھی ادب میں اپنی ایک ایسی چھاپ قائم کی کہ ان کا ذکر کیے بغیر مراٹھی ادب مکمل نہیں ہوسکتا۔ اس ناول کا اردو ترجمہ ’ زمیندار کی بیٹی ‘ کے نام سے ’ نورنبی عباس ‘ نے شائع کیا۔ اس ناول میں ناول نگار نے دیہی زندگی ، وہاں کے لوگ، ان کے مسائل، ان کی زندگی کی دشواریاں ، ان کی جہالت ، ان کی سادگی، ان کے یہاں موجود سچائی اور بھولے پن کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ناول کے دو اہم کردار دیال اور کنول ہیں۔ دیال کا تعلق اچھوت خاندان سے ہے۔ دیال اپنی محنت لگن اور سچے عزائم کی بدولت تعلیم حاصل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کو گاؤں کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر بنادیا جاتا ہے، وہیں دوسرا کردار زمیندار کی بیٹی کنول کا ہے، جس کی پرورش تو عیش وعشرت میں ہوئی، مگر تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کو زندگی کی حقیقت کا علم ہوتا ہے اور وہ ان اچھوت اور غریب لوگوں سے نفرت کرنے کے بجائے ان سے محبت کرتی ہے، ان کی اصلاح اور ان کی تعلیم پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔ مگر گاؤں میں ان لوگوں کی بھی کمی نہیں جو غریب عوام کو لوٹنے کھسوٹنے کی دن رات جتن میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی ایسی حرکتوں سے گاؤں کے لوگ بھی پریشان ہیں مگر ان کے خلاف جانے کی ان میں ہمت نہیں۔ یہ ایک اچھا ناولٹ ہے، جس میں زندگی کی سچائیوں اور زندگی کے مقاصد کے ساتھ ساتھ سچے عزائم کے ساتھ محنت کرنے والوں کی کامیابی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مترجم نے ناولٹ ’ زمیندار کی بیٹی ‘ کو مراٹھی زبان کا شاہکار ناولٹ بتایا ہے۔

رسالہ شاہراہ کا ناولٹ نمبر حصہ اول میں شامل ناولٹ پر یہ کوئی تنقیدی تحریر نہیں ہے۔ میں نے اس شمارے میں شائع ہوئے ناولٹ کا مختصر تعارف پیش کیا ہے تاکہ قارئین کو اندازہ ہوسکے کہ شاہراہ کی ترجیحات کیا تھیں۔ یوں تو شاہراہ میں کئی دیگر ناولٹ بھی شائع ہوئے مگر میں نے محض ناولٹ نمبر کو اپنے مطالعہ کے لیے منتخب کیا ہے۔ شاہراہ کے ناولٹ نمبر کا جائزہ تفصیل سے لینے کی ضرورت ہے تاکہ اس میں شائع تخلیقات پر بھی گفتگو کی جاسکے۔

شاہراہ کے ناولٹ نمبر میں ایک ایسے ناولٹ کا ترجمہ بھی شائع کیا گیا جس کے بارے میں مترجم کا خیال ہے کہ یہ ناولٹ اس وقت لکھا گیا جب اردو کیا انگریزی میں شاید ناولٹ کا کوئی تصور نہ رہا ہوگا۔ تامل زبان میں لکھا گیا یہ ناولٹ ’ لاکھ بلائیں ایک نشیمن ‘ ہے جس کا اردو ترجمہ خلیق انجم نے کیا ہے۔ ناولٹ کے متعلق مترجم کا خیال ہے:

’’ یہ ناولٹ ایک عظیم ترین کارنامہ ہے جس پر سترہ سو سالوں نے اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑا۔ آج بھی اس میں تازگی ہے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ یہ ناول اتنی مدت پہلے لکھا گیا تھا۔ ناول پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اتنی مدت میں سماجی اور سیاسی شعور کوئی ترقی نہیں کرسکا۔ ‘‘

یہ ناولٹ جنوبی ہند کے بادشاہ شیرا لاون کے چھوٹے بھائی ایلنگو وادیگل نے لکھا ہے، جو حکومت کا وارث تھا، لوگ اس سے نفرت کرتے تھے۔ مگر ایلنگو وادیگل کی دلچسپی موسیقی اور شاعری میں تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ حکومت کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی خاطر جنگلوں میں چلا جاتا ہے، جس کے متعلق مترجم کا خیال ہے کہ جنگل میں بسنے والے لوگوں کی کہانی سے متاثر ہوکر اس نے یہ ناولٹ تخلیق کیا۔ ناولٹ ’ لاکھ بلائیں ایک نشیمن ‘ کا مطالعہ کرتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کا نظریہ ترقی پسند تھا، وہ انسانی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھا۔

شاہراہ کے ناولٹ نمبر میں گجراتی زبان کے ادیب ’ پنا لال پٹیل ‘ کا ناولٹ ’ کاہے کو بیاہی بدلیس...... ‘‘ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ نثار احمد فاروقی نے کیا ہے۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ یہ ناول براہ راست گجراتی سے ترجمہ کی بجائے انھوں نے اس کے ہندی ترجمہ کو سامنے رکھا ہے۔ انھوں نے اس بات کی بھی وضاحت کردی ہے کہ چونکہ ہندی کے مترجم نے مبہم زبان کا استعمال کیا تھا جس کی وجہ سے مفہوم تک رسائی میں دشواری پیدا ہورہی تھی، موصوف نے اسے آسان اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ناولٹ ’ کاہے کو بیاہی بدلیس...... ‘ کا پس منظر دیہات ہے۔ مصنف نے دیہات کی زندگی اور اس کے حسن بلکہ اس کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ اس ناولٹ پر گفتگو کرتے ہوئے نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے۔

’’......اس میں گاؤں کی روح بول رہی ہے۔ گاؤں کی ضرورتیں، جھگڑے، قصے، ماحول ، مسائل، مصروفیات، پنچایت اور برادری کی تصویریں دیکھ کر قاری اسی ماحول میں گم ہوجاتا ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ پٹیل نے اس چھوٹے سے ناول میں قصے کی ترتیب فنکارانہ انداز سے کی ہے کہ، اس کا قلم بہکتا بھٹکتا نہیں ،صرف ایک چھوٹے سے مسئلے کے گرد پورا ناول چکر لگا رہا ہے۔ لیکن ہر سطح پر دلچسپی میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور آخری باب تک پہنچتے پہنچتے بھی suspense باقی رہتا ہے۔ ‘‘

رسالہ شاہراہ کا ناولٹ نمبر حصہ اول میں شامل ناولٹ پر یہ کوئی تنقیدی تحریر نہیں ہے۔ میں نے اس شمارے میں شائع ہوئے ناولٹ کا مختصر تعارف پیش کیا ہے تاکہ قارئین کو اندازہ ہوسکے کہ شاہراہ کی ترجیحات کیا تھیں۔ یوں تو شاہراہ میں کئی دیگر ناولٹ بھی شائع ہوئے مگر میں نے محض ناولٹ نمبر کو اپنے مطالعہ کے لیے منتخب کیا ہے۔ شاہراہ کے ناولٹ نمبر کا جائزہ تفصیل سے لینے کی ضرورت ہے تاکہ اس میں شائع تخلیقات پر بھی گفتگو کی جاسکے۔

■

Naushad Manzar
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

سمت نما

ارشاد قمر

'فکر و تحقیق' کا توضیحی اشاریہ

(جولائی تا ستمبر اور اکتوبر تا دسمبر 1998)

قسط 4

جولائی تا ستمبر 1998

(1) اردو شاعری کے بوہیمین دور کا سماجیاتی مطالعہ: پروفیسر محمد حسن

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگوں کی توجہ طرزِ کلام پر مرکوز رہتی ہے اور طرزِ زندگی کو بھول جاتے ہیں جبکہ سچائی اس کے برعکس ہوا کرتی ہے۔ طرزِ زندگی طرزِ کلام کی مقبولیت کا سبب بنتا ہے۔ محمد حسن نے اپنے اس طویل مضمون میں شاعروں کی زندگی اور ان کے کلام کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

(2) فن خطاطی- ہماری تہذیبی شناخت: ڈاکٹر تنویر احمد علوی

علوی صاحب نے خط کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ہی تہذیب و تمدن کے ارتقا اور معاشرتی ضرورتوں میں اس کی کیا معنویت ہے۔ کیا خط نے نئے رنگ اور نئے اسالیب اختیار کیے ہیں۔ اس کی پوری ترجمانی اس مضمون میں ہے اور فن کارانہ فکر کے ساتھ ہمیں ہندوستان کی خطاطی کو ترویج دینا ہے۔

(3) فرہنگ کبیر (یعنی مگہر والے کبیر کے کلام میں مستعمل لفظوں کی فرہنگ): پروفیسر محمد انصاراللہ

پروفیسر محمد انصاراللہ نے اپنے اس بیش بہا مضمون میں کبیر کے خاندان کے سلسلے میں جو اختلاف ہے اس کا بھی ذکر کیا ہے لیکن ان کی توجہ ان کے کلام میں جو مشکل الفاظ آئے ہیں ان کے معانی و مفاہیم کو بیان کرنے پر رہی ہے اور کافی حد تک وہ اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

(4) غالبیات- چند مطالعہ اور مشاہدے: جناب کالی داس گپتا رضا

ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا نے دیوانِ غالب کے اختلافی مسائل کو بڑی سنجیدگی اور عمدگی کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ نسخۂ عرشی کے علاوہ جو بھی غالب کے مختلف فیہ کلام ہیں ان سب کی جانب اشارہ کیا ہے۔

(5) اقبال خدنگ نظر میں: جناب اکبر حیدری کشمیری

مصنف نے اقبال کے اس کلام کو جو خدنگ نظر میں چھپا اور اقبال کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہے اسے موضوع بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے نقشِ نوبت رائے نظر اور ان کے خدنگ نظر کے علاوہ انوار نظر پر بھی نظر ڈالی ہے۔

(6) سنت کبیر داس: ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

مصنف نے کبیر کے دور کو سمجھنے اور ان ارتسامات کا جائزہ لینے کے لیے جو کبیر کے ذہن پر پڑتے رہے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں ذرا تاریخ اور اس کے کارناموں اور بے رحمیوں دونوں ہی پر غور کرنا ہوگا۔ تبھی کبیر کو حقیقی معنوں میں سمجھ پائیں گے۔

(7) دکنی زبان پر تلگو کا اثر: جناب مغنی تبسم

اس مضمون میں دکنی زبان پر تلگو زبان کے اثرات کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ موضوع گہرے مطالعے اور تحقیق کا محتاج ہے۔ دونوں زبانوں پر قدرت رکھنے والا محقق جو لسانیات کے علم سے بھی بہرہ ور ہو موضوع کے ساتھ پورا انصاف کرسکتا ہے۔

(8) زبانوں کی نسلی درجہ بندی: ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ

کسی لسانی خاندان کے تعین کے لیے زبان کے قدیم ترین رویوں اور ان کے زمانے کی شناخت بے حد اہم ہوتی ہے۔ ساتھ ہی لسانی ارتقاء کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم لسانی ذیلی گروہوں اور ایک خاندانِ السنہ کے ذیل میں آنے والی زبانوں کے درمیان بھی باہمی رشتوں کا تعین کریں۔ نسلی درجہ بندی کے بارے میں جدید نظریات سے واقفیت کے لیے الگ الگ لسانی خاندانوں، یہاں تک کہ الگ الگ زبانوں کو بیان کرنے والی کتابوں، مقالات اور مضامین کا مطالعہ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

(9) مولانا برکت اللہ خان بھوپالی: جناب عبدالودود خاں

مصنف نے مولانا برکت اللہ خاں بھوپالی اور اس وقت کے دیگر علماء کرام کی ان کاوشوں کا مفصل ذکر کیا ہے جنھوں نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ان کے کارناموں کی وجہ سے آج یہ ملک آزاد ہے۔

(10) اردو میں مخطوطات کی فہرست سازی: ڈاکٹر جمیل اختر

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ آج کے جدید دور میں فہرست، کتابیات، اشاریہ اور حوالہ جاتی کتب کو تحقیقی کاموں کے سلسلے میں کلیدی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ آج جبکہ پوری دنیا مواصلاتی نظام انٹرنیٹ کے تحت آ چکی ہے جہاں ہر طرح کی معلومات کی فراہمی سیکنڈوں میں کمپیوٹر کو کمانڈ دیتے ہی حاصل ہو جاتی ہے، انھیں باتوں کو جمیل اختر نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

(11) فکر و تحقیق کی سمت و رفتار: راجستھان، جموں و کشمیر

اس عنوان کے تحت مختلف یونیورسٹیوں میں تحقیق و تدوین کی صورت حال اور سمت و رفتار کے سلسلے میں جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکتوبر تا دسمبر 1998

(1) بھارتیندو ہریش چندر: جناب مدن گوپال

مصنف نے یہ مضمون بھارتیندو ہریش چندر پر لکھا ہے۔ بھارتیندو ہندی ادب کی تاریخ میں ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔ پہلی بار انھوں نے کھڑی بولی کو ہندی ادب کی اساس بنانے کی مہم چلائی تھی جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ مدن گوپال نے بھارتیندو کی مختصر سوانح لکھ کر فکر و تحقیق کے قارئین کو ایک قابل قدر تحفہ دیا۔

(2) اردو میں قواعد نویسی کی روایت: پروفیسر نصیر احمد خاں

نصیر احمد خاں اردو ادب کے استاد ہیں اور انھوں نے لسانیات کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ قواعد نویسی ایک اہم علم ہے جو زبان اور علم زبان سے جڑا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے اس مضمون میں اردو میں قواعد نویسی کا ایک جائزہ لیا ہے۔ لسانیات کی یہ ایک ایسی شاخ ہے کہ اس پر وہ توجہ نہیں دی گئی جس کی یہ وہ مستحق تھی۔

(3) ازبکستان میں اردو زبان و ادب کی مقبولیت: پروفیسر غفور مرادو حسی تولا ئیف

ہندوستان کے لنگوا فرنکا کی تشکیل میں اردو کا بڑا حصہ ہے۔ اردو ہندوستان کی اہم لنگوا فرنکا ہے۔ ازبکستان

وسطی ایشیا کا وہ ملک ہے جس سے ہمارے روابط تاریخ میں بہت دور تک ہیں۔ پروفیسر غفور مراد کا یہ مضمون اپنے ملک میں اردو زبان اور ادب کی مقبولیت کے بارے میں قابل قدر مضمون ہے۔

(4) دکنی زبان- دکن میں اردو کے ارتقا کا ابتدائی دور: ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

اردو کے آغاز کے بارے میں کئی نظریے ہیں۔ منجملہ یہ زبان دکن میں پروان چڑھی اور اس کا ارتقاء پنجاب اور دکن میں بدستور ہوا۔ مصنف نے اس اہم مضمون میں انھیں باتوں کی وضاحت وصراحت کی ہے اور اختلافی مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

(5) شاہ برہان الدین حاتم: پروفیسر قیوم صادق

شاہ برہان الدین حاتم کے بارے میں شمالی ہند کے اردو حلقوں میں زیادہ نہیں لکھا گیا ہے۔ لیکن قیوم صادق نے اپنے گہرے مطالعے کی بنیاد پر پرلطف اور معلومات افزا مقالہ لکھ کر داد و تحسین کے مستحق ہوئے ہیں۔

(6) حرف برہنہ (ایک جائزہ): ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

عنوان چشتی عروض کے حوالے سے دو کتابیں لکھ چکے ہیں۔ دوسری کتاب حرف برہنہ ہے جس پر مسعود حسین خاں جیسے عالموں نے ایسے تبصرے لکھے ہیں کہ یہ اپنے موضوع پر فقید المثال کتاب سمجھی جانے لگی۔ انھیں تبصروں اور تعارف کو کمال احمد صدیقی نے تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

(7) ل۔ احمد اکبرآبادی بحیثیت نقاد: ڈاکٹر محمد ایوب تاباں

ڈاکٹر ایوب تاباں کا، ل۔ احمد اکبرآبادی پر ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ انھوں نے اپنے اس مضمون میں ل۔ احمد اکبرآبادی کو اپنے عہد میں اردو نثر کے ایک منفرد اور مخصوص اسلوب کے نمائندے کے طور پر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

(8) چھاپے خانے کی آمد سے پہلے قلمی صحافت کا چلن: جناب گربچن چندن

گربچن چندن کا شمار اردو کے بزرگ اور سنجیدہ صحافیوں میں ہوتا ہے۔ 'جام جہاں نما' پر ان کی کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کا یہ مضمون چھاپے خانے کی آمد سے قلمی صحافت کی کیا اہمیت و افادیت تھی اور کس طرح صحافت کو پروان چڑھانے میں اس نے اپنا اہم رول ادا کیا ان سب کی مکمل تفصیل اس میں موجود ہے۔

(9) سرسید اور نذیر احمد کے سیاسی میلانات اور تصور قوم: ڈاکٹر مظہر مہدی

سرسید نہ صرف اپنی ذات میں انجمن تھے بلکہ ہشت پہلو ادارہ تھے۔ حالی، نذیر احمد، شبلی اور بہت سی دوسری قد آور شخصیتیں ان کی تربیت کی وجہ سے ادب کے افق پر چمکیں۔ مظہر مہدی نے انھیں باتوں کو اپنے اس مضمون میں بڑی خوبصورتی سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

(10) بلونت سنگھ پر ترقی پسندی کے اثرات: محترمہ ممتاز آرا

بلونت سنگھ اپنے عہد کے بہت اہم افسانہ نگار تھے۔ زمانے نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ممتاز آرا نے بلونت سنگھ پر ترقی پسندوں کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے دیگر چیزوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔

(11) بحر میر (اقتباس): شعر شور انگیز

شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب 'شعر شور انگیز' میر تقی میر پر جدید کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ اس مضمون میں میر کے ایک محبوب آہنگ پر ایک باب کے اقتباس کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

■

Mr. Irshad Qamar
AB 452, First Floor, Amarpuri
Ram Nagar, Nabi Karim, Pahar Ganj
New Delhi - 110055

پرسنل کمپیوٹر کیا ہے؟
(What is a Personal Computer?)

آپ پڑھ چکے ہیں کہ پرسنل کمپیوٹر مائکرو کمپیوٹر کا ایک روپ ہے۔ اس کو بول چال کی زبان میں پی سی (PC) کہا جاتا ہے۔ اسے وقت کی ضرورت کے مطابق بنایا گیا ہے۔ پہلے کے کمپیوٹر سائز میں بہت بڑے، سست رفتار اور کم اعتماد کے قابل تھے۔ اس سے بھی بری بات یہ تھی کہ ان کی قیمت بہت زیادہ تھی، جو عام صارف کی پہنچ کے باہر تھی۔ وقت کے ساتھ کمپیوٹر کے سائز میں کمی ہوئی اور اس کی طاقت بڑھی۔ قیمت بھی نئی تکنیکوں کے سبب کچھ کم ہوئی، لیکن تب بھی وہ بڑی بڑی کمپنیوں کے ذریعے ہی خریدے جانے کے لائق رہے۔

سنہ 1970 کے بعد کے وقت میں مائکرو پروسیسر (Micro Processor) بنائے گئے، جن سے مائکرو کمپیوٹر کا جنم ہوا۔ یہ سائز میں بہت چھوٹے تھے، لیکن ان کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ان کی قیمت بھی ایسی تھی کہ اوسط درجے کی کمپنیاں بھی انھیں خرید کر لگا سکتی تھیں۔ تبھی یہ بات ذہن میں آئی کہ ایک ایسا کمپیوٹر بنایا جائے، جو ایک آدمی کا اپنا کمپیوٹر ہو اور جسے ایک عام آدمی خرید بھی سکے۔

پی سی کا عروج (Development of PC)

اسی کے مدنظر دنیا کی سب سے بڑی کمپیوٹر بنانے والی کمپنی آئی بی ایم (IMB: International Business Machine) نے سنہ 1981 میں اپنا پرسنل کمپیوٹر (پی سی) بنانے کا اعلان کیا۔ اس کو آئی بی ایم۔ پی سی (IBM-PC) کہا گیا۔ اس کی استطاعت بہت کم تھی۔ دراصل یہ صرف کمپیوٹر کے شائقین کے لیے بنایا گیا تھا۔ یہ سائز میں اتنا چھوٹا تھا کہ میز کے ایک کونے پر بھی رکھا جا سکتا تھا۔ یہ اتنا پسند کیا گیا کہ سبھی کمپنیاں پی سی بنانے کے لیے دوڑ پڑیں۔

شروع میں عام طور پر سبھی پی سی ایم ایس۔ ڈاس آپریٹنگ سسٹم پر چلتے تھے۔ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کے منظر عام پر آنے کے بعد انھیں ونڈوز پر چلایا جانے لگا۔ جیسے جیسے ونڈوز میں بہتری آتی گئی، ویسے ویسے زیادہ سہولیات والے پی سی کی ضرورت پڑتی گئی۔ لہٰذا، پینٹیم نام سے پرسنل کمپیوٹر بازار میں آئے جن کا چلن آج کل سب سے زیادہ ہے۔

شروع میں پی سی میں لگائے جانے والے پروسیسر (Processor) 8 بٹ کے ہوتے تھے، لیکن پی سی۔اے ٹی اور پینٹیم میں لگائے جانے والے پروسیسر 32 یا 64 بٹ کے ہوتے ہیں۔ ان کے کام کرنے کی رفتار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آج کل پرانے پی سی، پی سی۔ ایکس ٹی اور پی سی۔اے ٹی لگ بھگ ختم ہو گئے ہیں، صرف پینٹیم سیریز کے پی سی زیادہ چل رہے ہیں۔ ان کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے اور جمع کرنے (اسٹور) کی صلاحیت بھی کافی زیادہ ہوتی ہے۔

جدول C-5.1: طرح طرح کے پرسنل کمپیوٹر

نام	ریم (RAM) ضرورت	مائکرو پروسیسر انٹیل	حساب کی رفتار میگاہرٹز (MHz) میں
پینٹیم سیریز	128-512 میگا بائٹ	32/64 بٹ	133 - 200
ڈوئل کور	1 گیگا بائٹ	32/64 بٹ	1600 - 2900
انٹیل کور 2	1 گیگا بائٹ	64 بٹ	1006 - 3330
انٹیل آئی 3	2-4 گیگا بائٹ	64 بٹ	2400 - 3400
انٹیل آئی 5	2-4 گیگا بائٹ	64 بٹ	1060 - 3460
انٹیل آئی 7	2-4 گیگا بائٹ	64 بٹ	1600 - 3600

آئی بی ایم۔ پی سی کامپیٹبل (IBM-PC Compatible)

پی سی بنانے کی شروعات آئی بی ایم نے کی تھی۔ آج کل سیکڑوں کمپنیاں پی سی بنا رہی ہیں، لیکن ان کے سبھی پی سی آئی بی ایم۔ پی سی کامپیٹبل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پی سی سائز، ترتیب، ہارڈ ویئر، سوفٹ ویئر اور طاقت میں آئی بی ایم۔ پی سی جیسے ہوتے ہیں۔ ان پر وہ سبھی سوفٹ ویئر چلائے جا سکتے ہیں، جو آئی بی ایم۔ پی سی پر چل سکتے ہیں۔ آئی بی ایم کے پاس پی سی کے سوفٹ ویئر کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اس سوفٹ ویئر کا فائدہ اٹھانے کے لیے ہی سبھی کمپنیاں اپنا پی سی آئی بی ایم۔ پی سی جیسا ہی بناتی ہیں۔ اس طرح آئی بی ایم۔ پی سی اپنے ہی کمپیوٹر صنعت کے لیے پیمانہ (Standard) بن گیا ہے۔

اس کتاب میں ہم آئی بی ایم۔ پی سی اور اس کے کامپیٹبل پی سی کے لیے صرف 'پی سی' لفظ کا استعمال کریں گے۔

پی سی کی قسمیں (Kinds of PC)

پہلے پی سی کے جنم کے بعد اب تک پی سی کی کئی نسلیں (Generations) سامنے آ چکی ہیں۔ ان میں سے سرفہرست ہیں: پی سی۔ پینٹیم (Personal Computer-Pentium)، پی سی۔ کور 2 (Personal Computer-core2) اور انٹیل آئی (i) سیریز۔ اس میں بنیادی فرق پروسیسر (Processor) اور جمع کرنے کی صلاحیت (Storage Capacity) کا ہوتا ہے۔ پی سی میں لگائے جانے والے مائکرو پروسیسر انٹیل (Intel 8086) 8086 فیملی کے ہوتے ہیں۔ آئی بی ایم نے بھی اپنے پہلے پی سی کے لیے انٹیل - 8088 مائکرو پروسیسر کو پسند کیا تھا۔

جدول C-5.1 میں بازار میں ملنے والے الگ الگ طرح کے پی سی کے بارے میں تقابلی (Comparative) فہرست دی گئی ہے۔ ہر پی سی کے بارے میں ٹھیک ٹھیک جانکاری اس کے ساتھ ملنے والے مینوئل (Manuals) میں دی جاتی ہے۔ آپ کو اپنے پی سی پر کام شروع کرنے سے پہلے سبھی مینوئل ضرور دیکھ لینے چاہئیں اور کام کرتے وقت بھی مینوئل ساتھ رکھنے چاہئیں،

تاکہ بیچ میں اگر کوئی کنفیوژن ہو، تو مینوئل دیکھ کر اسی وقت دور کیا جاسکے۔

پی سی کے اہم حصے (Main Parts of PC)

کوئی بھی پی سی، چاہے جس قسم کا بھی ہو (پی سی-ایکس ٹی، پی سی-اے ٹی یا پینٹیم) اور کسی بھی کمپنی کا بنا ہو، اس کے اہم حصے تقریباً وہی رہتے ہیں جس سے پورا پرسنل کمپیوٹر بنتا ہے۔ کسی کمپیوٹر کے اہم حصوں کو اس کا سسٹم کانفگریشن (System Configuration) کہتے ہیں۔ تصویر C-5.1 میں ایک پی سی کے اہم حصے دکھائے گئے ہیں اور ان کی طرف نام سے اشارہ کیا گیا ہے۔

کسی پی سی میں درج ذیل ضروری حصے ہوتے ہیں:

(1) سسٹم یونٹ (System Unit)، (2) وی ڈی یو یا مانیٹر (Monitor)، (3) کی-بورڈ (Keyboard)، (4) پرنٹر (printer)، (5) ہارڈ ڈسک ڈرائیو (Hard Disk Dive)، (6) ماؤس (Mouse)، (7) سی ڈی روم ڈرائیو (CD-ROM Drive)

ان کے علاوہ کمپیوٹروں میں ضرورت کے مطابق درج ذیل حصے بھی ہوسکتے ہیں:

(1) جوائے اسٹک (Joystick)، (2) اسکینر (Scanner)، (3) اسپیکر (Speaker)، (4) مائک (Mike)، (5) سی ڈی- رائٹر (CD-Writer) ان تمام حصوں کی تفصیل آگے پیش کی جارہی ہے۔

تصویر C-5.1: پی سی کے اہم حصے

سسٹم یونٹ (System Unit)

یہ حصہ ہی درحقیقت اصلی کمپیوٹر ہے۔ پی سی میں ہونے والے سبھی کام اسی کے ذریعے کیے یا کرائے جاتے ہیں اور یہی ہمارے پروگرام کو ٹھیک ٹھاک چلنے کی گارنٹی بھی دیتا ہے۔ پی سی کے بقیہ تمام حصے سسٹم یونٹ کے ذریعے ہی کام کرتے ہیں۔ یہ ایک چوکور باکس ہوتا ہے، جس میں پی سی کے مدر بورڈ (Motherboard) سمیت سبھی کام کرنے والے حصے محفوظ رہتے ہیں۔

تصویر C-5.2: سسٹم یونٹ

سسٹم یونٹ کا سائز کیسا بھی ہو، اس کے سامنے والے حصے میں نیچے دی گئی چیزیں ضرور ہوتی ہیں۔

(1) **پاور سوئچ (Power Switch)**: اس سوئچ سے کمپوٹر کو آن-آف کیا جاسکتا ہے۔

(2) **ری سیٹ بٹن (Reset Button)**: اس بٹن کے ذریعے ہم اپنے پی سی کو بجلی بند کیے بغیر اسے شروع سے پھر چلا سکتے ہیں۔ اس بٹن کو دبانے پر پی سی پر پہلے سے چل رہے سبھی کام ختم ہوجاتے ہیں۔

(3) **فلاپی ڈسک ڈرائیو (Floppy Disk Drive)**: ہر پی سی کی سسٹم یونٹ میں ایک فلاپی ڈسک ڈرائیو ضرور ہوتی تھی، جس میں سامنے کی طرف سے ساڑھے تین انچ کی فلاپی ڈسکیٹ لگائی جاتی تھی۔ اب یہ استعمال میں نہیں ہے۔

(4) **سی ڈی- روم ڈرائیو (CD-ROM Drive)**: عام طور پر سبھی پی سی کی سسٹم یونٹ میں ایک سی ڈی- روم ڈرائیو بھی ہوتا ہے، جس میں سی ڈی لگائی جاسکتی ہے۔

(5) **یو ایس بی پورٹ (USB Port)**: یو ایس بی پورٹ، سسٹم یونٹ میں آگے یا پیچھے ہوتا ہے۔ اس میں آپ پین ڈرائیو یا ڈاٹا کیبل لگا کر ڈاٹا ٹرانسفر کرسکتے ہیں۔

سسٹم یونٹ کے پچھلے حصے میں اس کو پی سی کے دوسرے حصوں، جیسے وی ڈی یو، کی- بورڈ، پرنٹر، ماؤس وغیرہ سے جوڑنے کے لیے پورٹ (Ports) بنے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ مین لائن یا یو پی ایس سے بجلی لینے کے لیے اس میں پلگ لگانے کے لیے ساکیٹ (Socket) بھی لگا ہوتا ہے۔

سسٹم یونٹ میں ہمارے پروگراموں پر عمل کرنے والے کئی چھوٹے چھوٹے پرزے لگے ہوتے ہیں۔ تصویر C-5.3 میں ایک پی سی کے سسٹم یونٹ کا اندرونی حصہ دکھایا گیا ہے، حالانکہ اس میں لگے پرزوں کی جگہ الگ الگ پی سی میں الگ الگ ہوسکتی ہے۔ سسٹم یونٹ کا سب سے زیادہ اہم حصہ 'مدر بورڈ' ہوتا ہے۔ 'مدر بورڈ' کیا ہے اور کس طرح کام کرتا ہے، آیئے دیکھتے ہیں۔

مدر بورڈ (Motherboard): یہ ایک چھپا ہوا الیکٹرانک سرکٹ (Circuit) ہوتا ہے۔ اسے سسٹم بورڈ (System Board) بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں پی سی کے سبھی الیکٹرانک پرزوں کے لیے جگہ بنی ہوتی ہے، جنھیں کسی دھات (Metal) کی پتلی لائنوں کے ذریعے ایک دوسرے سے اس طرح جوڑا جاتا ہے کہ ایک کمپیوٹر کا پورا سرکٹ بن جائے۔ مدر بورڈ پر درج ذیل الیکٹرانک پرزوں یا چپس (Chips) کے لیے جگہ ہوتی ہے۔

(1) **سی پی یو (Central Processing Unit)**: یہ پی سی کا سب سے اہم حصہ ہے، جو ہماری ہدایتوں پر عمل کر کے سبھی کام کرتا ہے۔

(2) **ریم چپ (RAM Chip)**: یہ پی سی کے کام کرتے وقت ضروری ڈاٹا اور پروگرام کو کچھ وقت تک رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ کمپیوٹر کی بجلی بند کر دینے پر ریم میں رکھا گیا سارا ڈاٹا ختم ہوجاتا ہے۔

(3) **روم چپ (ROM Chip)**: اس چپ میں ایسے پروگرام اور ڈاٹا رکھے جاتے ہیں، جو پی سی کو آن کرتے وقت ہی چلائے جاتے ہیں۔ کمپیوٹر کی بجلی چلے جانے پر بھی اس میں بھرے ڈاٹا اور پروگرام ختم نہیں ہوتے۔

(4) **کو-پروسیسر کی جگہ (Co-Processor Slot)**: کسی کسی پی سی میں حساب کے کام کرنے میں سی پی یو کی مدد کے لیے ایک اور چھوٹا پروسیسر لگایا جاتا ہے۔ اسے معاون پروسیسر کہتے ہیں، لیکن یہ پروسیسر تبھی کام میں آتا ہے، جب آپ کے پروگرام میں اس کی مدد لینے کی ہدایت دی گئی ہو۔

(5) **ریم چپ کی خالی جگہ (Empty RAM Chip Slots)**: ریم میموری کو اور بھی بڑھانے کے لیے یہ جگہیں چھوڑی جاتی ہیں۔ یہاں ہم الگ سے ایک یا ایک سے زیادہ ریم چپ لگا کر پی سی کی میموری کا سائز بڑھا سکتے ہیں۔

(6) **پاور سپلائی باکس (Power Supply Box)**: پی سی کے سبھی (یا زیادہ تر) پرزوں کو لگ بھگ 5 وولٹ ڈی سی بجلی سپلائی کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن ہارڈ ڈسک ڈرائیو کو 12 وولٹ ڈی سی کی بجلی چاہیے۔ اگر ان پرزوں کو گھریلو لائن سے جوڑا جائے، تو سبھی پرزے جل جائیں گے، کیونکہ گھریلو بجلی 220 وولٹ اے سی کی ہوتی ہے۔ اس لیے پی

سی میں ایک ایسا پاور سپلائی باکس لگایا جاتا ہے، جو گھریلو اونچے وولٹیج کی بجلی کو کم وولٹیج کی ڈی سی بجلی میں بدل دیتا ہے۔

(7) **ڈسک ڈرائیو کنٹرول کارڈ (Disk Drive Control Card)**: یہ ایک ایسا سرکٹ ہوتا ہے، جو ہارڈ ڈسک ڈرائیو کی موٹر اور ان سے ڈاٹا آنے جانے پر کنٹرول رکھتا ہے۔

(8) **آؤٹ پُٹ ایڈاپٹر کارڈ (Output Adapter Card)**: یہ پی سی کی میموری اور آؤٹ پٹ آلات (وی ڈی یو اور پرنٹر) کے درمیان کی کڑی کا کام کرتا ہے۔ جب بھی کوئی معلومات وی ڈی یو اسکرین پر دکھائی ہوں یا پرنٹر سے چھپوانی ہوں، یہ کارڈ ان معلومات میموری سے لے کر اس کو بائنری سے اصلی نشانات میں بدل کر اسکرین یا پرنٹر کو بھیج دیتا ہے۔

(9) **اسپیکر (Speaker)**: زیادہ تر پی سی میں الگ الگ طرح کی آوازیں نکالنے کا انتظام ہوتا ہے۔ ان آوازوں کو اسپیکر کے ذریعے پیدا کیا جاتا ہے۔

(10) **ٹائمر (Timer)**: یہ ایک طرح کی گھڑی کا کام کرتا ہے۔

ان کے علاوہ مدر بورڈ میں اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے پرزے لگانے کی جگہ بنی ہوتی ہے۔

ٹرمینل (Terminal):

اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ ٹرمینل ایک ایسا آلہ ہے، جو ان پٹ اور آؤٹ پٹ دونوں کا کام کرتا ہے۔ ویسے تو ٹرمینل کئی طرح کے ہوتے ہیں، لیکن ہم سب سے زیادہ پائے جانے والے ٹرمینل کی بات کریں گے۔ اس کے دو اہم حصے ہوتے ہیں۔ ایک وی ڈی یو (Visual Display Unit یا V.D.U) اور دوسرا کی-بورڈ (Keyboard)۔ ایسا ٹرمینل تصویر C-5.4 میں دکھایا گیا ہے۔ وی ڈی یو کو مانیٹر بھی کہا جاتا ہے۔

وی ڈی یو کی شکل ایک ٹیلی ویژن جیسی ہوتی ہے۔ اس کے پردے پر پروگرام کا نتیجہ اور پیغام وغیرہ دکھائے جاتے ہیں۔

وی ڈی یو کے پردے (Screen) کا سائز 8 انچ (230 ایم ایم) سے لے کر 30 انچ (762 ایم ایم) تک یا اس سے بھی زیادہ ہوسکتا ہے۔ اس میں 25 لائنیں ہوتی ہیں۔ ہر لائن میں 80 نشان دکھائے جاسکتے ہیں۔ اس طرح ایک بار میں اسکرین پر 2000 نشانات دکھائے جاسکتے ہیں۔ اس میں کچھ ہی سیکنڈوں کا وقت لگتا ہے۔ وی ڈی یو پر دکھائی جانے والی ہر اطلاع یا گراف بہت

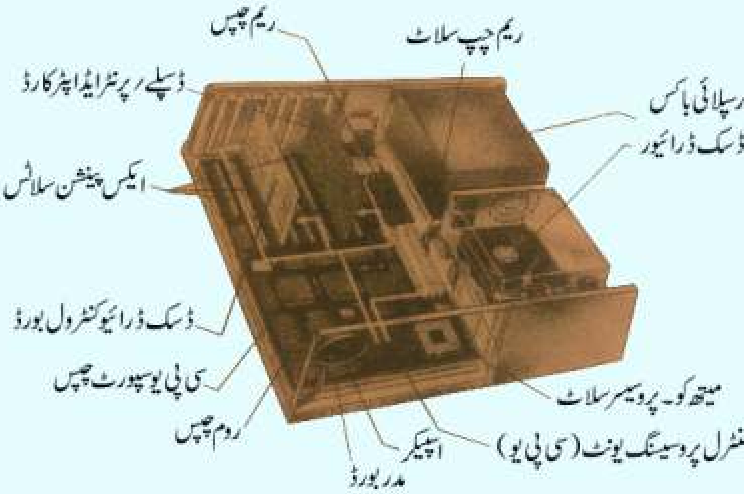

تصویر C-5.3: سسٹم یونٹ کا اندرونی حصہ

چھوٹے چھوٹے چمکیلے نقطوں سے بنے ہوتے ہیں۔ ان نقطوں کو پکسل (Pixel) کہا جاتا ہے۔

وی ڈی یو کے پردے پر ایک نشان کے برابر ایک چھوٹی اور چمکیلی دوہری لائن ہوتی ہے۔ اسے کرسر (Cursor) کہا جاتا ہے۔ ٹرمینل کے کی بورڈ پر جب ہم کسی نشان والے بٹن کو دباتے ہیں، تو وہ نشان کرسر والی جگہ پر ابھر آتا ہے اور کرسر ایک مقام آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح ایک ایک حرف یا نشان ٹائپ کرکے ہم ان پٹ کی جانے والی معلومات یا ہدایات تیار کرلیتے ہیں۔ یہ معلومات تیار ہوجانے پر ہم ایک خاص بٹن دباتے ہیں، جس کا نام ہے رٹرن (Return) یا انٹر (Enter)۔ اس بٹن کو دبانے سے اسکرین پر تیار کی گئی معلومات کمپیوٹر میں چلی جاتی ہے۔

کی-بورڈ پر تیر کے نشانوں والے بھی کچھ بٹن ہوتے ہیں۔ ان بٹنوں کی مدد سے ہم کرسر کو اسکرین پر کہیں بھی لے جاسکتے ہیں۔ ڈاٹا جمع کرتے وقت ہمیں تیر کے نشانوں والے بٹنوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان سے ہم کرسر کو اوپر نیچے یا دائیں بائیں کہیں بھی لے جاسکتے ہیں۔

(الف) کلر گرافک اڈاپٹر یا سی جی اے (Colour Graphic Adapter): یہ کارڈ کئی رنگوں والے یا ایک رنگ والے وی ڈی یو کو کنٹرول کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک رنگ کے وی ڈی یو کے معاملے میں یہ ایک ہی رنگ کو الگ الگ چیکیلے یا ہلکے پن کے ساتھ دکھاتا ہے، جبکہ کثیر رنگی وی ڈی یو پر یہ 256 الگ الگ رنگوں کو ایک ساتھ دکھا سکتا ہے۔

یہ دو طرح سے کام کرتا ہے۔ ٹیکسٹ (Text) اور گرافکس (تصویر)۔ ٹیکسٹ دکھاتے وقت یہ پی سی کے پورے نشانات (Character Set)، جس میں 256 نشانات ہوتے ہیں، کو دکھا سکتے ہیں۔ یہ اسکرین پر 40 یا 80 نشانات والی 25 لائنیں ایک ساتھ دکھا سکتا ہے۔ گرافکس کے وقت اس میں چمکیلے نقطوں (Pixels) کی جزیات کاری (Resolution) یا تعداد ایک رنگ کے وی ڈی یو پر 480x640 اور کئی رنگ کے وی ڈی یو پر 200x320 ہوتی ہے۔ چمکیلے نقطوں کی تعداد زیادہ ہونے سے تصویر بھی زیادہ صاف نظر آتی ہے۔

(ب) ویڈیو گرافک اڈاپٹر (Video Graphic Adapter) یا وی جی اے: یہ کارڈ ہزاروں رنگوں والے وی ڈی یو کو کنٹرول کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی ٹیکسٹ (Text) اور گرافکس (تصویر) دونوں ایک ساتھ دکھائے جاسکتے ہیں۔ ٹیکسٹ دکھاتے وقت یہ کلر گرافک اڈاپٹر کی طرح کام کرتا ہے۔ گرافکس کے وقت اس میں چمکیلے نقطوں (Pixels) کی جزیات کاری (Resolution) یا تعداد 480x640 سے لے کر 768x1024 تک ہوتی ہے۔ اس میں چمکیلے نقطوں کی تعداد زیادہ ہونے سے تصویر بھی بہت صاف نظر آتی ہے۔

ہمارا وی ڈی یو کیسا بھی ہو، اس کے آگے کی طرف اس کی بجلی (Power)، چمک (Lighting) وغیرہ کو کنٹرول کرنے کے لیے سوئچ یا بٹن ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک سوئچ اسکرین کی بجلی جلانے اور بجھانے کے لیے ہوتا ہے۔ دوسرے بٹن سے اسکرین کی چمک ضرورت کے مطابق کم یا زیادہ کی جاسکتی ہے۔ آج کل کلر گرافک اڈاپٹر کا استعمال تقریباً ختم ہوگیا ہے اور صرف ویڈیو گرافک اڈاپٹر والے وی ڈی یو ہی دستیاب ہوتے ہیں۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ وتعارف

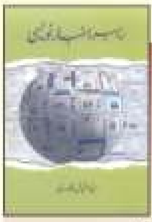

رہبر اخبار نویسی

مصنف: سید اقبال قادری

صفحات: 751، قیمت: 260 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: پروفیسر علیم اللہ حالی، 208، فخر الدین پلازہ، لنگرٹولی، پٹنہ (بہار)

750 صفحات پر مشتمل سید اقبال قادری کی کتاب 'رہبر اخبار نویسی' صحافت سے متعلق تمام ضروری امور پر معتبر دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ ابتدائی صفحات 'عرضِ مصنف' کے عنوان سے مصنفِ کتاب نے صحافت کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج صحافت ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی سے قریب تر ہو چکی ہے۔ دنیا کا ایک حصہ دوسرے حصے سے اس قدر قریب ہو چکا ہے کہ ہم جب تک پوری دنیا میں ہونے والے اہم واقعات سے باخبر نہ ہوں اس وقت تک خود اپنے مسائل حل نہیں کر سکتے۔ ادھر چالیس پچاس برسوں میں ذرائع ابلاغ کی ترقی نے ہمیں دنیا بھر کے حصوں سے باخبر رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ نئے ذرائع اظہار کی تیزی سے ترقی نے ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ ہم جب تک عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات سے باخبر نہ ہوں اس وقت تک خود اپنی جگہ پر مطمئن نہیں رہ سکتے۔ اس لیے موجودہ حالات میں جہاں وسیلہ اظہار کی نئی صورتیں سامنے آئی ہیں عالمی واقعات کی جانکاری بھی ہمارے لیے ضروری ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں اخبار نویسی اور صحافت کی ذمے داریاں بھی خاصی بڑھ چکی ہیں۔ آج صحافت ایک باقاعدہ ترقی یافتہ Faculty کی طرح ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے ناگزیر ہو چکی ہے۔

صحافت کی ضرورت اور عالمی واقعات کے اثرات نے ہمیں شعوری طور پر زیادہ حساس بنا دیا ہے۔ صحافت کے فن سے وابستہ افراد جہاں نئے ذرائع ابلاغ کے ذریعے دنیا کے حالات معلوم کرتے رہتے ہیں۔ وہاں ان حالات کو عام لوگوں تک منتقل کرنے کے سلسلے میں بھی صحافی کی ذمے داریاں خاصی بڑھ چکی ہیں۔ اب صحافت محض ذاتی دلچسپی کا شعبہ نہیں رہ گئی ہے بلکہ ہماری اجتماعی زندگی میں ایک ناگزیر عنصر اور دانش و آگہی کا ذریعہ بن چکی ہے۔

مصنفِ کتاب نے اپنے مختصر لیکن اہم ابتدائیہ میں الفاظ کے جہانِ معنی کو صحافت کے لیے ایک اہم عنصر بتایا ہے۔ زبانوں کے ایک دوسرے سے قریب ہونے اور آلات کی ترقیوں نے الفاظ کے معنی و مفہوم میں بھی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ حالات اور واقعات کو اس کی اہمیت کے لحاظ سے بیان کرنے کے سلسلے میں صحافی حضرات کو نئے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ دنیا کے ایک حصے سے دوسرے حصوں کی قربت کے نتیجے میں لسانی سطح پر بھی ایک زبان دوسری زبانوں سے غافل نہیں رہ سکتی۔ مصنفِ کتاب نے یہ بتایا ہے کہ ہندوستان میں بھی صحافت کا شغل خاصا قدیم ہے۔ سیاسی اور معاشرتی سطح پر نئے تغیرات سے ہمکنار کرنے میں ہماری صحافت نے اہم رول ادا کیا ہے۔ مصنف نے اردو صحافت کے ارتقا کی تصویر بھی پیش کی ہے اور عہد حاضر کی اشاعتی اور طباعتی سہولتوں کے پیشِ نظر ہمیں اپنی ذمے داریوں سے بھی باخبر کیا ہے۔

پیشِ نظر کتاب خبر نویسی کے اہم پہلوؤں کی تفصیل پیش کرتی ہے۔ مصنف نے جو عنوانات مقرر کیے ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صحافت کے تمام ضروری امور کے سلسلے میں نہ صرف واقفیت کے حامل ہیں بلکہ انھیں عصرِ حاضر کی صحافتی ذمے داریوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب دس اہم ابواب پر مشتمل ہے جس کے تحت صحافت کی تاریخ، خبروں کے اقسام، خبروں کے سرچشمے، خبروں کی اہمیت کے لحاظ سے ان کی Editing، نامہ نگاری کے بنیادی اصول، اخبار میں الفاظ و املا کی درستگی، مختلف تقریبات اور تقاریر میں اہم حصوں کی تلاش، نامہ نگاری کے جدید اصول، ادبی اور اخباری تحریر کے فرق اداریہ نگاری، کالم نویسی، انٹرویو، اخبار میں تحریر کے ساتھ تصویروں کی شرکت کے اصول، اخبار نویسی کے سلسلے میں ضروری اخلاقی قانونی امور، مختلف صحافتی انجمنوں کا تعارف، اخبارات میں ضروری اصطلاحات کا استعمال— غرض صحافت کے حوالے سے آج کی ترقی یافتہ دنیا کے تمام ضروری امور کے ساتھ یہ کتاب خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اسے شائع کر کے اگر ایک طرف صحافت کے پیشے سے منسلک افراد کے لیے ایک وقیع ہدایت نامہ پیش کر دیا ہے تو دوسری طرف بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے بھی یہ کتاب کافی اہمیت کی حامل ہے جو اخبارات کے ذریعے تمام عالمی امور کی آگہی کو اہم سمجھتے ہیں۔

میر تقی میر

مصنف: نثار احمد فاروقی
صفحات: 191، قیمت: 43 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: اسما، مکان نمبر R-206 گلی نمبر 5، سر سید روڈ، ملہ ہاؤس، نئی دہلی

میر شناسی کے باب میں نثار احمد فاروقی نہایت اہم نام ہے۔

میر تقی میر شخصیت و فن کے حوالے سے اس کتاب کی اہمیت اس لیے دوبالا ہو جاتی ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ میر کے مستند حالات و زندگی کو نہایت اختصار و جامعیت اور زمانی تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور میر کے فن اور تصانیف پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ تمام پہلوؤں کا احاطہ ہو سکے۔ ساتھ ہی اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ اس میں تنقیدی پہلو کم سے کم ہوں تا کہ کتاب کا مقصد مکمل طور پر واضح ہو سکے اور بچوں کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم ہو سکیں۔ جس کا اظہار کتاب کے ابتدائیہ میں صاحب کتاب اس طرح کرتے ہیں کہ ''اس کتاب کا مقصد تنقید نہیں تعارف ہے۔''

کتاب کا پہلا باب 'سوانح حیات' کے عنوان سے ہے جس میں 60 ذیلی عناوین شامل ہیں۔ اس کے ذریعے مصنف نے میر کے ابتدائی حالات، خاندان، آباو اجداد، پیدائش، تعلیم و تربیت، ملازمت، ترک ملازمت، مختلف اسفار، دہلی پر حملوں کی روداد، میر کے آخری ایام کے حالات اور تصنیفات و تالیف (جس میں غزل، قصیدہ، مثنوی، تذکرہ، آپ بیتی، دواوین اردو و فارسی) وغیرہ پر اس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ میر سے متعلق تمام اہم گوشوں، واقعات و حالات تک بآسانی رسائی ہو جاتی ہے اور اس وقت کے سماجی و سیاسی پس منظر سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ مصنف نے فرداً فرداً میر کی تقریباً تمام تخلیقات کا ایک دو پیراگراف میں جائزہ لینے کی بھی سعی کی ہے۔

کتاب کا دوسرا باب 'میر کا فن' کے عنوان سے 16 صفحے پر مشتمل ہے جس میں موصوف نے میر کے فن پر بحث کرتے ہوئے ان کی غزل گوئی کے مختلف پہلوؤں اور جہات کو اجاگر کیا ہے ساتھ ہی میر کے اہم اور مشہور اشعار کی تشریح کرتے ہوئے اپنی تنقیدی آرا سے بھی قارئین کو روشناس کرایا ہے۔ مثلاً میر کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں: ''ہمارے شعرائے متقدمین میں اکثریت ایسے شاعروں کی ہے جنھوں نے شاعری کو ایک فن یا صناعی سمجھ کر برتا ہے۔ میر تقی میر نے شعر کو فن تو سمجھا ہے لیکن اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے جس کے پردے میں اپنی آپ بیتی اور محسوسات بیان کرتے رہے:

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

میر کی توجہ شعر کی ہیئت اور اس کی معنویت دونوں پر رہتی ہے جس کا اظہار میر کے مختلف شعر سے بھی ہوتا ہے۔ نثار احمد فاروقی نے میر کے فن پر اشعار کی حوالے اور ان کی تشریح و تحلیل کے توسط سے میر کی فنکارانہ عظمت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے اسلوب فن کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے انھیں 'لفظوں کا مصور' بھی تسلیم کیا ہے۔ میر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے مصنف نے میر کی شعری کائنات، اسلوب بیان، الفاظ و تراکیب، زبان و بیان اور شخصی کیفیتوں کو اس خوبی سے برتا ہے کہ وہ پورے ماحول کا آئینہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے جس سے میر کی شخصیت اپنی آب و تاب کے ساتھ جلوہ نما ہوتی ہے۔

خدائے سخن میر تقی کا شمار بنیادی طور پر غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی شہرت کا ایوان بلند غزل کے کیف آور اشعار پر قائم ہے جنھیں تیر و نشتر سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ میر کے فن نے اردو شاعری میں ان بلندیوں تک رسائی حاصل کر لی ہے جہاں تک کم ہی شاعروں کی پہنچ ممکن ہے۔ یہی سبب ہے کہ خود مرزا غالب جیسے عظیم شاعر نے بھی میر کی استادانہ عظمت اور فنکارانہ صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں 'ریختہ کا استاد' تسلیم کیا ہے۔ وہیں خاقانی ہند محمد ابراہیم ذوق نے میر کے کمال فن کو اس طرح سراہا ہے:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اسی طرح میر کی عظمت کے معترف نواب مصطفی خان شیفتہ نے میر کے حوالے سے جو بھی کہا وہ لفظ و معنی دونوں اعتبار سے قابل تسلیم ہے کہ: ''میر جیسے عظیم فنکار روز روز پیدا نہیں ہوتے''۔ کتاب کا تیسرا اور آخری باب 'انتخاب کلام میر' کے عنوان سے تقریباً 102 صفحات پر مشتمل میر کے دیوان اوّل کی غزلیات کے ایک نمائندہ انتخاب پر مبنی ہے جس میں میر کی غزلیں اپنے مختلف موضوعات و اسالیب کے ساتھ اپنی اہمیت و انفرادیت کا احساس دلاتی ہیں۔ اس حصے میں ایسی غزلوں کو منتخب کیا ہے جو عام فہم اور سلاست سے پر ہیں جس میں روانی، سادگی اور لطافت پائی جاتی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم باد و باراں ہے
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا، اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

آخر میں کتابیات کے عنوان سے ان کتابوں کی فہرست شامل ہے جو کتاب کی تیاری میں مدد معاون ثابت ہوئی ہیں اور جس کا مقصد طالب علم کے لیے مزید تفصیلی مطالعے کا باعث ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب میر اور ان کی شخصیت و فن کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

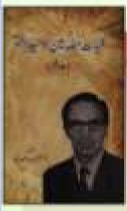

کلیات مضامین وحید اختر (جلد: چہارم، پنجم اور ششم)

مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
قیمت: 160، 115 اور 115 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر عادل حیات، 37/89 غفار منزل، نئی دہلی

ڈاکٹر سرور الہدیٰ اردو کی ادبی دنیا میں ممتاز مرتب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی ترتیب دی ہوئی کئی کتابیں قارئین سے داد و تحسین حاصل کر رہی ہیں۔ زیر نظر 'کلیات مضامینِ وحید اختر' بھی انھیں میں سے ایک ہے۔ یہ کلیات چھ جلدوں پر مشتمل ہے، جس کی آخری تین جلدیں زیرِ تبصرہ ہیں۔ وحید اختر مشہور شاعر و نقاد تھے، انھوں نے شاعری کی زیادہ تر صنفوں میں تبع آزمائی کی اور تواتر کے ساتھ مضامین بھی لکھے۔ جس کو جلا دینے میں انجمن ترقی اردو ہند کا پندرہ روزہ ادبی اخبار 'ہماری زبان' کا اہم حصہ ہے۔ جس میں موصوف 'ہمارا صفحہ' کے عنوان سے مختلف موضوعات پر مضامین تحریر کرتے تھے۔ پروفیسر وحید اختر کے زمانۂ حیات میں ان کے مضامین پر مشتمل بس ایک ہی مجموعہ 'فلسفہ اور ادبی تنقید' شائع ہو سکا۔ ان کے بقیہ مضامین مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے ہوئے تھے۔ جن کو حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر سرور الہدیٰ کو جانکاہی و جاں سوزی کے مراحل

سے گزرنا پڑا۔ انھیں مضامین کو مرتب نے ترتیب دے کر 'کلیاتِ مضامین وحید اختر' کی چھ جلدیں بنائی ہیں اور 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

'کلیاتِ مضامین وحید اختر' کی چوتھی جلد میں کل بیس مضامین شاملِ اشاعت ہیں۔ جن میں سے پہلے چار مضامین جدیدیت کی مختلف جہات پر روشنی ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پہلا مضمون نہایت معلوماتی ہے۔ اس مضمون میں وحید اختر جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع تو قرار دیتے ہیں لیکن دوسرے ناقدین کے برعکس اسے تہذیبی مسائل سے وابستہ کرکے بھی دیکھتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ جدیدیت موضوع و مواد اور پیش کش کی سطح پر صرف اور صرف حلقۂ اربابِ ذوق کی توسیع ہے۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک کا سوال ہے تو موضوع و مواد اور پیش کش کے انداز یعنی ہر دو سطح پر ترقی پسندی اور جدیدیت میں بُعد کی صورت نمایاں ہے۔ دراصل وقت اور حالات کے تحت پرانی تحریکات و رجحانات انجماد کا شکار ہو جاتی ہیں، ان کی جگہ پر نئے تہذیبی مسائل و میلانات تازہ کار رویوں کو جنم دیتے ہیں۔ انھیں رویوں پر چند ہوشیار قسم کے لوگ ازم کا لیبل لگا کر اپنی اپنی دکان چمکانے میں لگ جاتے ہیں۔ اس جلد میں تنقید کے مسائل پر کئی مضامین میں گفتگو کی گئی ہے۔ جن پر مرتب نے تبصرہ کرتے ہوئے امداد امام اثر کی کتاب 'کاشف الحقائق' اور 'مراۃ الحکما' کے حوالے سے تفصیلی باتیں کی ہیں۔ ان کے مطابق وحید اختر نے تنقیدی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے دوسرے بہت سے ناقدین اور ان کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے، وہیں امداد امام اثر اور ان کی کتابوں کو فراموش کر گئے ہیں۔ وہ اپنی رو میں یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ اردو تنقید کی تاریخ میں کاشف الحقائق کو کسی نے معروضی اور نئی نظر سے دیکھا ہے تو وہ ناصر عباس نیر ہیں۔ میرے خیال میں کاشف الحقائق سے ناقدین کی اکثریت نے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ اس پر مباحث بھی قائم کیے ہیں لیکن ان کی دوسری کتاب 'مراۃ الحکما' کی وہ اہمیت نہیں جو 'کاشف الحقائق' کی ہے۔ چنانچہ مرتب کا اصرار غیر ضروری ہے۔ وہ کسی بھی صورت میں اپنے مفروضے کو دوسروں پر تھوپنے کا جواز نہیں رکھتے۔ اس جلد کے آخر میں ایسے مضامین شامل بھی ہیں جن میں وحید اختر نے ہم عصر ادب، تصوف، وجودیت اور دوسرے اہم مسائل پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

'کلیاتِ مضامین وحید اختر' کی پانچویں جلد میں شخصی مضامین اور اہم کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ جن ادبی شخصیتوں پر وحید اختر نے قلم اٹھایا ہے، ان میں احتشام حسین، سلیمان اریب، سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، جیلانی کامران، تحقیق فاطمہ شعریٰ، وقار لطیف، کیفی اعظمی اور انور معظم وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو ادبی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔

وحید اختر نے غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کورے کاغذ پر اپنے قلم سے ایسا ہیولا بنایا ہے کہ ممدوحین کی تصویریں قارئین کے ذہن پر ہوبہو نقش ہو جاتی ہیں۔ اس جلد کے دوسرے حصے میں مشہور و معروف شعرا و ادبا کی کتابوں پر کئی چھوٹے بڑے تبصرے شامل ہیں۔ یہ تبصرے ایسے نہیں کہ طائرانہ نظر کے حوالے کر دیے جائیں بلکہ یہ سب ٹھہر کر اور سمجھ کر پڑھنے کا تقاضا کرتے ہیں۔

'کلیاتِ مضامین وحید اختر' کی چھٹی جلد میں طویل و مختصر اکیس مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کی اہمیت صرف اس لیے قائم نہیں ہوتی کہ یہ سب وحید اختر کے قلم سے نکلے ہیں بلکہ ان کی انفرادیت میں موضوع و مواد کے ساتھ وحید اختر کی تحریر کا منفرد انداز بھی ہے۔ ان مضامین کی نوعیت کے بارے میں مرتب نے اپنے مقدمے میں کہیں کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ یہ بلاشبہ مختلف نوعیت کے مضامین ہیں، جن میں میر انیس کی وراثت، اقبال اور انسان، غزل، اودھ اور مرثیے کی تہذیب، اردو نظم آزادی کے بعد: چند وضاحتیں اور خواجہ میر درد: تصوف اور شاعری اہم ہیں۔ ان کے علاوہ وحید اختر نے مغربی تنقید کے چند ناقدین میکس ملر، سیمون دابوا اور برٹرینڈ رسل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے ہر جلد کے آغاز میں 'مقدمہ' کے عنوان کے تحت مضامینِ وحید اختر پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ میرے خیال سے مرتب کا یہ عمل کارزیاں اور قارئین کو ان کے اصل منصب سے بھٹکانے اور غلط نتائج تک رسائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کا احساس خود مرتب کو بھی ہے۔ جس کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ

''دیباچے کی موجودگی کتاب کی آزادانہ قرأت میں حائل ہو جاتی ہے''

(کلیاتِ مضامین وحید اختر، ص: xxii، جلد: پنجم)

علاوہ ازیں ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے اپنے مقدمے میں جتنے بھی اقتباسات دیے ہیں، ان پر کوئی ایسا اشارہ موجود نہیں کہ یہ اقتباسات کلیاتِ وحید اختر کی انھیں جلدوں سے لیے گئے ہیں یا ان کا ماخذ کچھ اور ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر سرور الہدیٰ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے وحید اختر کے مضامین کو جاں فشانی کے ساتھ یکجا کیا اور انھیں چھ جلدوں میں ترتیب دے کر ادب کے قارئین کے حوالے کر دیا۔ امید کی جانی چاہیے کہ قارئین وحید اختر کے مضامین کی روشنی میں ادب کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کریں گے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ھیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ھیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق وتنقید

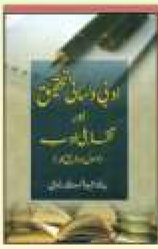

ادبی ولسانی تحقیق اور تقابلی ادب

مصنف: عبدالستار دلوی

صفحات: 176، قیمت: 200/روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

مبصر: شاہ نواز فیاض

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو زبان کے تعلق سے جب بھی بات ہوتی ہے تو محمد حسین آزاد کی 'مقدمہ آب حیات' اور انشاء اللہ خاں انشاء کی 'دریائے لطافت' کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ اس سے ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کی لسانیات پر کام کرنے کی مدت بہت طویل نہیں ہے اور نہ ہی اردو میں لسانیات کے حوالے سے کام ہوا ہے۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ابھی تک اردو کے کتنے حروف ہیں، یہی واضح نہیں ہے۔ ہم چاہے کتنی ہی بڑی بات کیوں نہ کرلیں، لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس پر ہم کسی مضبوط عمارت کی توقع نہیں کرسکتے۔ اس کے بعد اردو املا کا نمبر آتا ہے۔ یہاں بھی بہت مایوسی ہوتی ہے۔ اردو املا کے تعلق سے عبدالستار صدیقی، رشید حسن خاں، ابومحمد سحر اور گوپی چند نارنگ نے کام ضرور کیا ہے، لیکن ان کتابوں کے مطالعے سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں بھی اختلاف ہے۔ اس سے عام قاری الجھن میں پڑسکتا ہے۔ خاص طور سے وہ لوگ جو اردو زبان سیکھنا چاہتے ہیں۔ اردو لسانیات پر کام کرنے والوں کی تعداد بھی گنی جاسکتی ہے۔ انشا اور آزاد کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے، اس کے علاوہ پنڈت کیفی، وحیدالدین سلیم، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر زور، عبدالقادر سروری، احتشام حسین، مسعود حسین خاں، گیان چند جین، گوپی چند نارنگ، مرزا خلیل بیگ کے علاوہ عبدالستار دلوی نے لسانیات کے تعلق سے کچھ کیا ہے۔

زیرنظر کتاب 'ادبی ولسانی تحقیق اور تقابلی ادب (اصول اور طریق کار)' کو پروفیسر عبدالستار دلوی نے کل چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ 'ادبی اور لسانی تحقیق۔ اصول اور طریقۂ کار' کے عنوان سے ہے۔ دوسرا حصہ 'اردو میں لسانی تحقیق کی اہمیت' کے عنوان سے ہے۔ تیسرا حصہ 'تقابلی ادب کیا ہے؟' کے موضوع پر ہے۔ چوتھا حصہ 'ضمیمہ' کے عنوان سے ہے۔ آخر الذکر حصے میں فاضل مصنف نے ڈاکٹر صلاح الدین المنجد کے عربی مضمون کا اردو ترجمہ، جسے ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی نے کیا ہے، کتاب میں شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ظہیر قاضی کا دو صفحے کا مضمون 'ابتدائیہ' کے عنوان سے ہے۔ مصنف کتاب نے مقدمہ 'اردو تحقیق کے عصری تقاضے' کے عنوان سے لکھا ہے۔ کتاب کا انتساب ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور ڈاکٹر عالی جعفری کے نام کیا گیا ہے۔

زیرتبصرہ کتاب کے پہلے حصے میں مصنف کتاب نے ادبی اور لسانی تحقیق کے اصول اور طریق کار پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ لسانیاتی ادب (اسلوبیاتی تنقید) پر لوگوں نے بہت کم گفتگو کی ہے۔ اسلوبیاتی تنقید میں نحویات، لفظیات، صوتیات اور معنویات کے تعلق سے فن پارے کو جانچا پرکھا جاتا ہے۔ متن کو جانچنے کا یہ طریقہ بہت پرانا نہیں ہے۔ البتہ اس تعلق سے تحقیق کی ضرورت ہے۔ البتہ اس مضمون میں مصنف نے جس تعلق سے گفتگو کی ہے، یعنی تحقیق اور اس کے اصول کے تعلق سے، بہت سے لوگوں نے اس موضوع پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ گیان چند جین کی کتاب 'تحقیق کا فن' اس کی واضح مثال ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی تحقیق اور اس کے طریق کار پر روشنی ڈالی ہے۔ فاضل مصنف نے مذکورہ بالا مضمون میں انھیں حوالوں سے گفتگو کی ہے۔

زیرنظر کتاب کے دوسرے حصے میں فاضل مصنف نے اردو میں لسانی تحقیق کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن یہ موضوع جتنا اہم تھا، مصنف نے اختصار سے کام لیا۔ اگر اس حصے کو تفصیل سے لکھا جاتا تو ممکن تھا کہ اردو میں لسانی تحقیق کی اہمیت پر قارئین خاطر خواہ مستفید ہوتے، کیونکہ یہ موضوع اختصار نہیں تفصیل چاہتا ہے، پھر بھی بہت سی باتوں کی طرف اشارہ کردیا گیا ہے، لیکن اس تعلق سے دوسرے لوگوں نے بھی لکھا ہے۔ جہاں کچھ تفصیل دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ کتاب کا تیسرا حصہ تقابلی ادب کیا ہے؟ کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے تقابلی ادب کا مفہوم اور اس کی روایت پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون کئی اعتبار سے اہم ہے۔ کیونکہ تقابلی ادب دراصل دو ذہنوں کا موازنہ ہے۔ اس میں ناقدین فن کو بہت احتیاط سے کام کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ تھوڑا سا بھی جھکاؤ ہوا تو ناقد جانب دار ہوجائے گا۔ مصنف نے اس مضمون میں بہت سی اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تقابلی ادب پر کام کرنے والوں کے لیے یہ مضمون کافی اہمیت کا حامل ہے۔

مصنف کتاب عبدالستار دلوی اردو زبان وادب کے ایک اسکالر کے طور جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے لسانیات کے علاوہ ترجمہ کے تعلق سے جو کام کیا ہے، وہ اقبال شناسی میں ایک اہم کارنامہ ہے۔ درجن بھر سے زائد کتابوں کے مصنف ومرتب عبدالستار دلوی نے لسانیات کے حوالے سے کچھ اہم کیے ہیں۔ لیکن لسانیات کے باب میں اب بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ زیرتبصرہ کتاب کے مطالعے سے ایک چیز کا احساس ہوا کہ ذمے دار انسان جب کوئی کام کرتا ہے تو پوری ایمانداری سے کرتا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کتاب میں پروف ریڈنگ کی غلطی نا کے برابر ہے۔ مضامین کے اعتبار سے یہ کتاب کافی اہم ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔ لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب یقیناً معاون ہے۔ قوی امید ہے قارئین اس کتاب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

آمد و رفت

مصنف: شمیم قاسمی

صفحات: 264، قیمت: 350 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: پرویز اشرفی، D-321، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

شمیم قاسمی جدید شعروادب کی دنیا میں اپنی ایک نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔ یوں تو شمیم قاسمی نے ابتدائی دنوں میں کہانیاں لکھ کر اپنا ادبی کریئر بنایا تھا۔ ماضی میں بچوں کے لیے بھی وہ سبق آموز کہانیاں اور شگفتہ نظمیں قلم بند کرتے رہے ہیں۔ گذشتہ دو دہے سے ان کی غزلیں مختلف رسائل وجرائد میں تواتر سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ جدید ادب کے معتبر ناقدین نے ان کے طرزِ سخن کو پسند کیا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے ان کی شاعری کے حوالے سے یہ واضح کردیا ہے کہ ''شمیم قاسمی نے اپنے شعری ڈکشن سے لوگوں کو چونکایا بھی ہے اور اپنی شناخت کا باعث بھی بنے۔ یہ بڑی بات ہے کہ کوئی اپنے کلام سے اپنی پہچان منوالے۔ اس مرحلے میں شمیم قاسمی خاصے کامیاب ہیں۔'' (مباحثہ 10)

زیرتبصرہ کتاب 'آمد ورفت' شمیم قاسمی کی پہلی تنقیدی کاوش ہے جسے انھوں نے 'عصر آشنا مضامین' کہا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ بحیثیت شاعر تو انھوں نے اپنی ایک شناخت منوالی ہے، اب تنقید کے میدان میں انھوں نے اس کتاب کے ساتھ اپنی پہچان کا جو پڑاؤ ڈالا ہے اس کی آزادانہ شناخت کیا ہے؟

پیش نظر کل چھبیس مضامین ہیں جن میں مابعد جدیدیت اور وہاب اشرفی، عبدالصمد عکس در عکس، حفیظ بنارسی کا شعری مسلک، حسین الحق کا فرات، سید عاشور کاظمی فن اور فنکار، شہاب ظفر اعظمی اور فکشن کی تنقید، کیوں سمندر خلاف رہتا ہے؟ آزادانہ شناخت کی شہرت کا ڈائنا سور وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے بارہا اس کا احساس ہوا کہ شمیم قاسمی نے بڑی بے باکی، اظہار کی توانائی اور اپنے مخصوص لب و لہجے میں ہم عصر ادب پر عمدہ تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ شمیم قاسمی نے اپنی نثری تحریروں میں بھی جدت پسندی سے کام لیا ہے اور انھیں پڑھتے وقت لسانی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں فن پارے کو سمجھنے کا اپنا ایک مخصوص پیمانہ ہے۔ شمیم قاسمی نے تنقیدی مضامین لکھتے وقت فن پارے کو پیش نظر رکھا ہے۔ میرے خیال سے وہ ادب کی بھاری بھرکم شخصیت سے بہ آسانی متاثر نہیں ہوتے اور کسی فن پارے کے حسن و قبح پر مناسب الفاظ کے ساتھ اپنا تنقیدی نصب العین حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آمد و رفت میں شامل تقریباً تمام مضامین کو پڑھ کر رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ موصوف کا تنقیدی سفر جاگتی آنکھوں سے عبارت ہے اور جس کا ہم سفر بہرحال ایک متحرک دماغ ہے۔ انھوں نے تخلیقی زبان پائی ہے اور اپنے مخصوص انداز میں ادب میں تھوپی ہوئی کسی بھی ادبی لابنگ اور نظریوں کی بالادستی سے خود کو الگ رکھا ہے۔

موصوف کی تخلیقی نثر اور ان کے بے باکانہ تنقیدی اظہارات کے نمونے ملاحظہ فرمائیے:

''تقریباً تیس بتیس برسوں میں جو شعر و ادب ہم نے خلق کیا ان کی بیشتر جڑیں (لاشعوری طور پر ہی سہی) اور صورتیں کیا مابعد جدید فکر کی تفہیم و تشریح میں Fruitful ثابت ہو رہی ہیں؟ — اور یہ بھی کہ مابعد جدید فکر کی زرخیز زمین سے تخلیقی رسد حاصل کرتی رہی ہیں۔ کیا ہمارے حالیہ تخلیقی سفر میں، جو توانائی اور شادمانی کا کرنٹ اور حیات نو کی چمک دمک ہے وہ مابعد جدید فکر کی کشادہ نظری کی دین تو نہیں۔'' (مابعد جدیدیت اور وہاب اشرفی، ص 20)

'' 1980 کے بعد کی شاعری وادی پر کافی شور شرابے ہوئے۔ کچھ شعرا نے تو الٹے سیدھے بیان دے کر اور اپنی عملی حرکتوں سے بھی سنسنی پھیلانے کی ناکام کوششیں کیں۔ نئی نسل کے تازہ اذہان نے خود کو اوروں سے بالکل الگ تھلگ ثابت کرنے کے لیے نہ صرف اودھم مچائی بلکہ اپنے پیش رو ادبی و شعری سرمائے پر ایک بڑا سا سوالیہ نشان بھی لگایا۔ ان کا زیادہ تر وقت خلعت و دستار کو روندنے اور اپنے 'مختلف ہونے' اور 'نیا کچھ' کر دکھانے کا نگاڑہ پیٹتے ہوئے غزل کی نئی بازیافت کے اعلانیہ پر ختم ہوا۔ بطور خاص انھوں نے (تازہ کار نسل) غزل گو شعرا کی بھیڑ میں خود کو ہر حالت میں اپنے ماقبل عہد کے شعرا اور ان کے شعری سفر سے انحراف کرنے اور خود کو مختلف ثابت کرنے کے لیے سر جوڑ لیا۔ اُن کے اس طرح مختلف ہونے کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ وہ تو چٹکی بھر لکھ کر قبل از وقت اَل بل ہوئے جاتے ہیں۔'' (آزادانہ شناخت کی شہرت کا ڈائنا سور، ص 97)

چھبیس مضامین میں اردو کے چند اہم افسانوی مجموعے کے ساتھ ساتھ اردو فکشن کے معتبر ناول نگار عبدالصمد اور حسین الحق کے فکشن سفر پر بھی ایک دل نواز، لیکن ذرا ترچھی نظر ڈالی ہے۔ شہاب ظفر اعظمی کی اہم تحقیقی/تنقیدی کتاب 'اردو ناول کے اسالیب' پر بھی تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے اس کا اعتراف کیا ہے کہ موضوعی اور فکری سطح پر اتنا جامع اور افادیت سے بھرپور پروجیکٹ میری نظر سے کم ہی گزرا ہے۔ شمیم قاسمی کو اس کا بھی احساس ہے کہ ''میدان تحقیق و تنقید میں دوڑ بھاگ بڑی صبر آزما ہوتی ہے۔ یہاں جس ذہنی یکسوئی اور استقلال کی ضرورت ہوتی ہے اُس پر اکثر احباب کھرے نہیں اُترتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سندی تحقیق کی طلب نے بے شمار ایک جیسے ماڈل کو بازار ادب میں اُتارا ہے۔''

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شمیم قاسمی کا تنقیدی نقطۂ نظر کسی مانگے کا اجالا نہیں۔ ان کی تحریروں میں ان کی شاعری ہی کی طرح ایک مخصوص نثری ڈکشن بھی موجود ہے، جن کے اقتباسات پیش کروں تو تبصرہ طویل ہو جائے گا۔ بس اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ شمیم قاسمی نے زیر تبصرہ کتاب میں بڑی کشادہ نظری اور بے باکی سے کام لیتے ہوئے اپنا ایک مخصوص تنقیدی زاویۂ نظر پیش کیا ہے۔ ان کے جرأت اظہار کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

اخیر میں جدید اردو فکشن کے ممتاز اور بزرگ افسانہ نگار جناب شفیع جاوید کی مندرجہ ذیل رائے سے اتفاق کیا جاسکتا ہے:

''مصنف کا انداز تحریر بہ انداز دیگر ہے اور یہی نکتہ اس مجموعہ کی یکتائی ہے۔ اس بات کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ جن تخلیق کاروں، ناقدین، فن کاروں اور اصحاب قلم پر مضامین قلم بند کیے گئے ہیں، ان میں ان کی تخلیق کاری کے علاوہ ان کی شخصیات کا عکس بھی موجود ہے، یعنی اجمالی طور پر یہ مضامین خاکوں کا بھی لطف دیتے ہیں۔ جن لوگوں پر مضامین شامل کیے گئے ہیں ان کی نگارشات کا تجزیہ بھی بے لاگ اور خوب ہے۔''

شمیم نکہت کی ادبی خدمات

مصنف: اصفیہ شمیم

صفحات: 157، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدر آباد

مبصر: حقانی القاسمی، ڈی 64، فلیٹ نمبر 10، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو کے زیادہ تر دانشور اور ادیب، ادب میں سماجی اور سیاسی سروکار کے حوالے سے عالمانہ اور دانشورانہ گفتگو تو کرتے ہیں مگر سیاسی سماجی سروکار سے ان کی عملی زندگی کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ وہ پریم چند یا ہم عصر فکشن میں پیش کیے گئے سماجی اور سیاسی مسائل پر بات تو کرتے ہیں مگر ان مسائل کے حل اور تدارک کی کوئی صورت عملی طور پر نہیں نکال پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ سماج سے کٹا ہوا ہے۔ جبکہ ادب کا بنیادی وظیفہ سماجی ارتباط و تعامل ہے۔ اس خصوص میں دیکھا جائے تو شمیم نکہت کی یہ خوبی بہت متاثر کرتی ہے کہ انھوں نے صرف ادبی مسائل اور متعلقات ہی پر اپنے کو مرکوز نہیں رکھا بلکہ عملی طور پر وہ سماج سے جڑی رہیں اور سماجی فلاح و بہبود کا کام کرتی رہیں۔ انھوں نے شعاع فاطمہ ایجوکیشنل اینڈ چیری ٹیبل ٹرسٹ کے نام سے ایک تعلیمی اور فلاحی ٹرسٹ قائم کیا جس میں معاشی طور پر کمزور بچوں، یتیموں، لڑکیوں، بیواؤں کی امداد کے علاوہ غریب بچوں کی تعلیم کا نظم کیا۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس کی بنیاد پر شمیم نکہت صرف ادب ہی نہیں بلکہ سماج کے ذہنوں میں بھی ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہیں گی۔

شمیم نکہت ایک معروف فکشن نگار، محقق اور ناقد ہیں اور ادبی حلقوں میں ان کی شناخت بھی مستحکم ہے۔ وہ تنقیدی حوالوں میں بھی شامل ہیں۔ خاص طور پر بحیثیت افسانہ نگار بڑے نقادوں نے ان کے افسانوں کی نہ صرف ستائش کی ہے بلکہ ان کے اسلوب اور موضوع کی داد بھی دی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں جن موضوعات کو برتا ہے وہ موضوعات یقینی طور پر اہم ہیں اور اس پر ان کا خوبصورت سادہ اور سحر انگیز اسلوب پروفیسر قمر رئیس جیسے فکشن کے پارکھ، محمد علی صدیقی جیسے نقاد، آغا سہیل جیسی معتبر شخصیت نے ان کے افسانوں کے بارے میں نہایت گراں قدر رائے دی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ شمیم نکہت کی کہانیاں اپنی سادگی اور پرکاری کے اعتبار سے دیگر افسانہ نگاروں سے بہت مختلف ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں سماج کی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ انسانی کرب کو انھوں نے بہت شدت سے محسوس کیا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے 'دو آدھے' کو ادبی حلقوں میں اعتبار کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس کے علاوہ بحیثیت محقق اور ناقد ان کی کتاب 'پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار' بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اپنے موضوع

پرمنفرد کتاب ہے کیونکہ پریم چند کے نسوانی کرداروں کے حوالے سے کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ خواجہ احمد فاروقی اور احتشام حسین نے بھی اس کتاب کی تعریف کی ہے۔ پریم چند شناسی میں اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ نسائیت کے تعلق سے بھی اس میں بہت سے اہم نکات ہیں۔ خاص طور پر ہندوستانی سماج میں عورت کی صورتِ حال، عورت کی پستی کے سیاسی و سماجی اسباب، آزادی نسواں کی جدو جہد، ہندوستان کی تحریک آزادی میں عورتوں کا حصہ یہ وہ متعلقات ہیں جن پر شیم نکہت نے بہت ہی گہرائی کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں بھی ان نسائی موضوعات اور مسائل کی جستجو کی ہے۔ خاص طور پر مشترکہ خاندان اور بیوہ کے مسائل، طوائف اور گری ہوئی عورتیں، عورتوں کے عام مسائل— شمیم نکہت نے بحیثیت ناقد بھی اپنی ایک الگ پہچان قائم کی ہے۔ 'تاثرات' ان کے ادبی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں بڑے قیمتی اور وقیع مضامین شامل ہیں۔ خاص طور پر اردو افسانہ عصر حاضر میں اور قدروں کا بحران، جدید اردو افسانہ موضوع وتکنیک، سہیل عظیم آبادی کے چند نسوانی کردار، رانو بیدی کا ایک امر کردار، زیور کا ڈبہ ایک تجزیاتی مطالعہ، پریم چند اور تحریک نسواں، اردو شاعری اور خواتین۔ ان مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمیم نکہت کا مطالعاتی دائرہ بہت وسیع تھا اور ادب کے مختلف موضوعات و مسائل پر ان کی بہت گہری نظر تھی۔ شمیم نکہت نے بہت عمدہ خاکے بھی لکھے، خاص طور پر رضیہ سجاد ظہیر اور ثروت آپا کے عنوان سے ان کے خاکے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا ایک بڑا کام یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردو سیکھیے، آئینۂ اردو (تین حصے) کے عنوان سے ایسی کتابیں لکھی ہیں جن سے بچوں کو اردو سیکھنے اور سمجھنے میں آسانی ہوسکتی ہے۔ انھوں نے اپنے تدریسی تجربے کا نچوڑ ان کتابوں میں پیش کردیا ہے۔ کتاب باتصویر ہے اس لیے بچوں کے لیے بہت مفید ہے۔ ان کی مجموعی خدمات پر نظر ڈالی جائے تو احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے اور یقیناً وہ اس کی مستحق ہیں کہ ان کی شخصیت اور فن کو تحقیق کا موضوع بنایا جائے چنانچہ اصفیہ شمیم نے شمیم نکہت کی ادبی خدمات کے حوالے سے مقالہ لکھا ہے جس میں ان کی شخصیت اور فن کے تمام اطراف اور ابعاد کے احاطے کی بہت عمدہ کوشش کی ہے۔ چار ابواب پر مشتمل اس کتاب کے پہلے باب میں ان کی حیات و شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے، دوسرے باب میں افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی شناخت کی کوشش کی گئی ہے، تیسرے باب میں بحیثیت مضمون نگار اور چوتھے باب میں بحیثیت محقق ان کا جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں ان کے چند مضامین کا انتخاب دیا گیا ہے جن میں اردو افسانہ اور عصر حاضر میں قدروں کا بحران، جدید اردو افسانہ، موضوع اور تکنیک، صدیقی صاحب، رضیہ سجاد ظہیر، کتابیں جو بند کردی گئیں، ثروت آپا شامل ہیں۔ اصفیہ شمیم نے شمیم نکہت کے شخصی اور فنی کوائف اور احوال کا بہت ہی خوش سلیقگی سے جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق ان کے آبا واجداد کا تعلق پنجاب سے تھا اور ان کے والد نیپال کی ترائی کے جنگلات میں ٹھیکیدار تھے۔ ان کی تعلیم کرامت حسین گرلز کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی میں ہوئی۔ رضیہ سجاد ظہیر، پروفیسر احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی جیسی شخصیتیں ان کے اساتذہ میں تھیں۔ وہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے وابستہ رہیں۔ پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر بھی فائز رہیں۔ ان کی شادی اردو کے مشہور دانشور پروفیسر شارب ردولوی سے ہوئی۔ وہ بہت سے تعلیمی اداروں سے بحیثیت ممبر وابستہ تھیں۔ انھیں بہت سے انعامات و اعزازات بھی ملے۔ وہ ترقی پسند نظریات کی حامل تھیں۔ بہت ہی خوش اخلاق، خوش گفتار، مہمان نواز اور ملنسار تھیں۔ بحیثیت ادیب اور بحیثیت شخصیت ان میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔ اصفیہ شمیم نے ان کی تصنیفات اور مضامین کا بھی عمدہ تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور ان کی زبان اور اسلوب پر بھی گفتگو کی ہے۔ بحیثیت مجموعی شمیم نکہت کی شخصیت اور فن کا مکمل خاکہ ان کی کتاب سے سامنے آتا ہے۔ اصفیہ شمیم مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک بڑی اہم شخصیت کا انتخاب اپنے موضوع کے لیے کیا اور موضوع کا حق ادا کردیا۔

اردو کی ظریفانہ شاعری کا سفر

مصنف: الفت حسین

صفحات: 336، قیمت: 360 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: شاہنواز حیدر شمسی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو میں ظریفانہ شاعری کی تاریخ تین صدیوں پر مشتمل ہے۔ میر جعفر زٹلی (1655-1713) کو اردو کا پہلا مزاحیہ شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ ابتدائی عہد میں شاکر ناجی، میر تقی میر، مرزا سودا، انشا، مصحفی، معروف ضاحک، اور میر غلام حسن کے یہاں مزاحیہ شاعری نے قیام کیا۔ ان کے بعد نظیر اکبرآبادی، عبدالغفور شہباز، اکبر الہ آبادی، شبلی نعمانی، ظفر علی خان، شاد عارفی، فرقت کاکوروی، دلاور فگار اور رضا نقوی واہی وغیرہ نے اس صنف کو فروغ دیا۔

ظرافت نگاری کی صنفی و تاریخی حیثیت و حقیقت اور اس کے تعلق سے صحافتی خدمات کی نوعیت کے جائزے پر کتاب 'اردو کی ظریفانہ شاعری کا سفر' کل گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ کتابیات اور اشاریہ سے قبل کے آخری 34 صفحات میں انتخاب کلام شامل ہے۔

پہلے باب میں طنز و ظرافت کی فنی حیثیت اور اہمیت و افادیت کے ساتھ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں کے حوالے سے اس کی عالمی صورت حال پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ باب دوم میں اردو کے اوّلین شعرائے ظریف میں میر جعفر زٹلی، سودا، میر، انشا، مصحفی، نظیر اکبرآبادی، سید شاہ ہاشم، ضاحک، کنترین، شاکر ناجی، غالب، اکبر الہ آبادی، اقبال، جوش اور حالی کے تعلق سے ابتدائی عہد کی ظریفانہ شاعری کی روایت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہاں مزاحیہ شاعری کے ابتدائی نقوش و مزاج و میلان کے ساتھ مذکورہ شعراء کے مزاحیہ رنگ و آہنگ سے بھی ہماری واقفیت ہوتی ہے۔ باب سوم اور چہارم اردو کے صحافتی ادب میں ظریفانہ شاعری کی بازیافت پر موقوف ہے۔ 70 صفحات پر مشتمل پانچواں، چھٹا اور ساتواں باب بالترتیب میر جعفر زٹلی، اکبر الہ آبادی اور رضا نقوی واہی کے خصوصی مطالعے پر مبنی ہے۔ یہ مزاحیہ شاعری میں اپنے عہد کی سب سے قدآور اور روشن آواز ہے۔ ان کی خدمات نے اردو ظرافت نگاری کو معیار و وزن عطا کیا۔

آٹھویں باب میں بیسویں صدی کے ربع اول سے مابعد جدیدیت تک کی ظرافت نگاری کا عمومی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تحریف نگاری (پیروڈی) اس عہد کی اہم دین ہے۔ یہاں اس کے ذکر کو اہمیت دی گئی ہے اور اس پر گفتگو کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ نواں باب بیسویں صدی کے اہم ظریف شعرا اکبر الہ آبادی، ظریف لکھنوی، شاد عارفی، مجید لاہوری، فرقت کاکوروی، دلاور فگار اور رضا نقوی واہی وغیرہ کے ظریفانہ امتیازات کی احاطہ بندی پر مبنی ہے۔ ان سب کے حوالے سے عہد جدید کا پورا مزاحیہ شعری منظر نامہ نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ آخری دو باب میں ظریفانہ شاعری کے جدید مسائل و میلانات اور ساغر خیامی، ہاشم عظیم آبادی، ابرار ساغر، اسرار جامعی و ظفر کمالی کے حدود میں بیسویں صدی کے ربع آخر اور انیسویں صدی کے ابتدائی عہد کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری اور سماجی، سیاسی، تہذیبی و اقتصادی سروکار کو پیش کیا گیا ہے۔

اردو طنز وظرافت کے پورے منظر نامے اور اس کی فکری وفنی صورت کے عہد بہ عہد ارتقا سے واقفیت کے بعد اس کی عملی منظر کشی، محسوساتی صورت گری اور متن سے براہ راست استفادے کے لیے انتخاب کلام کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ تکمیل ابواب کے بعد انتخاب کلام کے ذیل میں اردو کے اہم اور اپنے عہد کے ممتاز ظرافت نگار شعرا جعفر زٹلی، نظیر اکبر آبادی، ظریف لکھنوی، عبد الغفور، شہباز فرقت کاکوروی، شاد عارفی، رضا نقوی واہی، دلاور فگار، ساغر خیامی، اسرار جامعی اور ظفر کمالی کی ایک ایک نمائندہ نظموں کو شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کے ابتدا میں عرض مصنف میں صاحب کتاب نے کتاب کے تعلق سے احوال و کوائف پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد کا کالم 'میری معروضات' از پروفیسر علیم اللہ حالی پیش نظر فن، فن پارہ اور فن کار کی تفہیم وتدریک میں معاون ہے۔

مجموعی طور پر الفت حسین کی کتاب 'اردو کی ظریفانہ شاعری کا سفر' اس اعتبار سے اہم ہے کہ صنف کا درجہ پانے کے باوجود ظریفانہ شاعری جس طرح سے آج بھی بے توجہی کا شکار ہے اور استاذ فن و ماہرین ادب کجروی کے باعث نسل نو اور بیدار نوجوانوں کے درمیان اس کا تعارف کمزور نظر آتا ہے، ان حالات میں صبر و استقلال، ثابت قدمی کے ساتھ جس طرح الفت حسین نے اس صنف کو اہمیت دی، اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور نہایت عمدگی وہنرمندی سے اس کے فکروفن کی جامع انداز میں حدبندی ومرقع کشی کی اس سے فن ظرافت نگاری کا باب مضبوط و مستحکم ہوگا اور یہ کتاب اس صنف کے معیار و وقار میں اضافے کا سبب بنے گی۔ مصنف موصوف الفت حسین نے اس کتاب کو عملی صورت بخشنے میں جفاکشی اور سلیقہ روی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی زبان پختہ ہے۔ معلومات اچھی ہے۔ ترتیب وتزئین کا مزاج بھی معیاری ہے۔ مختلف علوم وفنون سے واقفیت نے کام کے اندر عمدگی پیدا کردی ہے۔ موضوع اور ظاہری و باطنی ساخت پر قوت ودلآویز ہے۔ طباعت ضخامت اور قیمت مناسب وموزوں ہے۔

ڈاکٹر وہاب عندلیب: شخصیت اور ادبی سفر

مصنف: ڈاکٹر غضنفر اقبال

صفحات: 228، قیمت: 200/روپے

ناشر: کاغذ پبلشرز، ہاگرگہ کراس، رنگ روڈ، گلبرگہ

مبصر: رفیق جعفر، رنجیت سنگھ کالونی، روبرو تلوا، نالہند گلی

تلے گاؤں دھاباڑے، تعلقہ ماول، پونا 410506

ڈاکٹر غضنفر اقبال کی ذہن سازی ادبی ماحول میں ہوئی ہے۔ ان کے والد پروفیسر حمید سہروردی کے زیر تربیت تدریسی وادبی ماحول نے ان کے ادبی ذوق کو ستھرا بنایا اسی ذوق نے انھیں لکھنے پر اکسایا۔ لکھنے کی مشق نے انھیں نت نئے راستے دکھائے جن پر چل کر انھوں نے کم عمری میں کئی منزلیں طے کرلیں، آخرش ان کے ادبی سفر میں ایک ایسی منزل بھی آئی کہ انھیں ہندوستانی زبانوں کے سب سے بڑے ادارے ساہتیہ اکادمی دہلی کے اعزاز سے نوازا گیا۔ یہ اعزاز اکیلے غضنفر کو نہیں ملا گلبرگہ ماضی قریب اور حال کے ادبی ماحول کو ملا ہے کیونکہ اسی ماحول نے گلبرگہ کے اس سپوت کی ادبی پرورش کی ہے۔ ڈاکٹر غضنفر اقبال کی ادبی تحریروں کی فہرست بہت طویل ہے، ڈاکٹر موصوف کی نئی کتاب ڈاکٹر وہاب عندلیب: شخصیت اور ادبی سفر ہے۔ اس کتاب سے میرا رشتہ اپنائیت کا ہے کہ جس پر یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ بھی میرے اپنے بزرگ ہیں۔ جس نے کتاب لکھی ہے وہ بھی میرا اپنا، میرے دیرینہ رفیق حمید سہروردی کا لائق سپوت ہے۔ یہ اردو کے شیدائی ہیں ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ پیش نگاہ کتاب بیرونی خوبصورتی اس کے اندرون کی خوش رنگی کا پتہ دیتی ہے۔ کتاب کی ورق گردانی سے اختراعی عنوانات کہانی در کہانی، شور پر نہیں، مکالموں کے درمیان، منظروں سے ذوبتی ابھرتی کہانی، نہیں کا سلسلہ ہاں سے، احساس کی یاترا، نہیں نہیں ہاں ہاں، نمود، سفر مسلسل سفر، لمحہ لمحہ درد اور بکھرے ہوئے دن، جب سامنے آتے ہیں تو تجسس پیدا ہوتا ہے۔ تجسس اُس وقت دور ہونا شروع ہوتا ہے جب قاری بغور مطالعہ کرنے لگتا ہے۔ ہر عنوان کے تحت جو مواد وہاب عندلیب کی شخصیت اور ان کے ادبی تشخص کی رنگارنگی کو ظاہر کرتا ہے اس طرح مصنف نے قاری کے ذہن کو اپنے لفظوں کی زنجیر سے باندھے رکھا ہے۔ زبان کی روانی ایسی، شوخی اور فصاحت ایسی کہ قاری کو احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ قید میں ہے۔ اُسے آزادی کتاب پڑھنے کے بعد ملتی ہے اور قاری وہاب عندلیب کی سحر انگیز مثالی شخصیت اور اُن کی صالح سنجیدہ ادبی خدمات اور تحریروں سے واقف ہوجاتا ہے۔ یہ ڈاکٹر غضنفر اقبال کی محنت اور وہاب عندلیب کے ادب سے محبت کا ثمر ہے جو ادب کے قاری تک پہنچا ہے۔

پیش نگاہ کتاب کی شروعات میں مصنف نے 'شور پر نہیں' کے تحت وہاب عندلیب اور اس کتاب کے بارے میں کچھ سطریں اس طرح تحریر کی ہیں۔ ''وہاب عندلیب سے راقم التحریر کو بے انتہا محبت اور عقیدت ہے وہاب عندلیب میرے نانا محترم اسماعیل نقیب مرحوم کے ساتھی اور ہم جماعت رہے ہیں۔ میری معمولی سی ہستی نے وہاب شناسی کی ایک ناتمام سعی کی ہے۔ اُمید کہ کتاب دوست حلقوں اور وہاب عندلیب کے مداحوں میں میری اس کاوش کو نگاہ تحسین سے دیکھا جائے گا۔'' (ص 19)

اس اقتباس سے مصنف کے وہاب عندلیب سے دلی تعلق، محبت اور عقیدت کی خوشبو آتی ہے۔ اس خوشبو کو ہر ورق کی ہر سطر میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دراصل خلوص سے کیے ہوئے ہر کام میں اثر ضرور ہوتا ہے۔ اس کام میں بھی اثر ہے۔ وہ چاہے وہاب عندلیب کی زندگی کی روداد ہو کہ اُن سے مکالمے کی بو باس ہو کہ اُن کی ساری کتابوں پر کیے ہوئے تبصروں کا منظر نامہ ڈاکٹر غضنفر اقبال کے قلم نے ایسے درشایا ہے کہ یہ کتاب کسی ایک شخصیت پر سجائی، سنواری ہوئی آرٹ گیلری معلوم ہوتی ہے۔ ہر پینٹنگ اپنے رنگ و روغن سے مزین خوشبوؤں کے مہین پردوں سے معنویت کی روح کے ساتھ جھانکتی نظر آتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ دیکھنے والے کی نیت صاف اور نظر میں روشنی ہو۔

اس کے علاوہ مصنف نے وہاب شناسی کی تکمیل کے لیے دنیائے ادب کے مشاہیر، احباب اور قارئین کے لفظی موتی بھی اس آرٹ گیلری میں سلیقے سے سجائے ہیں جو دیکھنے میں بھلے لگتے ہیں اور پڑھنے میں وہاب عندلیب کی شخصیت اور فن کی گرہیں آہستہ آہستہ کھول کر اُن کی ایسی شخصیت سامنے لاتے ہیں کہ گیلری کے درشک اس شخصیت کو سلام کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر سلام کرتا ہوں۔

حمید ویشالوی - حیات اور کارنامے

مصنف: ظفر انصاری ظفر

صفحات: 163، قیمت: 350، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: شمس وددو، روم نمبر 209، پریار ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'حمید ویشالوی - حیات اور کارنامے' ظفر انصاری ظفر کا اپنے استاذ کو خراج عقیدت پیش کرنے کا سب سے خوبصورت انداز ہے۔ بقول حمید ویشالوی:

مگر کچھ لوگ ہیں، جو خواہش دنیا نہیں رکھتے

پھر بھی جب کسی استاد کو اس قدر مخلص اور سعادت مند طالب علم نصیب ہو جائے تو اس کی

ان چاہی مرادیں بھی بر آتی ہیں۔

اس کتاب میں پیش لفظ کے بعد سب سے پہلے پروفیسر نجم الہدیٰ کا کتاب اور مصنف سے متعلق ایک مختصر تبصرہ ہے پھر چودھری ابن النصیر کا بھی تبصرہ ہے۔جس سے کتاب میں موجود مواد تک باریک بینی کے ساتھ ہماری رسائی ممکن ہو پاتی ہے۔ بہ لحاظ موضوع اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ 'حضرت حمید ویشالوی': حیات وآثار پر مبنی ہے اور دوسرا حصہ ان کے 'فن' سے عبارت ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں مصنف نے 'حمید ویشالوی' کے حالات واضح انداز میں بیان کیے ہیں جو نہ زیادہ مفصل ہے نہ اتنا مختصر کہ عکس زندگی پر نظر ہی نہ ٹھہر سکے۔ جن میں آپ کی زندگی سے متعلق تقریباً ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پیدائش، وفات، خاندانی شجرہ، تصنیفات، شاگرد، پیرو مرشد کا ذکر، حلیہ، عادات واطوار، خوراک، توکل علی اللہ، انبیاء، اولیاء و دیگر بزرگان دین کا احترام نیز خصوصاً آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ لگاؤ اور محبت، تقویٰ، مطالعہ کتب، دینی اجلاس ومحفلوں میں شرکت، شعر خوانی اور شاگردوں کے کلام پر اصلاح جیسے مسائل کی طرف روشنی ڈال کر مصنف نے تقریباً سوانح نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ جس سے قاری کے ذہن پر 'حمید ویشالوی' کا ایک موہوم سا خاکہ ضرور بن جاتا ہے۔

دراصل اردو زبان جہاں بھی پہنچ سکی ہے وہاں اپنا کوئی نہ کوئی ایسا ادیب وشاعر ضرور پیدا کیا ہے۔ جس نے اس زبان اور اس تہذیب کی خوب آبیاری کی ہے، جو آج بھی گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ (یا اسی حالت میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے) جنھیں نہ تو شہرت کی بھوک ہوتی ہے اور نہ دولت کی ہوس اور نہ ایسی کوئی خواہش کہ وہ بھی منظر عام پر آکر زمانے کے رنگ میں رنگ جائیں۔ بلکہ وہ اپنے مقصد میں اتنی خاموشی سے مشغول ہوتے ہیں کہ جب کبھی بھی ان کا کارنامہ منظر عام پر آتا ہے تو ان کی کامیابی کہرام مچا کر لوگوں کو اپنے خالق سے متعارف کراتی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں مصنف نے 'حمید ویشالوی' کے فن شاعری پر ایک سرسری نظر کیا ہے۔ جس سے قاری کو 'حمید ویشالوی' ایک قادر الکلام شاعر نظر آتا ہے جو حقیقت بھی ہے۔ اس حصے میں آپ کی غزل گوئی، نعت گوئی، نظم نگاری، منقبت نگاری، قطعہ نگاری، قصیدہ، ماہ صیام نگاری، رثائی شاعری، دوہا نگاری، مناجات نگاری اور سہرا نگاری وشادی بیاہ یا دیگر تقریبات سے متعلق نظموں پر مصنف نے مختصر بحث کیا ہے اور ان کے اشعار ہی کے حوالے سے حتی الامکان اپنے دعووں کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ عام طور پر دوہے، سہرے وغیرہ منظر عام پر بہت ہی کم آپاتے ہیں اس لیے ان کا ذکر ادب عالیہ میں بھی نہیں ہوتا اور اس دور کا شہری ادیب یہ سمجھتا ہے کہ گویا ان اصناف کا جنازہ بھی اٹھے کافی عرصہ بیت چکا ہوگا۔ جب کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ اب بھی ایسے لاتعداد شعرا مل جائیں گے جو ان اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہماری کم نظری اور ترقی در ترقی کی دوڑ ہے جس میں ہم اپنا بنیادی سرمایہ کہیں پیچھے چھوڑے چلے جا رہے ہیں۔

'حمید ویشالوی' کے اس سوانحی خاکے کو اگر ہم کسی طور پر کافی بھی تسلیم کر لیں تو ان کے فن سے متعلق بحث کو ناکافی ہی تصور کریں گے۔ اگرچہ یہ ابتداء ہے جس میں شاعر کے فن کا عکس پیش کیا گیا ہے پھر بھی پورے سے ذرا سا کم ہے۔ (جس کا اعتراف خود مصنف نے بھی کیا ہے) کتاب کے پہلے حصے کا مطالعہ کرنے سے شاعر کی شخصیت کا ایک عکس ضرور مرتب ہوتا ہے لیکن 'آئینۂ فن' (دوسرے حصے) کا مطالعہ کرنے سے اس بات کی تشنگی میں اضافہ ہو جاتا ہے کہ شاعر کی تخلیق کا پھر سے مطالعہ کیا جائے تاکہ شاعری کی تمام جہتوں تک ہماری رسائی ہو سکے۔

المختصر یہ کہ یہ کتاب ایک طرف قاری کو 'حمید ویشالوی' اور ان کی شاعری سے متعارف کراتی ہے تو دوسری طرف مصنف کے کمال کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ جو اس طرح کے گمنام شعراء کو منظر عام پر لانے کی تحریک کا کام بھی انجام دیتی ہے۔ نیز اردو ادب کا ایک ضخیم اور خالص ذخیرہ (جو اب تک اندھیرے کی نذر تھا) اردو کے فروغ کا نیا زاویہ مرتب کرنے میں معاون ہوگا۔

فنا خود کو جو قطرہ کر چکا ہے موج دریا میں
وہ اب قطرہ نہیں ہے، سب اسے دریا سمجھتے ہیں

(حمید ویشالوی)

شاعری

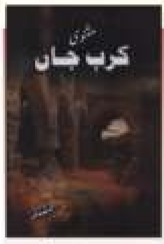

مثنوی کرب جاں

مصنف: غضنفر

صفحات: 208، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: شارب ردولوی، C-95، سیکٹر E- علی گنج لکھنؤ-2

کرب جاں، ہمارے عہد کی 'مہا بھارت' ہے، جس کا راوی آج کا 'سنجے' (غضنفر) ہے اور اس تاریخی کرب کو سننے والے راجا 'دھرت راشٹر' کے بجائے پوری قوم ہے، جس کی آنکھوں پر لال، نیلی پٹیاں بندھی ہیں اور انسانیت 'بھیشم پتاما' کی طرح مجبور تیروں پر پڑی سسک رہی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ گزشتہ تقریباً بیس پچیس سال میں کوئی نئی یا قابل ذکر مثنوی نہیں آئی۔ اس سے پہلے عنبر بہرائچی، قاضی سلیم اور سردار جعفری نے ضرور مثنوی لکھی لیکن بحیثیت ایک شعری صنف کے مثنوی تقریباً نظر انداز ہی رہی کہ اچانک داستان 'کرب جاں' سامنے آئی۔ اس پر تعجب اس بات پر زیادہ ہوا کہ یہ مثنوی کسی شاعر کی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک معتبر اور مشہور فکشن نگار نے اسے مثنوی کے روایتی التزام کے ساتھ نظم کیا ہے۔

اردو مثنوی کے حوالے سے اگر 'کرب جاں' پر گفتگو کی جائے تو تاریخی حوالوں کے بجائے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ 'کرب جاں' صنف مثنوی اور اردو بیانیہ شاعری میں اس لیے ایک اہم اضافہ ہے کہ اس میں تاریخ، سیاست، ثقافت، محبت، عداوت، احتجاج، یکجہتی سب یکجا ہو گئے ہیں اور مثنوی مخصوص عہد کی صداقتوں کا شعری اظہار بن گئی ہے، اس کے علاوہ اس کا کوئی رشتہ اپنی ماسبق مثنویوں 'پھول بن' اور 'خواب وخیال' سے ہے، نہ سحر البیان، گلزار نسیم اور زہر عشق سے۔ یہ اپنے فارم کے لحاظ سے مثنوی، اپنے کنٹنٹ کے اعتبار سے تاریخی وسماجی حقیقتوں کا ادراک واظہار ہے۔

شاید فکشن علامتوں میں بہت بھٹک چکا تھا، اس لیے اس نے زندگی کی حقیقت بیان کرنے کے لیے مثنوی کی ہیئت اختیار کی کہ شعری ہیئت میں دونوں گنجائش موجود ہیں:

سنو زندگی کی کہانی ہے یہ
قلم کی حقیقت بیانی ہے یہ

کلاسیکی مثنوی عام طور پر حمد باری تعالیٰ سے شروع ہوتی ہے اور شعراء مناجات، نعت ومنقبت کے بعد اصل قصے کی ابتدا کرتے ہیں۔ غضنفر نے 'کرب جاں' میں بھی اسی کلاسیکی انداز کو اختیار کیا ہے۔ مثنوی میں جو بات خاص طور پر متوجہ کرتی ہے وہ شعری اظہار پر غضنفر کی گرفت، اشعار میں روانی اور فصاحت ہے۔ اردو کے نثر نگاروں میں بہت سے اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ شبلی کے یہاں جذبات کی جو شدت، حالی کے یہاں جو تاثر، آل احمد سرور کے یہاں جو سنجیدہ ٹھہراؤ ہے وہ کم اہم نہیں ہے لیکن ان کے مطالعے کے

وقت ان کی نثر ذہن پر حاوی رہتی ہے۔ 'کرب جاں' میں یہ یاد نہیں رہتا کہ یہ شخص بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہے۔

غضنفر کی ایک خوبی یا کمزوری یہ ہے کہ کسی بھی واقعے یا موقع کے ہر ممکن گوشے کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں کبھی بات اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ذہن پر دباؤ بن جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جس روانی سے غضنفر نے شعر کہے ہیں، انھیں پڑھتے وقت نگاہیں کسی جگہ پر رک نہیں پاتی ہیں۔ یہ صرف شعری اظہار پر ان کی قدرت کی بات نہیں ہے بلکہ تاریخ، جغرافیہ، تہذیب، تمدن، ثقافت، سیاست پر گرفت کی بات ہے۔ پھر یہ صرف ایک تاریخ یا سیاسی احتجاج نہیں ہے، بلکہ صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ کو شعری لباس دینا اور ان ذہنوں کی نفسیات کو سمجھنا ہے۔ غضنفر نے مثنوی کے نظم کرنے میں شعری جمالیات پر خاص طور پر نگاہ رکھی ہے۔ انھوں نے علامات، استعارے اور تلمیح سے اکثر کام لیا ہے بلکہ ان کے برمحل استعمال سے شعری حسن اور تاثر میں اضافہ کیا ہے۔ حمدِ باری تعالٰی کے یہ چند اشعار دیکھیے۔

کرے کیا کوئی اس کی حمد و ثنا — نہیں جس کے اوصاف کی انتہا
بناتا ہے اک لفظِ کن سے جہاں — مہ و مہر تارے زمیں آسماں
سموتا ہے جو بیج میں اک شجر — تنا، شاخ، جڑ، پھول، پتے، ثمر
عجب فن و حرفت عجب اہتمام — ہنر مندیوں کا عجب التزام
دکھاتا ہے ایسی بھی کاری گری — کہ حیرت زدہ ساری دانشوری

یہ بالکل ابتدائے کلام ہے لیکن اگر توجہ دیں تو کارخانہ قدرت کس قدر عجیب ہے اس کا احساس ان چند اشعار سے بھی ہو جاتا ہے۔

'کرب جاں' ایک بہت طویل تاریخی کینوس پر پھیلا ہوا قصہ ہے اور یہ بڑی بات ہے کہ غضنفر نے اپنی علامتوں اور استعاروں کے دوش پر اس سفر کو کامیابی سے طے کیا ہے۔ آغاز قصہ میں انھوں نے چند باتوں کی بہت تفصیل سے وضاحت کی ہے جس سے ان کی جمالیاتی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے Indirectly اردو مثنوی کی قدیم روایت اور ان میں پائے جانے والے قصوں سے یہ کہہ کر علاحدگی کا اظہار کیا ہے۔

سنو اے زمانے کے دانشورو
یقیناً یہ قصہ ہے کچھ کچھ نیا
بیاں کا بھی انداز بدلا ہوا
یہ قصہ نہیں ہے خراسان کا
یہ قصہ نہیں ہے پرستان کا
نہ یہ من لگن ہے نہ یہ چت لگن
نہیں کوئی اس میں حقیقی بجن
تصوف کا نکتہ بھی کوئی نہیں
نہ ہے فلسفہ اس میں کوئی کہیں

اردو مثنوی میں شعراء نے اپنے عشق کا قصہ، بادشاہوں کی تاریخ، ان کی جنگوں پر رزمیہ مثنویاں اور تصوف کے مسائل تو نظم کیے لیکن کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ

سنو زندگی کی کہانی ہے یہ
قلم کی حقیقت بیانی ہے یہ

اور غضنفر نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ 'قلم کی اس حقیقت بیانی' کو آخر تک باقی رکھیں۔ اس مثنوی میں چند کلیدی الفاظ ہیں مثلاً 'باہری' سانپ یا 'غیر' وغیرہ۔ شاعر نے بعض تاریخی ادوار کو ایک شکل دینے کے لیے ان کو استعمال کیا ہے۔

اس مثنوی کا اگر سماجیاتی مطالعہ کریں تو یہ ایک مخصوص تاریخی، سیاسی اور معاشرتی پس منظر کی مثنوی کے ساتھ قوموں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے کی ضرورت اور نئے ملک میں رد و قبول کی نفسیات کو غضنفر نے بہت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مثنوی کا کرب ہزاروں سال کی اس تاریخ میں نہ جانے کتنے نشیب و فراز سے گزرتا ہے لیکن بہت بڑی بات یہ ہے کہ مثنوی ایک مثبت نوٹ پر ختم ہوتی ہے۔ آج کے حالات میں جب انسانیت، محبت، اخوت ساری دنیا میں پیروں تلے ہے۔ کہیں کسی نام سے اور کہیں کسی نام سے۔ کہیں اس کا کوئی رنگ ہے، کہیں کوئی رنگ لیکن ہر جگہ خود غرضی، عداوت، بنیاد پرستی کی زد پر صرف انسانیت ہے۔ وہ محبت، اخوت، تہذیبی یکجہتی جس نے ایک نئے خوبصورت کلچر کو جنم دیا آج سوالیہ نشان بنا ہوا ہے لیکن شاعران حالات میں بھی پُر امید ہے اور یہی پیغام محبت دیتا ہے کہ

نہ دل کوئی ٹوٹے نہ تن چاک ہو — کبھی کوئی دیدہ نہ نم ناک ہو
چلے ایسی انسانیت کی ہوا — کہ انساں بنے دوست انسان کا
محبت، محبت کے جھونکے چلائے — محبت ہوا کی طرح پھیل جائے

'کرب جاں' ایک حساس شاعر کی کراہ بھی ہے، ایک عہد کا المیہ، ایک تہذیب کے عروج و زوال کی داستان،، ایک معاشرے کے دھندلائے نقوش کی کسک اور ایک بڑی آرزو کا اظہار بھی۔ غضنفر نے جسے اپنے کرب جاں کا قصہ کہہ کر بیان کیا وہ دراصل ہر حساس انسان بلکہ پوری انسانیت کا کرب ہے۔ یہ مثنوی اس عہد کو سمجھنے کے لیے ایک علمی و ادبی دستاویز کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

نہیں کرب جاں کسی ایک کا
ہے قصہ یہاں کے بد و نیک کا

فکشن

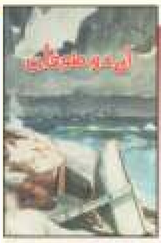

آنے دو طوفان (افسانوی مجموعہ)

مصنف: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری
صفحات: 151، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: دارالادب پبلی کیشنز فراش گنڈ بڈگام کشمیر
مبصرہ: تسنیم بانو، جی 10، ملکہ گنج، دہلی 7

زیر تبصرہ کتاب 'آنے دو طوفان' رسالہ 'دبستان علم و ادب' کے سرپرست ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کی تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں فکر فردا، تدریس اردو، ناول کا فن ارتقا اور لندن کی ایک رات شامل ہیں۔ افسانوی مجموعہ 'آنے دو طوفان' ان کی چوتھی تصنیف ہے اس میں کل سترہ مختصر افسانے شامل کیے گئے ہیں اور ایک تنقیدی مقالہ 'ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا...' کے عنوان سے انیس الاسلام کا تحریر کردہ ہے اس میں مصنف کی ادبی زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور مصنف کی افسانوی اہمیت و افادیت کا اظہار بھی ہے۔ مصنف کے لکھے ہوئے پیش گفتار میں افسانوں اور ادبی تحریروں کے متعلق مختصر تعارف بھی ہے۔

کتاب میں شامل 'شہر سے دور' رومانی کہانی ہے اور ذکی و فہیم طلبہ و طالبات کی دشواریوں اور سماج میں پھیلی ہوئی لالچ نام کی بیماری کا ذکر کیا گیا ہے ان دشواریوں اور جرم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور اپنی زندگی شہر سے دور جا کر گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ 'اپنے وجود سے شکایت' عنوان کا افسانہ جذباتی اور نفسیاتی احساسات پر مبنی

ہے اور عالم گیر سطح پر معاشرے میں فساد اور استحصال پر فکر انگیز تخیل کو قلم بند کیا گیا ہے اور ان حالات پر سوالیہ نشان لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ 'کریں تو کیا کریں؟'۔ افسانہ 'دیوار' جنسیاتی اور رومانی ہے اس میں خوبصورت لڑکیوں کی بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی روداد بیان کی گئی ہے کہ کن کن جذباتی اور نفسیاتی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ 'وہ رات' افسانہ جنسیات سے متعلق ہے جس میں ڈرپوک مرد کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ نیز میں ایک کلرک ہوں میں ایک منتی کلرک کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا ہے، ناسازگاری افسانے میں زمانے کے ستائے اور ٹھکرائے ہوئے آدمی کو پیش کیا گیا اور مجھے پار لگا دو نا! میں ایک شرابی کی سرگذشت ہے شراب کی عادت کی وجہ سے گھر کے اور اس کے حالات بدتر رہتے ہیں۔ افسانہ 'آنے دو طوفان' عشقیہ کہانی ہے اور ساتھ ہی ساتھ روزگار، روزمرّہ کی زندگی کی جدوجہد پر مبنی ہے۔ مشمولہ کتاب میں شہر سے دور، اپنے وجود سے شکایت، آنے دو طوفان اہم افسانے ہیں۔ اس کے علاوہ زور کشمیری کی دیگر تصنیف کے چند تبصرے بھی شامل ہیں۔ تبصرہ" فکر فردا، تدریس اردو، ناول کا فن، ارتقا اور لندن کی ایک رات اور' آنے دو طوفان' پر گلشن عبداللہ کے تبصرے ہیں۔

افسانوی مجموعہ 'آنے دو طوفان' (Let the Hurricane Roar) کی کہانیاں مختصر ہیں اور اس میں عہد حاضر کی بے روزگاری، استحصال، بے انصافی، ظلم وستم، کرب، علم وادب کی بے قدری اور دہشت پسندی جیسے مختلف اور متعدد موضوعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اس میں شامل بھی افسانے مصنف کے تجربات اور مشاہدات کے غماز ہیں جس میں زندگی اور معاشرے کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔

کتاب میں شامل تنقیدی مقالہ یک طرفہ نظر آتا ہے۔ اور کہیں کہیں پر خالی جگہ بھی موجود ہے اس کے علاوہ کتاب کی طباعت اور ٹائٹل دیدہ زیب اور خوبصورت ہے اور اس کی زبان سلیس و رواں ہے جو قاری کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ نیز علاقائی زبان یعنی کشمیری کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ بہر حال اس تخلیق کے لیے مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں۔

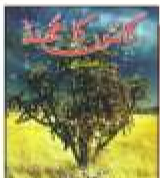

کانٹوں کا جھنڈ (افسانچے)

مصنف منظور وقار

ضخامت: 174، قیمت: 200 روپے

ناشر: کرناٹک اردو اکادمی بنگلور

مبصر: صبا انجم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

کسی بھی طویل کہانی کی بنیاد افسانچہ جیسی مختصر کہانی پر رکھی ہوتی ہے۔ اگر طویل کہانی کے اندر سے مختصر کہانی نکال دی جائے تو طویل کہانی بوسیدہ عمارت کی طرح ڈھیر ہو جائے گی لیکن بیشتر تخلیق کار افسانچے کو حقیر نظروں سے دیکھتے ہیں۔ جبکہ مختصر کہانی یا افسانچہ لکھنا کسی طویل کہانی کو لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ ایک افسانچہ لکھنے میں افسانہ لکھنے سے کہیں زیادہ سوچ وچار اور دماغ سوزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہ دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ گویا لکھنے والا چند الفاظ میں اپنا مقصد ادا کر دیتا ہے۔

ادب میں افسانچہ نویسی کی ابتدا منٹو سے ہوئی۔ منٹو کے بعد دیگر افسانہ نگاروں نے اس فن میں طبع آزمائی کی جس کی وجہ سے افسانچہ نگاری کو صنف نثر میں ایک خاص جگہ اور پہچان ملی۔ آج کے جدید افسانچہ نویسوں کی فہرست میں منظور وقار کا شمار ہم کر سکتے ہیں۔ منظور وقار نے (کانٹوں کا جھنڈ) لکھ کر افسانچہ لکھنے والوں میں اپنی پہچان بنائی۔ 'کانٹوں کا جھنڈ' کی اشاعت 2015 میں ہوئی، اس میں کل 167 افسانچہ درج ہیں۔

یوں تو منظور وقار نے اس مجموعے میں بہت سے افسانچے لکھے ہیں لیکن کئی افسانچوں کو اور بھی اختصار کے ساتھ لکھا ہے۔ جسے پڑھ کر قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے چلتے چلتے دو لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ لیکن یہ باتیں بھی ایسی ہوتی ہیں جو قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیں۔ اس ضمن میں ایک افسانچہ پیش ہے۔

"حیرت کی بات ہے یار! بہت دن ہوئے ملک کے کسی بھی گوشے سے فسادات کی کوئی خبر نہیں آئی؟ ۔۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے دوست قریب میں کوئی الیکشن بھی تو نہیں ہے۔۔!!" (حیرت کی بات)

منظور وقار کے افسانچے براہ راست قاری کے روبرو ہوتے ہیں اور پہلی قرأت میں ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ان کے بیانیہ کی شفافیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تاہم ان کے بیانیہ کے بطون میں جگہ جگہ رمزیت اور ایمائیت کے موتی بھی رلتے نظر آتے ہیں۔

منظور وقار نے اپنے افسانچوں کا خمیر اپنے آس پاس کے ماحول سے اخذ کیا ہے ان کے افسانچے انسانی سروکار کے افسانچے ہیں۔ اس مجموعے میں منظور وقار نے ایسے موضوعات کو افسانوی شکل میں پیش کیا ہے۔ خواہ وہ گھریلو ہو، سیاسی ہو، معاشرتی ہو، یا سماجی ہو منظور وقار نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ چند افسانچے کا تجزیہ پیش ہے۔

افسانچہ بے داغ، برکت، علاج، رقم حلال اور' گرم بازار' ایسے افسانچے ہیں جو رشوت خوری پر لکھے گئے ہیں۔ ان افسانچوں میں مصنف نے لین دین کو مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے جو قابل تعریف ہیں۔ اسی ضمن میں افسانچہ' گرم بازار' ملاحظہ ہے۔

"دوست! ملک میں چاروں طرف رشوت ستانی کا بازار گرم ہے! پورے ملک میں ایمانداری کا بازار ٹھنڈا پڑ چکا ہے یار کم از کم رشوت کے بازار کو تو گرم رہنے دو..."

درج بالا افسانچوں کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اردو کے معروف افسانہ نویس جوگیندر پال نے منظور وقار کے بارے میں صحیح کہا ہے "منظور وقار کے افسانچے مجھے بہت اچھے لگے ہیں، چست، بے لاگ، اور ستم گرانہ اور اپنے نہایت مختصر وجود میں سے اچھل کر قاری کے ذہن میں کچھ اس مانند کوئی نکتہ ثبت کرتے ہوئے، کہ وہ جیسے چاہے ویسے، خود آپ ہی اپنے ہی تلازموں کے مطابق انھیں جی ہی جی میں پھیلاتا چلا جائے"

یہ افسانچے ایسے لکھے گئے ہیں جیسے کوئی کوزے میں سمندر کو سمو دے۔ انھوں نے بہت ہی خوبی کے ساتھ کہانیوں کو تحریر کر کے افسانچوں کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے جو مختصر بھی ہیں اور مکمل بھی لیکن ایسے کہ قاری کو گھنٹوں اپنی گرفت میں جکڑے رکھے۔ اس ضمن میں ان کا افسانچہ دیکھیے:

چلتے چلتے... جب وہ اپنی منزل بھول گیا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس اپنے مکان لوٹ جائے گا... واپسی کے لیے قدم اٹھاتے ہی اسے احساس ہوا کہ... وہ تو اب اپنے مکان کا راستہ بھول چکا ہے۔ (افسانچہ راستہ)

منظور وقار اسی طرح انشائیہ نگاری، خاکہ نگاری اور افسانچہ نگاری کے اصناف و اسالیب پر تسلسل وتواتر کے ساتھ طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ آج بھی ان کے قلم کی تازگی برقرار ہے۔ انھوں نے بڑی ہنرمندی، چابکدستی اور انسانی دردمندی کے ساتھ افسانچے تخلیق کیے ہیں۔ کانٹوں کا جھنڈ کے افسانچے حقیقت بیانی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ انھوں نے روزمرہ کی بول چال کی زبان اور مقامی بولی ٹھولی سے طنزیہ مزاحیہ عناصر کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے ان کی افسانچہ نگاری موجودہ زندگی کے تمام تر حوادث وحالات کا آئینہ ہے وہ اپنی رائے قاری پر مسلط نہیں کرتے بلکہ غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

کتاب کا سرورق بہت عمدہ اور خوبصورت ہے کتاب ہر لحاظ سے قابل توجہ ہے ان شاء اللہ ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

تاریخ

جزائر انڈمان و نکوبار: ماضی تا حال

مصنف: ایم احمد مجتبیٰ (علیگ)

صفحات 368، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: انشا پبلی کیشنز، کلکتہ

مبصر: حقانی القاسمی، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے بعد ہندوستانی عوام میں ایک طرح کی بے چینی سی پھیل گئی اور ہندوستانیوں نے برطانوی استعماریت کے خلاف احتجاج کا پرچم بلند کیا۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے دیے گئے جسے برطانوی حکومت نے بغاوت، شورش اور دہشت گردی سے تعبیر کیا اور اس کی پاداش میں عدالتیں مجاہدین آزادی کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزائیں دینے لگیں۔ مجاہدین انڈمان بھیج دیے گئے کیونکہ یہ ہندوستان سے بہت دور ایسے جزیروں کا مجموعہ تھا جہاں سے فرار ناممکن تھا۔ یہاں گھنے جنگلات تھے، زہریلے سانپ، کنکھجورے، کیڑے مکوڑے، خون چوسنے والے جونک اور پسو، ملیریا والے مچھر تھے۔ یہ ایک طرح سے قدرتی طور پر جیل خانہ تھا۔ یہاں کا سیلولر جیل بہت ہی مشہور ہے اور اسے اب نیشنل میموریل کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

ایم احمد مجتبیٰ علیگ کی یہ کتاب مجاہدین آزادی کی اذیت گاہ جزائر انڈمان ونکوبار کی تاریخ، جغرافیے اور ماحولیات پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں انھوں نے جزائر انڈمان ونکوبار کا پورا جغرافیہ اور اس کی تاریخ درج کی ہے اور اس سلسلے میں عبدالسبحان کی کتاب کو شامل کیا ہے جو پورٹ بلیئر میں سینئر مڈل اسکول ٹیچر تھے۔ یہ کتاب 1935 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے انڈمان ونکوبار کے حوالے سے تمام حقائق اور تاریخی تفصیلات درج کی ہیں۔

دوسرے حصے میں انھوں نے مجاہدین آزادی کی تفصیلات لکھی ہیں جنھیں پہلی جنگ آزادی 1857 میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کے جرم میں کالے پانی کی سزا سنائی گئی تھی۔ ان مجاہدین میں علامہ فضل حق خیرآبادی، مولانا محمد جعفر تھانیسری، مولوی عبدالرحیم عظیم آبادی، مولوی یحییٰ، مفتی عنایت احمد کاکوروی...... وغیرہ اہم ہیں۔ انھوں نے تقریباً 363 مجاہدین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے انڈمان ونکوبار میں سزائیں جھیلیں ان میں کچھ ایسے نام بھی ہیں جن سے ہم مکمل طور پر ناواقف ہیں۔ یقینی طور پر یہ فہرست بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے خطے خطے سے مجاہدین آزادی کو انڈمان ونکوبار بھیجا گیا تھا۔ ان مجاہدین نے بہت کڑی صعوبتیں اور اذیتیں برداشت کیں۔ قید کے دوران انھیں ایسے حالات سے گزرنا پڑا کہ ان کے بارے میں پڑھتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں مگر ان مجاہدین آزادی نے جیل میں رہ کر بھی ایسے کام کیے جنھیں انسانی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ قید میں رہ کر ان لوگوں نے علم کی روشنی پھیلائی، امن و اتحاد کی شمع روشن کی اور ایسے علمی کام کیے جن سے آج ایک بڑا طبقہ کسب فیض کررہا ہے۔ یہ بات قدرے حیرت انگیز لگتی ہے کہ فضل حق خیرآبادی نے انڈمان کی قید کے دوران الثورۃ الہندیہ، قصائد فتنۃ الہند، مولانا جعفر تھانیسری نے کالا پانی و تواریخ عجیب جیسی خودنوشت لکھی۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی نے صرف کی مشہور کتاب 'علم الصیغہ' وہیں تحریر کی جو آج مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ انھوں نے ہی تواریخ حبیب اللہ اور تقویم البلدان کا ترجمہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ مولوی مظہر کریم نے 'فراصد الاطلاع' کا ترجمہ کیا۔ منیر شکوہ آبادی کی زیادہ تر شاعری انڈمان میں قید کے دوران ہی لکھی گئی۔ یہ بات بھی چونکانے والی ہے کہ اس جیل میں علامہ فضل حق خیرآبادی پہلے استاد اور جیل سپرنٹنڈنٹ پہلے طالب علم تھے۔ انگریز افسروں اور سپاہیوں کو یہ تمام اسیران انڈمان فارسی و اردو پڑھایا کرتے تھے۔ ان مجاہدین نے مصیبتوں میں رہ کر بھی بھائی چارے کو فروغ دیا۔ مولانا تھانیسری نے الموڑہ کی ایک غیرمسلم خاتون سے نکاح کیا۔ اس طرح کے اور بھی واقعات ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان مجاہدین نے اتحاد و اخوت کی شمع ایک ایسے علاقے میں روشن کی جہاں ان کے لیے اذیتوں اور صعوبتوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ انھی مجاہدین نے جزیرۂ روس (Ross Island) میں سب سے پہلی مسجد کی بنیاد رکھی۔ ابرڈین کی جامع مسجد بھی انھی کی دین ہے۔ اس طرح مجاہدین نے انڈمان جیسے جنگلی علاقے کو آباد کیا اور آج وہ علاقہ سیر و سیاحت کا بھی ایک مرکز بن چکا ہے۔

ایم مجتبیٰ علیگ نے جزائر انڈمان ونکوبار کے قبائلیوں کا بھی تعارف کرایا ہے جن میں نگ رائٹ اور منگولائٹ اہم ہیں۔ انھوں نے انڈمان ونکوبار میں جاپانیوں کے قبضے کی داستان بھی لکھی ہے کہ 23 مارچ 1942 کو جاپانی فوجوں نے انڈمان ونکوبار پر قبضہ کرلیا اور انگریز افسران کو قید کرلیا گیا۔

مصنف نے وہاں کی آب و ہوا، زلزلہ، آبادی، زراعت، آمد و رفت، تعلیم، طب و صحت، سیاحت، سول سپلائی وغیرہ کے حوالے سے بھی بہت اہم تفصیلات درج کی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے جزائر انڈمان ونکوبار میں مسلم آبادی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق اس جزیرے میں مسلمانوں کی آبادی 8.52 فیصدی ہے۔ وہاں تقریباً 76 مساجد ہیں اور مدارس کی تعداد تقریباً 22 ہے۔ مسلم اسکول کی تعداد 8 اور قبرستان 27 اور 4 درگاہیں ہیں۔ تبلیغی جماعتیں ہیں جن کا مرکز جامع مسجد ابرڈین ہے۔ وہاں وقف بورڈ بھی قائم ہے اور حج کمیٹی بھی ہے۔ انھوں نے جزائر انڈمان ونکوبار کے مختلف جزیروں کا بھی تعارف کرایا ہے اور آخر میں چند بھولی بسری ہستیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں مصنف نے اپنے دادا پنڈت اجودھیا رائے کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے اپنا نام بعد میں نظیر محمد رکھ لیا تھا۔ مرد مجاہد شیر علی کا بھی ذکر انھوں نے خاص طور پر کیا ہے جنھوں نے لارڈ میو کا قتل کیا تھا۔ ان پر طویل مقدمہ چلا اور انھیں پھانسی دے دی گئی۔ شیر علی جنگ آزادی کا ایک ایسا کردار ہے جس کے حوالے سے ناول بھی لکھے گئے اور شاعری بھی کی گئی۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے افراد کا بھی ذکر کیا ہے جو جزائر انڈمان میں اہم عہدوں پر فائز تھے جن میں بنیاد حسین، چودھری کفیل احمد، چودھری فضل محمد، اے اے رضوی، ایس بی اے علی، اسماعیل خان، خان صاحب ڈاکٹر نواب علی، سید غلام جیلانی، امام المجید کے علاوہ مشہور ادیب سجاد حیدر یلدرم قابل ذکر ہیں جو وہاں اسسٹنٹ ریونیو کمشنر کے عہدے پر فائز تھے اور کہا جاتا ہے کہ عالمی شہرت یافتہ فکشن نگار قرۃ العین حیدر کی ابتدائی تعلیم انڈمان کے ابرڈین اسکول ہی میں ہوئی تھی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ امام المجید پہلے ہندوستانی تھے جو جزائر انڈمان ونکوبار کے چیف کمشنر بنے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جزائر انڈمان ونکوبار کے حوالے سے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مصنف نے وہاں کے سرکاری دستاویزات اور وثائق سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس لیے جزائر انڈمان ونکوبار کے ماضی اور حال کے حوالے سے ان کی کتاب مستند اور معتبر ہے۔ ایم احمد مجتبیٰ (علیگ) نے اس کے علاوہ انگریزی میں ویر ساورکر پر بھی ایک کتاب تحریر کی ہے جس کا عنوان ہے Veer Savarkar: A Revolutionary Political Prisoner and Cellular Jail, Andmans۔ جزائر انڈمان ونکوبار کی تاریخ سے انھیں خاص دلچسپی ہے اسی لیے انھوں نے اپنے مطالعے کو زیادہ تر انڈمان ونکوبار پر ہی مرکوز رکھا ہے۔ انگریزی میں ان کی اور بھی کتابیں ہیں جن میں:

- The Silent Past of Andamans (Few Freedom Fighters of 1857)
- Jama Masjid, Aderdeen, Port Blair (1885-2005)
- Memories of Andaman & Nicobar Island
- History of School Education

ہیں۔ ایم احمد مجتبیٰ (علیگ) نے یہ بہت اہم کام کیا ہے کہ انھوں نے انڈمان میں قید ان مجاہدین آزادی کی تمام تفصیلات درج کر دیں جنھیں ہم فراموش کرتے جا رہے تھے۔ آج جبکہ ہمارا ملک 71 واں جشن آزادی منا رہا ہے تو ہمیں ان مجاہدین آزادی کی قربانیوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے جنھوں نے اذیتیں سہہ کر ہمارے ملک کو آزادی کا سورج عطا کیا۔ آزادی کے ان سورماؤں کو یاد رکھنا ہمارا قومی فریضہ ہے!

ڈراما

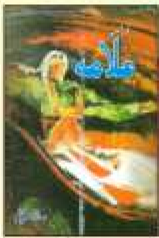

ڈرامہ علامہ

مصنفہ/ ناشرہ: صالحہ صدیقی

صفحات: 128، قیمت: 77 روپے

مبصر: محمد شاہد اقبال، D-81/9، تیسری منزل، شاہین باغ، نئی دہلی

علامہ اقبال کے شعری امتیازات اور فکر وفن کے ہر پہلو پر دنیائے ادب کی مقتدر شخصیات نے طبع آزمائی کی ہے۔ علامہ اپنے عہد کے ہجوم شعرا میں سب سے الگ تھے، منفرد و ممتاز حیثیت کے حامل تھے اور یہ انفرادیت، یہ وقار ایسا نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا جائے۔ وہ ایک بالغ النظر شاعر تھے ان کے علم کا یہ حال تھا کہ وہ مشرق و مغرب کا سنگم کہلائیں۔ صالحہ صدیقی نے انھیں شاعر مشرق کی زندگی اور خاص کر ان کی ازدواجی زندگی کو ڈرامے کی شکل میں اپنی کتاب 'ڈرامہ علامہ' میں بڑی ہی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یوں تو علامہ کی شاعری، ان کی سیرت، سیاسی بصیرت، پر خوب کام ہوا ہے، دیگر شعرا کی بنسبت علامہ پر لوگوں نے خوب لکھا اور پڑھ کر ماہر اقبالیات کی سند بھی حاصل کر چکے ہیں لیکن علامہ کی ازدواجی زندگی کو چھونے سے زیادہ تر ماہر اقبالیات بھی کتراتے ہوئے نظر آئے، کیونکہ میری نگاہ میں ایسا لگتا ہے کہ زیادہ تر ادیبوں نے یہ سمجھا کہ اس میں علامہ کی بے ادبی ہو جائی گی اس لیے ایسے موضوع سے پرہیز کیا جائے۔

بہر حال صالحہ صدیقی نے بڑی جرأت کے ساتھ علامہ کے انھیں پہلو کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے اور ان کی ازدواجی زندگی کو ڈرامے کی شکل میں اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ادب کی آبیاری کے ساتھ ساتھ عام قاری دلچسپی لے کر اس کو پڑھ سکے۔

صالحہ صدیقی نے ڈرامے میں جو المیہ اور طربیہ ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے اس کی مثال کم ہی ڈرامہ نگار دے پاتے ہیں۔ یعنی علامہ اقبال کا سردار بیگم کے سینہ پر سر رکھ کر رونا اور قرآنی آیت کا ورد شروع کر دینا، ڈرامے کے اس ڈرامائی ماحول میں علامہ اقبال کے شاعرانہ مزاج کی عکاسی کرتے ہوئے صالحہ صدیقی نے جو مکالمے لکھے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ جیسے ''سردار تمہارے بغیر اس سوکھی تپتی زندگی کیسے جی پاؤں گا؟ سردار تم تو ٹھنڈی چھاؤں تھیں اب میرے لیے کوئی سایہ دار درخت نہیں رہا، صرف ایک آگ اگلتی دھوپ رہ گئی'' ہے۔ وغیرہ وغیرہ ان مکالموں کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ مصنفہ کو ڈرامہ نگار نہیں بلکہ شاعر ہونا تھا۔

سلیم جہانگیر نے زیر نظر کتاب میں 'زندگی میں پھول کھلاتا ڈرامہ' کے عنوان سے مصنفہ کی ڈرامہ نگاری کے بارے میں بات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'صالحہ صدیقی کا المیہ یہ ہے کہ انھیں ایک ساتھ کئی کردار ادا کرنے کا پابند کر دیا گیا ہے، لیکن یہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ وہ سارے کرداروں سے مکمل انصاف کرتے ہوئے بحسن وخوبی اپنی ذمے داریوں یا کرداروں کو نبھانے کی کوشش میں شب و روز مصروف و سرگرداں ہیں'۔

سراج عظیم نے بھی اس کتاب میں 'چند باتیں' کے عنوان سے گفتگو کرتے ہوئے علامہ اقبال کے ساتھ ساتھ مصنفہ کی ڈرامہ نگاری پر گفتگو کی ہے جس سے ان کی صحت مند ڈرامہ نگاری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل 'ڈرامہ علامہ' کے صفحہ 84 سے ڈرامے کے کردار پر بحث کی گئی ہے اور پہلا منظر، دوسرا منظر، تیسرا منظر وغیرہ کے عنوان سے ڈرامہ آگے بڑھتا گیا ہے جو علامہ کی زندگی اور خاص طور سے ازدواجی زندگی پر مشتمل ڈرامہ ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں علامہ کی کچھ دلچسپ تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں جو جاذب نظر ہے۔ 'ڈرامہ علامہ' کے صفحہ نمبر 94 پر 'تیسرا منظر' کے عنوان سے جو ڈرامہ لکھا گیا ہے وہ علامہ اقبال کی پہلی شریک حیات کے انتقال کے بعد ان کے نکاح میں آئی دوسری بیوی سردار بیگم اور علامہ کی زندگی پر مشتمل ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ گمنام خطوط سے علامہ کس طرح پریشان ہوتے ہیں اور اس کا انسانی ذہن پر کس قدر اثر ہوتا ہے، اس میں علامہ، نوکر اور وکیل صاحب مرکزی کردار میں ہیں، اس گمنام خطوط میں سردار بیگم کے تعلقات کو علامہ سے شادی کے بعد بھی غیر محرم مرد سے بتانے کی کوشش کی گئی ہے، جس سے کسی بھی مرد کا پریشان ہونا فطری بات ہے۔ چونکہ علامہ کی دوسری شادی میں اس وکیل صاحب کا اہم رول تھا اس لیے ایسے وقت میں علامہ نے انھیں یاد کیا۔ تمام باتوں کو ڈرامہ کی شکل میں بڑی ہی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تیسرا منظر کے عنوان سے لکھے اس ڈرامے میں لوگوں کے لیے ایک نصیحت بھی ہے کہ شادی کرنا تو آسان ہے لیکن اس کو نبھانا بہت مشکل ہے کیونکہ نکاح کا بندھن دونوں کے لیے بہت ہی باریک ہوتا ہے اس کا پاس ولحاظ دونوں کو رکھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ معمولی بات بھی آگے چل کر شادی شدہ زندگی کو پریشانی میں ڈال دیتی ہے، اور یہی ہو رہا تھا علامہ اور سردار بیگم کے ساتھ پوری کتاب میں ہمیں یہی منظر زیادہ پسند بھی آیا اور ایک نصیحت بھی ملی۔ یوں تو کتاب میں شامل سبھی ڈرامے اچھے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ مصنفہ کی محنت ضرور رنگ لائے گی، ساتھ ہی تبصرہ کے آخر میں اس بات کی طرف بھی نشاندہی ضروری ہے کہ اگلے ایڈیشن میں اس کی پروف ریڈنگ پر توجہ دی جائے۔

کل ملا کر کتاب قابل مطالعہ ہے اور خصوصاً ادب کے طلبا کے لیے زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔

مختصر تبصرے

جذبات

شاعر: حاجی محمد اشرف قریشی، اشرف مانوی/ قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2016

پیش نظر کتاب 'جذبات' اشرف مانوی کی شعری تصنیف ہے جس میں سرورق پر ہی اس بات کی تصدیق کی گئی ہے کہ یہ حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، سلام، غزل اور گیت کا شعری مجموعہ ہے۔ کتاب کے مطالعے سے یہ واضح ہے کہ اس میں 3 حمد، 12 نعت، 7 منقبت، مرثیہ، سلام اور 43 غزلیں جگہ پاتی ہیں۔ گیت کے تحت سہرا اور رخصتی والی نظم ہے۔

حمد یہ اشعار بھی خوب کہے گئے ہیں جس میں خدا کی عظمت کا کما حقہ بیان ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے۔

خدا کے شکر کو جتنا عطا کریں کم ہے   نبیؐ کی راہ پہ چلنا سکھا دیا ہم کو
ہمیں نیکی بدی کی چھوٹ دے کر   خدا میزان پر بھی تولتا ہے

حمد کے بعد نعتیہ اشعار بھی خوب ہیں۔ جو عشق نبیؐ سے لبریز نظر آتے ہیں۔

شاہ بھی صف میں فقیروں کے نظر آتے ہیں   میری آنکھوں نے مدینے میں وہ در دیکھا ہے
اللہ نے بلایا جو معراج کے لیے   ملنے کو اس سے سدرہ کو زینہ بنا لیا

مرثیہ کے تحت ایک نظم 'منقبت امام عالی مقام' اور دوسرا 'مرثیہ' ہے۔

کل کوئی تھا نہ آج ہے ہمسر حسینؓ کا   ہوتا رہے گا ذکر بھی گھر گھر حسینؓ کا

غزلوں کے مطالعے سے بھی یہ بات عیاں ہے کہ یہاں سلاست و سادگی کے

ساتھ برجستگی و روانی برقرار ہے جس کی وجہ سے یہ اشعار فوراً ذہن پر اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر کافی جاذب ہے۔

زندگی نام ہے حوادث کا　　کس لیے فکر حادثات کریں

بہ حیثیت مجموعی یہ مجموعہ اپنے قارئین کے لیے ایک نادر تحفے کی حیثیت رکھتا ہے جہاں شعری و فنی خوبیاں پورے توازن کے ساتھ موجود ہیں۔

سوزش پنہاں

شاعر: محمد انصاری رضا/صفحات: 114، قیمت: 165 روپے، سنہ اشاعت: 2017

پیش نظر کتاب 'سوزش پنہاں' محمد انصاری رضا کی شعری تخلیق ہے۔ بقول شاعر، شاعری کا فن انھیں خاندانی ورثے میں ملا۔ چنانچہ وہ بچپن ہی سے نعتیہ محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔

اس مجموعے میں 4 حمدیہ نظم اور 4 نعت کے علاوہ 66 غزلیں شامل ہیں۔ حمدیہ اشعار میں شاعر کا اپنے معبود حقیقی کی ذات سے والہانہ عشق نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی عقیدت و احترام بھی ملحوظ خاطر ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ترے وجود کی وسعت ہے بیکراں لیکن　　دل رضا میں سمٹ کر سمٹنے والا تو

نہیں مانگو تو وہ ہوتا خفا ہے　　کوئی داتا کہیں ایسا بھلا ہے

نعتیہ اشعار میں بھی حب نبیؐ پورے احترام کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

مہرباں آپؐ سب مہرباں سے الگ　　جینا دشوار ہے آستاں سے الگ

غزلیہ اشعار میں بھی شعری لوازم اور غنائیت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ساتھ ہی انسانی اقدار و اصول پر شاعر پوری طرح عمل پیرا نظر آتا ہے۔ جدیدیت کے دور میں بھی وہ اپنی انفرادیت بنائے رکھتے ہیں اور راہ اعتدال پر خود کو صدرجہ گامزن رکھتے ہیں۔ شاعر کے جذبات کی ترجمانی ان کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

رضا اقدار کی تکمیل میں ہی کامیابی ہے　　اسی سرمائے سے میں زندگی بہتر بناتا ہوں

حالات حاضرہ سے آج کے عہد کا ہر انسان پریشان نظر آتا ہے۔ لیکن شاعر کو اس کا گمان ہے کہ یہ صورت حال ہمیشہ باقی نہیں رہے گی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

غم واندوہ کے بادل رضا چھٹ جائیں گے اک دن
سدا اس قادر مطلق سے تم اچھا گماں رکھنا

بہرحال رضا صاحب کی یہ شعری کاوش خوب ہے۔ اگر وہ غزلوں کی ترتیب بھی ردیف وار کرتے تو اس کے حسن میں مزید اضافہ ہوتا۔

نزول

شاعر: بدنام نظر/ قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2016

پیش نظر کتاب اردو کے مشہور شاعر بدنام نظر کی تخلیق ہے، جن کی شخصیت کسی بھی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس مجموعے میں شامل غزلوں کی تعداد 140 کے قریب ہے۔ اس لحاظ سے یہ دیوان کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں ردیف وار ترتیب نہیں ہے۔

آمدم برسر مطلب کے تحت جب ہم اس شعری مجموعہ کی جانب نظر ڈالتے ہیں تو ایک کہنہ مشق شاعر ہمارے روبرو آموجود ہوتے ہیں جو شاعری کے وسیلے سے اپنے فن کو کمال بلندی تک پہنچانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس مجموعے کی پہلی غزل حمدیہ اشعار پر مبنی جہاں وہ یہ کہتے ہیں۔

راہ تاریک اور سفر دشوار　　آسماں پر کوئی ستارا دے
میری معصومیت مجھے لوٹا　　میرا بچپن مجھے دبارا دے

دوسری جانب عشق نبیؐ کا اظہار بھی بڑی خوبی کرتے ہیں۔

داغ سے ہم تھے ناموروں کے دامن پر　　بدنام کو نام دلانے والے آپؐ

شاعر کو اپنے وطن سے کافی محبت ہے۔ وہ اس کی ویرانی پر خود کو خاموش تماشائی بن کر دیکھنا نہیں چاہتا ہے۔ اس لیے وہ یہ کہنے پر مجبور ہے۔

بچانا ہے ہمیں شعلوں سے اپنے گلشن کو　　بلا سے جسم جلے، دل جلے، دماغ جلے

دوسری جانب وہ ان سیاسی لیڈران کی جانب بھی دیکھتا ہے جو منصب وزارت پر پہنچنے کے بعد بھی اپنی ذات میں تبدیلی نہیں لاتے

ہائے اس بونے کی قسمت جو نظر　　کرسیوں پر چڑھ کے بھی بونا رہا

عہد حاضر میں زمانہ برق رفتاری کے ساتھ ترقی کے منازل طے کر رہا ہے لیکن آج بھی انسان بہت سارے غموں سے جکڑا ہوا ہے جس کا ذکر وہ اس انداز میں کرتے ہیں

فکر جاناں، فکر دوراں، فکر حال　　کوئی آخر کتنے غم لے کر چلے

درد کا شہر

شاعر: ایم کے بھان تمنا/ قیمت: 200 روپے

پیش نظر کتاب 'درد کا شہر' ایم کے بھان تمنا کا شعری مجموعہ ہے جس میں 116 غزلوں اور 16 نظموں کو یکجا کر دیا ہے۔ اگرچہ شاعر کا اظہار بیان دوسری زبانوں میں بھی ہوا ہے لیکن وہ اردو سے قربت رکھتے ہیں اس لیے وہ پہلے شعری مجموعے کو مرتب کیا اور منظر عام پر لائے۔ شاعر جب اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے تو اسے اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کی۔

لازماً آئے گا کوئی انقلاب　　دنیا میں ہوں گے ستم جب بے حساب

شاعر کو موجودہ وقت میں عوامی پریشانیوں کا بھی اندازہ ہے۔ ساتھ ہی اس کی امید بھی کرتا ہے کہ یہ صورت حال تادیر باقی رہنے والی نہیں۔ اس لیے اس کا کہنا ہے۔

گلستاں میں آئے گی اک دن بہار　　خزاں کو بہر طور جانا پڑے گا

آج کے وقت میں حق گوئی و بے باکی پر زمانے نے مہر لگا رکھی ہے۔ آج حق بات کہنا خود کو پریشانیوں میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے۔ یہ شعر دیکھیے

جو بات بھی تھی اپنی تمنا غلط نہ تھی　　ہم جو بھی کہنا چاہتے تھے برملا کہا

شاعر نے موجودہ دور میں سیاسی بازی گروں کی بھی خبر لی ہے۔

ان سیاست دانوں پہ قربان ہم　　جو ہیں رنگیں خواب دکھلاتے رہے

اس مجموعے کے آخر میں آزاد نظموں کو جگہ دی گئی ہے، جو شاعر کے ادبی ذوق کا پتہ دیتی ہے۔ البتہ اوزان و بحور کی پاسداری میں خامی موجود ہے۔ پھر بھی موجودہ وقت میں اس قسم کی شاعری بھی غنیمت ہے جو دلوں کی زنگ دور کرتی ہے۔

جلتی ہے شمع

شاعر: شمع کوثر شمع/ قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2016

پیش نظر کتاب 'جلتی ہے شمع' شاعرہ کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ یہ ان کی ابتدائی کاوش ہے۔ اس لیے شاعری کے محاسن تلاش کرنا محض تضیع اوقات ہے۔ خیالات میں یکسانیت نہیں ہے۔ انھوں نے غزلیں اور نظمیں دونوں کہی ہیں۔ اس مجموعے کے مطالعے سے ایک بات تو بہرحال واضح ہے کہ ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے شہر ذات کی کارفرمائی ہے۔ البتہ کہیں کہیں کچھ چیزیں بھی نمایاں ہوگئی ہیں مثلاً اقدار کا زوال، لہولہان انسانیت اور شکوہ آمیز احتجاج ہے۔ چند اچھے اشعار اس طرح ہیں۔

عداوت، بغاوت، تجارت، سیاست　　یہی اب صفت آگئی آدمی میں

سچ بات بولنے کا ہمیں یہ صلہ ملا　　احباب کی نگاہ میں کانٹا بنے رہے

اگر شاعرہ اپنی مشق جاری رکھ سکتی ہیں تو آئندہ کچھ سالوں میں ان کے فن میں نکھار آسکتا ہے جس کے لیے انھیں اپنے ذوق مطالعہ کو وسیع کرنا پڑے گا۔ ورنہ موجودہ کلام کوئی خاص اثر نہیں رکھتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالناصر، C-24، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی

عالمی نامہ

کناڈا کے وزیراعظم نے مسلمانوں کو اردو میں عید کی مبارکباد دی

کناڈا: کینیڈین وزیراعظم جسٹن ٹروڈو نے اپنے ملک سمیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو عیدالفطر کی مبارک باد دے کر ایک بار پھر سب کے دل جیت لیے۔ کینیڈین وزیراعظم جسٹن ٹروڈو دنیا بھر میں موجود مسلمانوں کے

لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے ہر تہوار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، گذشتہ روز جسٹن کی جانب سے فیس بک پر ایک ویڈیو شیئر کی گئی جس میں انھوں نے کناڈا میں مقیم مسلمانوں سمیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو اردو میں عیدالفطر کی مبارک باد دی۔ جسٹن ٹروڈو نے اپنے تہنیتی پیغام میں کہا کہ شام سورج غروب ہونے کے بعد کناڈا سمیت دنیا کے وہ ممالک جہاں آج آخری روزہ ہے، وہ اگلے دن عید منائیں گے۔ واضح رہے کہ دنیا کے بہت سے ممالک کی طرح کناڈا میں بھی آج یعنی 25 جون کو عیدالفطر منائی جارہی ہے اور مسلمانوں کے لیے عید کی اہمیت کے پیش نظر کناڈا میں دو چھٹیوں کا اعلان کیا گیا ہے۔ کینیڈین وزیراعظم نے کہا کہ رمضان المبارک کے مقدس ماہ کے اختتام پر عیدالفطر کا تہوار دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے بہت اہم ہوتا ہے، رمضان کے پورے مہینے عبادت کرنے اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے لیے عیدالفطر منائی جاتی ہے، اس تہوار پر تمام مسلمان اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے ملتے ہیں اور انھیں عید کی مبارک باد دینے کے ساتھ تحائف کا تبادلہ بھی کرتے ہیں اور مسلمان گھرانوں میں خصوصی طور پر خوش ذائقہ کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کینیڈین ثقافت اور ترقی میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے، میں اپنی فیملی اور اپنی اہلیہ صوفی کی جانب سے بھی مسلمانوں کو دل کی گہرائیوں سے عید کی بہت مبارک باد دینا چاہتا ہوں 'عید مبارک'۔ جسٹن ٹروڈو نے آمد رمضان کے موقع پر بھی دنیا بھر کے مسلمانوں کو اردو میں ماہ صیام کی مبارک باد دے کر مسلمانوں کے دل جیت لیے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جون 2017

'اردو لغت تاریخی اصول پر' اب آن لائن

اسلام آباد: 'اردو لغت تاریخی اصول پر' کا موبائل اور آن لائن ورژن لانچ کردیا گیا ہے۔ یہ عظیم لغت 22 جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں 2 لاکھ 64 ہزار الفاظ شامل ہیں۔ اس لغت کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں صرف ایک لفظ 'دل' اور اس کے متعلقات 112 صفحات پر محیط ہیں۔ یہ ڈکشنری اردو لغت بورڈ کی کاوش ہے۔ اس خصوصی ادارہ کا قیام بابائے اردو مولوی عبدالحق کی کاوشوں سے 1958 میں ہوا تھا اور اس کا ماڈل آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی طرز پر تیار کیا گیا تھا جس کے تحت اردو کی ایک ایسی جامع

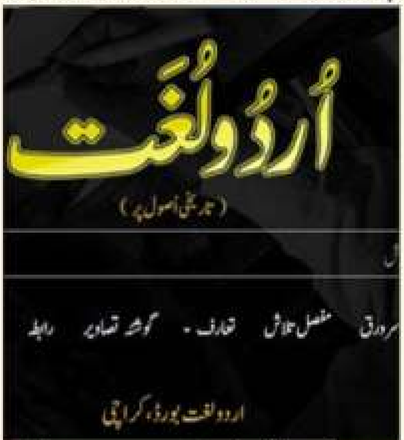

لغت تیار کی جانی تھی جو محض لفظوں اور معنوں کا انبار نہیں بلکہ ہمارے تاریخی، تہذیبی سفر کو آئینہ بھی کرتی ہے۔ 'لغت تیار کرنے کی یہ مہم 52 برس کے بعد 2007 میں اس وقت اختتام پذیر ہوئی جب اس کی 22 ویں اور آخری جلد شائع ہوئی، تاہم اس کے بعد سے بڑے سائز کی ایک ایک ہزار صفحوں پر مشتمل اس لغت کی 22 جلدوں سے استفادہ کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسی دوران چند جلدیں آؤٹ آف پرنٹ بھی ہوگئیں چنانچہ یہ بھاری بھرکم لغت عام آدمی کی دسترس سے مزید دور ہوگئی۔ اردو ڈکشنری بورڈ کے سربراہ عقیل عباس جعفری کہتے ہیں کہ 'اب آن لائن ورژن اور ایپ تیار ہونے سے یہ ضخیم دستاویز ہر کسی کی پہنچ میں آگئی ہے۔'

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 جون 2017

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

عربی زبان وادب کے بغیر صحت مند اردو زبان کا تصور ناممکن ہے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

کونسل کے صدر دفتر میں عربی پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دہلی: ہندوستان دنیا کا واحد ایسا ملک ہے جہاں کثیر اللسانیات اور کثیر المذاہب لوگ رہتے ہیں۔ باوجود ان حقیقتوں کے حکومت ہند کی جانب سے کونسل کو جہاں اردو کے فروغ کے لیے خصوصی اختیارات دیے گئے ہیں وہیں عربی زبان کی ترویج واشاعت کے لیے بھی مینڈیٹ ملا ہے۔ عربی زبان وادب کے بغیر صحت مند اردو زبان کا

تصور ناممکن ہے۔ عربی زبان وادب نے اردو کی لسانی ثروت اور علمی سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ کونسل اس حوالے سے عربی زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے کئی جہات پر کام کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک اہم کام مختصر تاریخ ادب عربی کی ایک جلد تیار کرنا شامل ہے۔ تاریخ ادب عربی کے تعلق سے کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ لیکن مکمل طور پر عربی ادب کی تاریخ کو اپنے احاطے میں نہیں لا پائی ہے۔ اس کمی کو دور کرتے ہوئے کونسل نے گزشتہ سال تاریخ ادب عربی کی مختصر کتاب اردو میں لانے کی تجویز کو منظوری دی تھی۔ اس مختصر وقفے میں 70 فیصد سے زائد کام کر لیا گیا ہے بقیہ کام بھی جلد ہی مکمل کر لیا جائے گا۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ عربی پینل میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ قومی اردو کونسل ہندوستان میں عربی ادب کے وسیع تر منظر نامے سے اردو داں طبقوں کو واقف کرانا اپنا فرض منصبی سمجھتی ہے۔

اس پینل کی میٹنگ کی صدارت پروفیسر نعمان خان نے کی۔ انھوں نے تاریخ ادب عربی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ اس مختصر کتاب میں جامعات اور مدارس کے طلبہ کو عربی زبان کی تاریخ جاننے اور سمجھنے میں مدد ملے گی۔ وہیں آج کی میٹنگ میں ہندوستان میں عربی زبان وادب کی تاریخ کے حوالے سے ایک تجویز پیش کی گئی جسے تمام ممبران نے حتمی طور پر منظوری دی۔ اس حوالے سے پینل کے ممبر محمد علاء الدین ندوی نے کہا کہ ہندوستان میں عربی زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے جو خدمات ہیں اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں، جب کہ اس کتاب کے آجانے سے نہ صرف ہمارے طلبہ اور طالبات استفادہ کریں گے بلکہ دوسرے عرب ممالک بھی عربی زبان وادب کے حوالے سے ہماری خدمات کا اندازہ لگا سکیں گے۔

عربی زبان وادب کی اس میٹنگ میں پروفیسر نعمان خان، پروفیسر کفیل احمد قاسمی، پروفیسر حسنین اختر، پروفیسر مسعود انور علوی، ڈاکٹر مشیر حسین صدیقی، محمد علاء الدین ندوی، جناب صہیب قاسمی اور کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، جناب فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، محترمہ آبگینہ عارف اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 13 جولائی 2017

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

تعلیم

سائنسی سوچ سے ہی ملک کی ترقی ممکن: جاوڈیکر

نئی دہلی: انسانی وسائل کی ترقی کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر نے کہا ہے کہ جب تک سائنسی سوچ کو اپنایا نہیں جاتا ملک کی ترقی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے طالب

علموں کو جدید تحقیق اور تجربات پر اپنی توجہ زیادہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ مسٹر جاوڈیکر نے یہاں ملک بھر کے ایک لاکھ چالیس ہزار بچوں کے درمیان منعقدہ تین مرحلہ جاتی مقابلہ کے ذریعے چنے گئے 14 سب سے زیادہ باصلاحیت بچوں کو اعزاز سے نوازتے ہوئے یہ بات کہی۔

قومی تعلیمی اور تحقیقی تربیتی کونسل (این سی ای آر ٹی) وگیان بھارتی اور وگیان پرسار کی طرف سے مشترکہ طور پر منعقدہ اس پر صلاحیت کھوج مقابلہ میں 29 ریاستوں اور پانچ مرکز کے زیر انتظام ریاستوں کے 1472 اسکولوں کے طالب علموں نے حصہ لیا تھا۔ ان میں سے صرف 18 منتخب کردہ طلبہ جن میں سے 14 طالب علم یہاں موجود تھے۔ ان میں پانچ طالبات تھیں۔ ان تمام ایک لاکھ چالیس ہزار طالب علموں کو پہلے مرحلے میں سابق صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام اور دنیا میں ہندوستان کی سائنسی شراکت پر شائع کتاب تقسیم کی گئی تھی اور ان میں سے ہی طالب علموں سے سوال پوچھے گئے تھے۔ مسٹر جاوڈیکر نے ان بچوں سے کہا کہ جب بھی موقع ملے آدمی کو سیکھنا چاہیے۔ زندگی میں سیکھنا کبھی ختم نہیں ہوتا۔ جب تک سائنسی سوچ کو اپنایا نہیں جاتا ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کہ سب کچھ بیرون ملک میں ہے اپنے ملک میں کچھ بھی نہیں جبکہ ہندوستان کبھی دنیا میں تعلیم کا مرکز تھا اور نالندہ ٹکشلا جیسی یونیورسٹی یہیں تھی۔ انھوں نے کہا کہ سائنس اور تحقیق کے ذریعے ملک کو آگے لے جایا جاسکتا ہے۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے بھی سائنسی سوچ کو تیار کرنے کی بات کہی تھی۔ اس موقعے پر مسٹر جاوڈیکر نے بھی بچوں سے بہت سے سوالات پوچھے جن کا دانشورانہ طریقے سے ان بچوں نے جواب دیا اور اس سے مسٹر جاوڈیکر انتہائی خوش بھی ہوئے۔ پروگرام کے آخر میں انھوں نے ان بچوں کو ایک تمغہ بھی دیا اور ایک گروپ تصویر بھی کھنچوائی۔ ان بچوں کے ساتھ ان کے والدین بھی آئے تھے۔ اگلے سال یہ مقابلہ ملک کے دو عظیم سائنسدانوں ہومی جہانگیر بھابھا اور وکرم سارابھائی پر منعقد ہوگا۔

روزنامہ جدید خبر دہلی، 15 جون 2017

قومی

ماہنامہ 'آجکل' اردو کی گولڈن جوبلی

نئی دہلی: اردو رسائل کے قارئین کی دن بہ دن تعداد میں کمی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پبلی کیشنز ڈویژن

حکومت ہند کی ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر سادھنا راوت نے کہا کہ اردو میں جتنی شیرینی، لطافت اور کشش ہے اردو داں اس سے اتنا ہی دور ہوتے جارہے ہیں۔ یہ بات انھوں نے ماہنامہ 'آجکل' اردو کے 75 سال پورے ہونے کے موقعے پر منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے اردو کے تعلق سے اپنی یادتازہ کرتے ہوئے کہا کہ میں اجمیر کی رہنے والی ہوں اور اردو سے لگاؤ میرا بہت پرانا ہے اور دوسری زبان کا متبادل ہونے کے باوجود میں نے اردو سیکھی تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں اردو کی موجودہ صورت حال سے بہت دکھی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اردو کو اسی طرح فروغ دینے کی ضرورت ہے جس طرح پہلے دی گئی تھی۔ تقریب میں ماہنامہ 'آجکل' کے 75 سال مکمل ہونے پر گولڈن جوبلی کا نمبر کا اجرا بھی کیا گیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے ماہنامہ 'آجکل' اردو کو ایک معیاری ادبی رسالہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ کسی بھی رسالہ کا 75 کا سفر پورا کرنا یہ کوئی چھوٹی کامیابی نہیں ہے۔ اس کے ایڈیٹر جوش ملیح آبادی نے جو معیار قائم کیا تھا وہ اب بھی باقی ہے۔ مشہور افسانہ نگار رتن سنگھ نے 'آجکل' اردو سے اپنی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آجکل کے نوجوان افسانہ نگاری میں دلچسپی کم لے رہے ہیں اور تمام شعبہ اردو کو چاہیے کہ وہ نوجوانوں کو اس طرف رغبت دلائیں اور تحریک پیدا کریں۔ اس موقعے پر پبلی کیشنز ڈویژن سے اردو میں شائع ڈاکٹر اسرارالحق کی کتاب 'ماحولیات ایک تعارف' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ دیگر مقررین میں ڈاکٹر پردیپ جین، آجکل اردو کے سابق ایڈیٹر شہباز حسین، سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر نند کشور وکرم اور دیگر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی نے آجکل کے 75 سال پورے ہونے پر ایک ایک نظم سنائی۔ نظامت ایمپلائمنٹ نیوز کے سینئر ایڈیٹر اور ڈپٹی ڈائرکٹر حسن ضیا نے کی۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر ابرار رحمانی نے کیا۔ اہم شرکا میں سابق ایڈیٹر عابد کربانی، خورشید اکرم، پنکج بشٹ، معصوم مرادآبادی، سہیل انجم، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر شفیع ایوب، مدیرہ عثمانی اور پبلی کیشنز کے سینئر افسران قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 جولائی 2017

اوڈیشہ:

ناول کا بدلتا منظر نامہ

بھدرک: اردو زبان ہندوستان میں ہی پلی بڑھی اور یہ ایک ہند آریائی زبان ہے لیکن اس زبان کی وسعت اور خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں عربی، فارسی، ترکی اور ہندوستانی بولیوں کے علاوہ دنیا بھر کی زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ اردو شعروادب کی تاریخ، اعلیٰ انسانی اقدار، گنگا جمنی تہذیب وثقافت اور باہمی رواداری سے عبارت ہے۔ اس زبان نے اڈیشہ کی تعمیر وتشکیل میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار کابینی وزیر برائے بہبود خواتین واطفال اڑیسہ پرفل سامل نے رضوانی ویلفیئر بھدرک اور قومی کونسل کے زیر اہتمام 'ناول کا بدلتا منظرنامہ' کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی سیشن میں کیا۔ وزیر موصوف نے اس موقعے پر رضوانی ویلفیئر ایسوی ایشن کے چیئرمین کی تعلیمی و ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں مبارکباد پیش کی اور اسکولوں میں اردو کے فروغ کے سلسلے میں حکومتِ اڈیشہ کے مثبت عزائم کا اظہار کیا، نیز انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اڈیشہ اردو اکادمی کو مزید مستحکم اور فعال بنانے کی ضرورت ہے۔

رضوانی ویلفیئر ایسوی ایشن کے چیئرمین پروفیسر عبدالنبی نے صدارتی خطاب میں کہا کہ ہماری ایسوی ایشن مختلف تعلیمی ادبی اور سماجی محاذوں پر فلاحی اور رفاہی خدمات انجام دے رہی ہے۔ گذشتہ سال 'اردو شاعری میں جدیدیت کی سمت ورفتار' کے عنوان سے کامیاب قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا اور اب ناول کے بدلتے منظرنامے پر اس سیمینار کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ ان دونوں سیمیناروں میں شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں کا بے پناہ تعاون حاصل رہا۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر عادل حیات، ڈاکٹر انوارالحق، امتیاز احمد علیمی (جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی)، ڈاکٹر معیدالرحمٰن (علی گڑھ)، ڈاکٹر قسیم اختر (پورنیہ، بہار)، پروفیسر شہباز نبی اور ڈاکٹر شیخ الماس (کولکاتا)، نغمہ تبسم (حیدرآباد)، سعید رحمانی اور شیخ قریش (کٹک، اڈیشہ)،

ڈاکٹر رقیہ بیگم (بالاسور، اڈیشہ) نے مقالے پیش کیے۔ ایتابالا آچاریہ اور میتا نے سامعین سے خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 جولائی 2017

بہار:

خدابخش اورینٹل لائبریری کی نئی عمارت کا افتتاح

پٹنہ: گورنر بہار اور عالمی شہرت یافتہ خدابخش لائبریری کے چیئرمین رام ناتھ کووند نے لائبریری کی نئی عمارت کا افتتاح کیا۔ گورنر موصوف نے کہا کہ مرحوم خدابخش نے کتاب اور انسان کے درمیانی رشتے کو گہرائی سے سمجھا تھا۔ اسی لیے اس عظیم الشان لائبریری کو قائم کیا تھا۔ یہ لائبریری خاص اہمیتوں کی وجہ سے آج بہار کی پہچان بن چکی ہے۔ مسٹر کووند نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس وراثت کو سجانے سنوارنے کے تئیں سنجیدگی سے غور کریں۔ گورنر موصوف نے کہا کہ قیام کے وقت اس لائبریری میں چار ہزار مخطوطات تھے جن کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا ہے اور ابھی 21 ہزار سے زیادہ مخطوطات محفوظ ہیں جن میں عربی اور فارسی کے ساتھ اردو، ازبیک، ہندی اور سنسکرت زبانوں کے نایاب مخطوطات موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لائبریری میں جدید کاری کے لیے گذشتہ دو دہائیوں میں کئی اہم کوششیں ہوئی ہیں۔ ان میں سب سے خاص مخطوطات کے Digitilization کی کارروائی ہے جس کا پہلا مرحلہ اب ختم ہوچکا ہے اور اب کئی کتابوں کی عکسی کاپیاں انٹرنیٹ کے ذریعہ قارئین اور محققین کو مہیا کرانے کا انتظام ہورہا ہے۔ اس لائبریری میں مختلف زبانوں اور مضامین کی تقریباً 3 لاکھ کتابیں ہیں جو تحقیق کرنے والوں اور پڑھنے والوں کے لیے بے حد مفید ہیں۔

گورنر نے کہا کہ انیکسی کی نئی عمارت کی تعمیر سے لائبریری میں قارئین کے لیے مختلف سہولیات میں اضافہ ہوجائے گا اور انتظامی امور میں بھی آسانی پیدا ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ خدابخش خاں مرحوم کی وصیت کے مطابق لائبریری احاطہ میں بنیادی ڈھانچے کو فروغ دے کر اسے عالمی معیار کا بنایا جائے گا۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے لائبریری کے موجودہ ڈائرکٹر اور پٹنہ ڈویژنل کمشنر آنند کشور نے لائبریری کی ترقی کے مستقبل کے منصوبوں پر روشنی ڈالی۔ جلسے سے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر امتیاز احمد نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'تاثیر'...... 13 جون 2017

اعزاز و اکرام:

نذیر فتح پوری کو ساہتیہ اکادمی کا ادبِ اطفال ایوارڈ

نئی دهلی: 2017 کا ساہتیہ اکادمی کا ادب اطفال ایوارڈ مشہور شاعر اور صحافی جناب نذیر فتح پوری کو دیا گیا۔

نذیر فتح پوری کو ان کی کتاب 'میرا دیش مہان' کے لیے یہ ایوارڈ دیا گیا ہے۔ ان کی اب تک 80 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ نذیر فتح پوری پونہ سے 'اسباق' نامی ادبی جریدہ نکال رہے ہیں۔ وہ گذشتہ 36 برسوں سے یہ رسالہ شائع کررہے ہیں۔ ادب اطفال کی جیوری کے ممبران میں عبدالرحمٰن، مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر قمر سرور شامل تھے۔ 2017 یوا ساہتیہ پرسکار کے لیے رشید اشرف کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ان کی کتاب 'مولانا محمد حسین آزاد اور ان کا شعری سفر' پر دیا گیا ہے۔ اس کی جیوری کے ممبران میں جانکی پرشاد شرما، نذیر فتح پوری، ڈاکٹر شاہینہ تبسم تھے۔

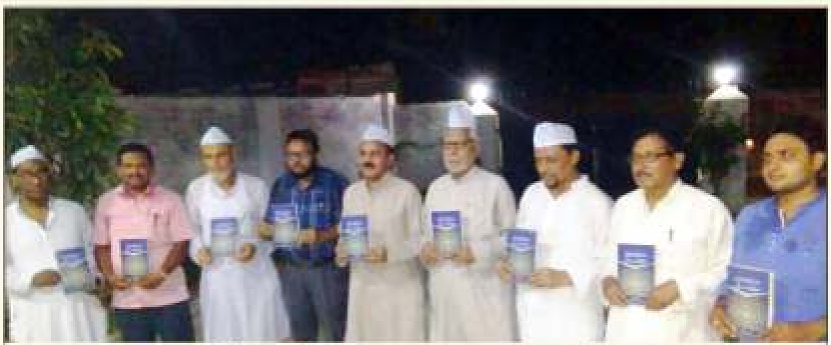

ڈاکٹر زہرہ شمائل کی مرتبہ کتاب 'مناظر عاشق ہرگانوی کی نعت گوئی میں ندرتِ فن' کا اجرا

ڈاکٹر محمد ناظم علی کو بہترین ادبی شخصیت ایوارڈ

نظام آباد: ڈاکٹر محمد ناظم علی سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ، اکاڈیمک سینٹ ممبر تلنگانہ یونیورسٹی کو 2 جون 2017 کو جشن یوم تاسیس ریاست تلنگانہ کے موقعے پر ریاستی حکومت تلنگانہ نے بیسٹ ادبی شخصیت ایوارڈ ضلعی سطح پر عزت مآب وزیر زراعت پوچارام سرینواس ریڈی اور کلکٹر نظام آباد محترمہ یوگیتا رانا کے ہاتھوں توصیف نامہ، مومنٹو اور کیش پرائز عطا کیا گیا۔ یہ ایوارڈ پولیس ہیڈ کوارٹر گراؤنڈ پر دیا گیا۔ اس سے قبل آپ کو اردو اکادمی آندھرا پردیش نے 1991 میں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ عطا کیا گیا۔ 2009 میں حکومت آندھرا پردیش نے اسٹیٹ ایوارڈ تو میری ٹوریس ٹیچرس سرفراز کیا گیا۔ انڈین سائنٹری کونسل نئی دہلی نے بھارت وڈیا شرومنی ایوارڈ 2011 میں دیا اس کے علاوہ بزم علم وادب حیدرآباد کی جانب سے بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ، 2013 میں ادارہ گونج کی جانب سے باوقار گونج ایوارڈ 2015 کو عطا کیا گیا۔ آپ کی ادبی تصانیف میں آئینہ عصر 2005، روح عصر 2006، عکس ادب 2007، حیدرآباد کے ادبی رسائل آزادی کے بعد 2010، پروفیسر آل احمد سرور فکر و فن 2012، ادبی بصیرت 2014، تنقیدی فکر 2015، افکار جدید 2016 قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ نظام آباد مارننگ ٹائمس، 6 جون 2017

اجرا:

مناظر عاشق ہرگانوی کی نعت گوئی میں ندرتِ فن

دربھنگہ (فضا امام): ڈاکٹر زہرہ شمائل (معلمہ، ماڈل اسکول، چاند پٹی، دربھنگہ) کی مرتبہ کتاب 'مناظر عاشق ہرگانوی کی نعت گوئی میں ندرتِ فن' کا اجرا پروفیسر ایم نہال (ڈائریکٹر، ویمنس انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ) کے ہاتھوں 10 جون 2017 بروز ہفتہ 'ادبستان' گنگوارہ، دربھنگہ میں بعد دعوتِ افطار عمل میں آیا۔ بعدۂ موصوف نے فرمایا کہ "مذکورہ کتاب پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب 'ہر سانس محمد پڑھتی ہے' پر لکھے گئے مضامین، نقد پاروں اور منظوم تاثرات پر مشتمل ہے۔ مرتبہ نے ان نگارشات کو بہت سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب سے نعت کے فن پر کام کرنے والوں کو مستقبل میں بڑی مدد ملے گی۔" شرکا میں ڈاکٹر عالمگیر شبنم، حیدر وارثی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، سید متین اشرف، ڈاکٹر احسان عالم، منہاج حسین اکبر، ڈاکٹر امام اعظم اور نوا امام وغیرہ نے بھی مرتبہ کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس کتاب کو فنِ نعت گوئی کے ریسرچ اسکالروں اور عام قارئین کے لیے اہم بتایا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر امام اعظم، (ریجنل ڈائریکٹر مانو کولکاتا) 12 جولائی 2017

وفیات:

ڈاکٹر سی نارائن ریڈی سنارے

حیدرآباد: اردو زبان کے مشہور شاعر، تعلیمی ایڈمنسٹریٹر و محبِ اردو ڈاکٹر سی نارائن ریڈی سنارے چل بسے۔ انھیں تلگو ادب میں کافی کمال حاصل تھا۔ انھوں نے تلگو

فلموں کے لیے تین ہزار سے زائد فلمی گیت لکھے تھے۔ نارائن ریڈی کی ابتدائی تعلیم اردو میڈیم سے ہوئی تھی۔ نارائن ریڈی نے اپنا گریجویشن بھی اردو ذریعہ تعلیم سے مکمل کیا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم نے اردو زبان پر ان کو گرفت دی اور ادب سے ان کی محبت کافی اجاگر ہوئی۔ سی نارائن ریڈی کو اردو کی شاعرانہ روایات بالخصوص اردو غزل میں کافی دلچسپی تھی۔ دونوں زبانوں تلگو اور اردو میں مہارت ہونے کے سبب انھوں نے اپنی تلگو شاعری میں اردو شاعری کے اثرات کو چھوڑا۔ ان کی پیدائش 29 جولائی 1931 کو تلنگانہ کے ضلع کریم نگر میں ہوئی تھی۔ ان کے پسماندگان میں چار دختران شامل ہیں۔ 1988 میں ان کی شاعری پر انھیں گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا تھا۔ قبل ازیں 1977 میں انھیں پدم شری ایوارڈ 1992 میں پدم بھوشن ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔

نارائن ریڈی 1997 میں راجیہ سبھا کے لیے نامزد کیے گئے تھے۔ ان کی تخلیقات کا ہندی، ملیالم، کنڑ، اردو اور فرانسیسی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ تلنگانہ کے وزیر اعلیٰ کے چندر شیکھر راؤ نے سی نارائن ریڈی کے چل بسنے پر ان کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ وزیر اعلیٰ نے اپنے تعزیتی پیغام میں سی نارائن ریڈی کی خدمات کو ناقابل فراموش قرار دیا۔

روزنامہ 'میرا وطن'، دہلی، 13 جون 2017

پروفیسر ارشد جمیل

دربھنگہ: للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد پروفیسر ارشد جمیل کا 12 جون 2017 کو طویل

علالت کے بعد دربھنگہ کے الہلال اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 64 برس تھی۔ ان کی نماز جنازہ ان کے آبائی گاؤں کوروڈیہہ ضلع بھاگلپور میں ادا کی گئی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ 2 نومبر 1982 کو متھلا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر ارشد جمیل کی تقرری ہوئی تھی۔ اس وقت وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدہ پر فائز تھے۔ پروفیسر ارشد جمیل ایک اچھے اور کامیاب استاد ہونے کے ساتھ علم وفضل کے

اعتبار سے بھی منفرد شناخت رکھتے تھے۔ دانشورانہ فکر و شعور، علمی بصیرت اور آگہی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کی ذات اور شخصیت شرافت اور اعلیٰ قدروں کا مرقع تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے طلبہ، رفقا کے ساتھ ساتھ اہل علم و نظر میں اعتبار اور عزت و وقار کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے انتقال پر صدر شعبہ پروفیسر انیس صدری نے اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں اس وقت کچھ کہنے کی اپنے اندر ہمت نہیں پا رہا ہوں۔ 1970 سے میرا ان سے تعلق رہا۔ ان کی علمی شخصیت تو واضح تھی ہی وہ انتہائی مخلص انسان تھے۔ میں نے اپنے بچپن کا ایک دوست کھو دیا۔ سابق صدر شعبہ رئیس انور رحمٰن نے اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ارشد جمیل 29 برسوں سے شعبہ میں میرے رفیق کار تھے۔ اکثر ان سے دینی مسائل کے علاوہ فارسی ادبیات پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ شعبۂ اردو میں ایسے کم لوگ ہیں جنھیں مذہبیات، قرآنیات اور فارسی شعر و ادب پر اچھی دسترس حاصل ہو۔ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، شکیل احمد سلفی اور ڈاکٹر قیام نیر وغیرہ نے بھی ان کی موت کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ ان کی موت کے بعد ریاست سمیت پورے ملک سے تعزیت کا سلسلہ جاری ہے۔

تعزیت کرنے والوں میں پروفیسر ایس کے سنگھ (وی سی)، ڈاکٹر محمد مصطفیٰ کمال (رجسٹرار)، پروفیسر انیس صدری، پروفیسر رئیس انور رحمٰن، پروفیسر فاراں شکوہ یزدانی، پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر شمیم باروی، پروفیسر ایم نہال، ڈاکٹر عبدالوہاب، ڈاکٹر سید عبدالعزیز سلفی، ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ، پروفیسر عبدالمنان طرزی، ڈاکٹر ایم نسیم آرزو، ڈاکٹر قیام نیر، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر محمد بدرالدین، محمد قیصر، شکیل احمد سلفی، ڈاکٹر عبدالحکیم، ڈاکٹر آفتاب اشرف، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر محمد نجیب اختر، پروفیسر شاہد ظفر، پروفیسر محمد رحمت اللہ، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن، ڈاکٹر ظفر سعید، ڈاکٹر احتشام الدین، ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر احسان عالم، ڈاکٹر آفتاب عالم، ڈاکٹر منور راہی، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، مشتاق احمد نوری، نورالسلام ندوی، عارف اقبال، شہاب الدین ثاقب قاسمی، ڈاکٹر عطا عابدی، عبدالمتین قاسمی، وصی احمد شمشاد، مجاہد، جاوید اختر، فردوس علی، ڈاکٹر منصور خوشتر، عرفان احمد، عقیل صدیقی، منظر صدیقی، پیدل سمیت شہر کے درجنوں معزز افراد کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' مظفر پور، 13 جون 2017

کمال الدین خاں علیگ

گیا: ضلع کے بارہ چٹی حلقہ کے سابق وارڈ کونسلر و مشہور سماجی رکن و اردو کے مشہور شاعر کمال الدین خان علیگ 24 جون کو پرنم آنکھوں سے سپرد خاک کردیئے گئے۔ ان

کی جنازہ کی نماز میں سیاسی، سماجی، ادبی حلقہ کے لوگوں کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں معززین گیا شریک ہوئے۔ جنازہ کی نماز دس بجے دن میں سرسید میموریل اسکول کے وسیع میدان میں ان کے منجھلے صاحب زادے مفتی عاطف کمال نے پڑھائی۔ تدفین بھدیہ قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم کی تدفین میں ان کے دوست و بہار کے سابق وزیر اعلیٰ و ہندوستانی عوام مورچہ سیکولر کے قومی صدر جیتن رام مانجھی بھی شامل ہوئے۔ خیال ہو کہ کمال الدین خان کا جمعہ بتاریخ 23 جون کے روز ان کے آبائی گھر بھدیہ میں انتقال ہوگیا تھا۔ ان کی عمر 60 سال تھی۔ پسماندگان میں سات بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کے انتقال سے ادبی، تعلیمی، سیاسی و سماجی حلقوں میں غم کا ماحول ہے۔ اظہار تعزیت کرنے والوں نے کہا کہ کمال الدین خان کے انتقال سے ملت کو عظیم خسارہ ہوا ہے۔ انتہائی رنج و غم کا وقت آن پڑا ہے کہ ایک عظیم ہستی ہم سب کے درمیان سے اٹھ گئی ہے۔ وہ ایک بہتر سیاست داں ہونے کے ساتھ دانشور اردو و علم دوست تھے۔ تعلیم سے انھیں بڑی رغبت تھی اور ہمیشہ وہ پسماندہ اور اقلیتی طبقے کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہونہار طلبا میں سے ایک تھے۔ فراغت کے بعد انھوں نے سیاست و سماجی کاموں میں دلچسپی لینے کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں بھدیہ میں ایک عظیم الشان اسکول سرسید کے نام سے منسوب سرسید میموریل اسکول قائم کیا۔

جنازہ کی نماز میں گیا شہر اور قرب و جوار کی اہم شخصیات سمیت بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' پٹنہ، 25 جون 2017

محمد شمیم صدیقی

نئی دھلی: دہلی یونین آف جرنلسٹ (ڈی یو جے) کے نائب صدر محمد شمیم صدیقی کا 30 جون 2017 کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم عرصے سے علیل چل رہے تھے اور فالج کے مرض میں مبتلا تھے۔ شمیم صدیقی کی عمر 78 سال تھی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے ہیں۔ وہ

2006 میں موقر روزنامہ 'قومی آواز' سے بارہ سالہ ملازمت کے بعد سبکدوش ہوئے تھے۔ انھوں نے اس سے قبل روزنامہ 'الجمعیۃ'، روزنامہ 'دعوت' اور کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان ہفت روزہ 'حیات' میں طویل خدمات انجام دی تھیں۔

شمیم صدیقی بہترین خطاط تو تھے ہی ایک منجھے ہوئے اور تجربے کار مزدور لیڈر بھی تھے۔ انھوں نے ڈی یو جے کے علاوہ کیلی گرافسٹ جرنلسٹ یونین کے صدر کی حیثیت سے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ وہ تمام عمر مزدوروں کے حقوق اور باوقار زندگی کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ ان کے انتقال پر ڈی یو جے کے صدر ایس کے پانڈے نے شدید رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ڈی یو کے کے نائب صدر اور سکریٹری کے طور پر نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ صحافیوں اور اخباری کارکنوں کے لیے ایک مضبوط ستون کی حیثیت رکھتے تھے اور انھوں نے ڈی یو جے کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

معروف خطاط جلال الدین اسلم نے ان کے انتقال کو صحافی برادری کا بڑا نقصان قرار دیا ہے۔ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے انھیں اخباری کارکنوں کا مخلص خادم اور بے لوث دوست قرار دیا۔ سینئر صحافی رحمت اللہ فاروقی، خطاط انیس صدیقی اور محمد ذکیرالدین نے بھی انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 3 جولائی 2017

پدم شری محمود الرحمٰن کا انتقال

فتح پور / لکھنؤ: پدم شری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر محمود الرحمٰن کا 8 جولائی لکھنؤ میں دوران علاج انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین کے لیے ان کے جسد خاکی کو آبائی گاؤں بلاندا، فتح پور لے جایا گیا جہاں ان کی تدفین کی گئی۔ نماز جنازہ ان کے بھتیجے مولوی وسیم نے ادا کرائی۔ اس موقعے پر ان کے اہل خانہ اور

رشتہ داروں کے علاوہ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن اے ایم یو کے وائس چانسلر رہنے کے بعد لمبے عرصے تک بابے مرکنٹائل بینک کے چیئرمین بھی رہے۔ محمود الرحمٰن ریٹائرڈ آئی اے ایس تھے۔ بچپن سے ہی وہ ذہین رہے۔ انھوں نے 1962 میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی تھی اور امتحان میں 89 فیصد نمبر حاصل کرکے ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس کے لیے انھیں گولڈ میڈل سے نوازا گیا تھا۔ انھوں نے اسی یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے بھی کیا تھا۔ انھوں نے 1965 میں یوپی سول سروسز جوائن کیا مگر اگلے ہی سال قومی سطح کی سول سروسز میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد بطور آئی اے ایس افسر جموں و کشمیر میں اپنا کریئر شروع کیا اور ریاست میں اہم عہدوں پر مامور رہتے ہوئے خدمات انجام دیں۔ کئی اہم شعبہ جات کے ممبر رہ چکے تھے۔ 1991 میں انھیں پدم شری سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 جولائی 2017

مولانا محمد یونس جونپوری

سہارنپور: جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے شیخ الحدیث، عالم دین اور احادیث کے حافظ مولانا محمد یونس جونپوری نے 11 جولائی 2017 کو 83 برس کی عمر میں آخری سانس لی۔ ان کے انتقال کی خبر ملک اور بیرون ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ نماز جنازہ بعد نماز عصر مولانا طلحہ نے ادا

کرائی، بعدازیں ہزاروں سوگواروں کے درمیان تدفین قبرستان حاجی شاہ کمال میں ہوئی۔ تقریباً نصف صدی تک حدیث نبوی کی خدمت کرنے والے شیخ مرحوم حافظ حدیث تھے، ان کے ہزاروں تلامذہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور علم دین کی خدمت کررہے ہیں۔ حضرت شیخ مولانا محمد یونس جونپوری نے شوال 1344ھ میں مظاہر علوم میں داخلہ لیا، 1380ھ میں دورہ سے فراغت یہیں سے حاصل کی۔ 1381ھ مظاہر علوم میں معین مدرس مقرر ہوئے اور شوال 1388ھ میں مظاہر علوم میں شیخ الحدیث کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ آپ کی پیدائش 2 اکتوبر 1937 کو کھیتا سرائے ضلع جونپور میں ہوئی تھی، پانچ سال دس ماہ میں والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی، عربی تعلیم کی ابتدا 13 سال کی عمر میں مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں ضلع جونپور میں ہوئی، فارسی سے لے کر نورالانوار تک کی کتابیں وہیں پڑھیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی سے بیعت وخلافت سے سرفراز تھے، مناظر اسلام ناظم مدرسہ مظاہر علوم مولانا شاہ اسعد اللہ کی جانب سے بھی اجازت بیعت حاصل تھی۔ شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری کے جنازہ میں تقریباً 3 لاکھ لوگ پہنچے، پنجاب، ہماچل پردیش، اتراکھنڈ، مہاراشٹر اور کئی صوبوں کے مدارس کے ذمہ داران، ہزاروں طلبہ نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 جولائی 2017

ماہر تعلیم احتشام الحسن

ارریہ: معروف ماہر تعلیم اور السبیل اکادمی کسیارگاؤں کے بانی و ڈائریکٹر پروفیسر احتشام الحسن کا مختصر علالت کے بعد 11 جولائی 2017 کو ایمس دہلی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی پیدائش ضلع پورنیہ کے باغ مارابو چگاؤں میں ہوئی تھی، تقریباً تیس سال سے السبیل اکادمی میں ڈائریکٹر کے عہدے پر رہ کر سیمانچل کے علاقے کو علم کی روشنی سے منور کررہے تھے۔ آپ الشمس ملیہ کالج زیرومائل اررِیہ میں شعبۂ بوٹنی کے لکچرر بھی رہے۔ ان کے انتقال کی خبر سے سیمانچل کے علاقے خصوصاً علمی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ متعدد علمی، ادبی، سیاسی

اور سماجی شخصیات نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے ان کی موت کو بڑے خسارہ سے تعبیر کیا ہے۔ پسماندگان میں شریک حیات رقیہ حسن کے علاوہ پانچ لڑکیاں صدف درخشاں، صباحت فاطمہ، غازیہ حسن، سعدیہ حسن، ثمن حسن اور ایک لڑکا نوید حسن شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' پٹنہ، 12 جولائی 2017

خراج عقیدت:

ڈاکٹر سی نارائن ریڈی ستارے کو خراج عقیدت

نئی دهلی: شہری ترقیات، ہاؤسنگ، شہری غریبی کے خاتمے اور اطلاعات ونشریات کے مرکزی وزیر ایم وینکیا نائیڈو نے گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ سابق رکن راجیہ سبھا ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کی موت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کی موت حیدرآباد میں ہوئی تھی۔ اپنے پیغام تعزیت میں جناب وینکیا نائیڈو نے کہا کہ ڈاکٹر ریڈی تلگو ادبیات کی عظیم شخصیت تھے وہ تلگو زبان میں شاہوں کے شاہ تھے اور زبردست شاعر بھی تھے۔ ان کی تحریروں سے لوگ مسحور ہوجاتے تھے۔ وہ ادب وثقافت کے زبردست دلدادہ تھے۔

مسٹر وینکیا نائیڈو نے اپنے پیغام تعزیت میں مزید کہا کہ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کی موت سے صرف تلگو ادب کو ہی ناقابل تلافی نقصان نہیں پہنچا ہے بلکہ ہندوستانی ادب کو بھی ایسا شدید نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 13 جون 2017

■

عالمی اردو کانفرنس
ہندی، انگریزی اخبارات کی نظر میں

DAILYEXCELSIOR.COM

The Largest Circulated Daily of Jammu and Kashmir

Urdu, a language of composite culture, will never die

Q & A : Prof. Irtaza Karim

March 25, 2017

The Assam Tribune

Guwahati, March 26, 2017

Urdu needs a kiss of life!

Urdu will survive if it becomes a language of market

FIRSTPOST.

Government is ready to uplift Urdu

"Not government but Urduwalas responsible for its downfall" - Prof. Irtaza Karim

Chandigarh, Saturday March 25, 2017

THE HANS INDIA

Sunday Magazine March 26, 2017

"Not government but Urdu walas responsible for its downfall"

Let Urdu be a language of market once again

राजस्थान पत्रिका

गंगा जमुनी तहज़ीब की भाषा है उर्दू

उर्दू पूरी दुनिया में संपर्क की सबसे बड़ी ज़बान है

दिव्य हिमाचल

उर्दू का ज़वाल अविश्वसनीय

मिली-जुली संस्कृति की तीसरी भाषा उर्दू

DECCAN HERALD

Urdu will never die

"Not government but Urduwalas responsible for its downfall"

मिलाप

उर्दू मुहब्बत की भाषा है

उर्दू पूरी दुनिया में संपर्क की सबसे बड़ी ज़बान है

हरिभूमि

न हिंदू की न मुसलमां की, उर्दू है हिंदोस्तां

सन्मार्ग

दिल्ली में विश्व उर्दू सम्मेलन

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

زمینی آلودگی پر مبنی کہانیاں
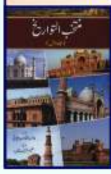
مصنف: ادریس صدیقی
صفحات:40
قیمت:35 روپے

تتلی تارے پھول

مصنف: عزیز انصاری
صفحات:32
قیمت: 20 روپے

طوطا کہانی

مصنف: محسن خان
مصور: فجرالدین
صفحات:16، قیمت: 25 روپے

تاج المآثر

تالیف: تاج الدین حسن نظامی
ترجمہ: پروفیسر سید احسن الظفر
صفحات:301
قیمت: 145 روپے

انارکلی

مقدمہ: محمد شاہد حسین
صفحات:143
قیمت:90 روپے

باتوں باتوں میں

مصنف: عبدالودود انصاری
صفحات:79
قیمت:60 روپے

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد چہارم)
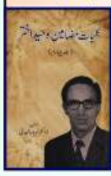
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات:305
قیمت: 160 روپے

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد پنجم)
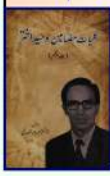
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات:204
قیمت: 115 روپے

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد ششم)

مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات:216
قیمت:-/115 روپے

آئینہ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم: رپورتاژ)

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات:407
قیمت: 182 روپے

آئینہ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم: مضامین)

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات:359
قیمت: 165 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)
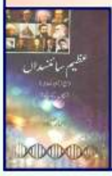
مصنف: احرار حسین
صفحات:121
قیمت:-/32 روپے

اسرارِ کشف صوفیہ (1068ھ مطابق 1658)

مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین و تصحیح متن و ترجمہ
وحواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات:803، قیمت:-/335 روپے

دستورِ ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدا
صفحات:155
قیمت: 70 روپے

انتخابِ سخن (جلد اوّل) سلسلۂ شاہ حاتم

مرتب: حسرت موہانی
صفحات:388
قیمت: -/175 روپے

داستان گو آیا ہے

مصنف: رتن سنگھ، مصور: فجرالدین
صفحات:16
قیمت: 25 روپے

ہماری نظم

مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجرالدین
صفحات:20، قیمت: 30 روپے

دوسرا آدمی
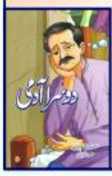
مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجرالدین
صفحات:16، قیمت: 25 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, August-2017, Vol.19, Issue:08
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/07/2017**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025